منتخبات

نظام الفتاویٰ ۱

مصنفہ

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب مدظلہ العالی

مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند

ناشر اصلاحی کتب خانہ دیوبند (یوپی)

(باسمہٖ تعالیٰ)

مَن یفقھہ اللہ یفقھہ فی الدین

منتخبات

نظام الفتاویٰ

مؤلفہ

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب مفتی اعظم

دار العلوم دیو بند

باہتمام

نیاز الدین اصلاحی

ناشر

اصلاحی کتب خانہ دیوبند (یوپی)

سول ایجنٹ:۔ تالیفاتِ اولیاء دیوبند (یوپی)

نام کتاب — نظام الفتاویٰ

مصنف — حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب

ناشر — اصلاحی کتب خانہ دیوبند

مطبع — راحت پریس دیوبند

صفحات — ۴۸۰

قیمت مجلد — ۳۰/-

ملنے کے پتے

عظیم بکڈپو دیوبند (یو،پی)

مصطفائی کتب خانہ دیوبند یو،پی،

امداد الغربا سہارنپور (یو،پی)

فہرست مضامین

تقریظ

از

سیدی و مولائی فقیہ الامت حضرت مولانا الحاج مفتی محمود حسن صاحب
مدظلہ العالی مفتی دارالعلوم
دیوبند

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

حامداً ومصلیاً ومسلماً

نئے نئے واقعات دنیا میں آئے دن پیش آتے رہتے ہیں، جن کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے قوم پریشان رہتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جزائے خیر دے حضرت الحاج الشاہ مفتی نظام الدین صاحب ناظم شعبۂ افتاء دارالعلوم دیوبند کو کہ انھوں نے ایسے مسائل کے مجموعہ کو شرعی دلائل کے ساتھ حل کیا۔ عبارات نقل کی، جس کی وجہ سے عوام اور اہل علم دونوں کے لئے یہ مجموعہ بہت کارآمد اور بصیرت افروز ہو گیا۔ اب مولانا نیاز الدین صاحب اصلاحی قاسمی اور مولانا حبیب اللہ صاحب نے "منتخبات نظام الفتاویٰ" کے نام سے اس کو شائع کرنے کی سعادت حاصل کی جس کی وجہ سے بہت زیادہ مستحق تشکر ہیں۔ اللہ پاک ان کو دارین کی ترقی سے نوازے اور ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ املاہ العبد محمود غفرلہ

دارالعلوم دیوبند۔ یکم ذیقعدہ سنہ ۱۳۹۹ھ

پیش لفظ

از حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری استاذِ حدیث دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ، وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد

اسلام ایک ابدی اور آفاقی مذہب ہے، وہ انسانی ذہن کی تسکین اور انسانی ضروریات کی تکمیل کی ضمانت رکھتا ہے، اس کے اصولوں میں ہمہ گیری کی صفت پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے جب بھی انسانی ضرورتیں نئی شکلیں اختیار کرتی ہیں اور نئی ایجادات جلوہ گر ہوتی ہیں، تو علمائے اسلام آگے بڑھتے ہیں اور اصول اسلام کی تطبیق کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا وہ کام کسی منزل پر جاکر رُکا نہیں ہے، بلکہ حالاتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ پھیلتا اور بڑھتا رہا ہے اور انشاء اللہ یہ سلسلہ قیامت تک یوں ہی چلتا رہے گا۔

یوں تو سبھی علماءِ اسلام نے اس سلسلہ میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں، زمانے کی ضروریات سے کسی نے بھی صرفِ نظر نہیں کی اور بقدرِ ہمت ہر مکتبِ فکر نے سعیِ بلیغ کی ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس سلسلہ میں امام اعظم قدس سرہ ان کے تلامذہ اور ان کے متبعین کو خاص امتیاز حاصل رہا ہے اور اُسی وجہ سے امت نے آپ کو اور آپ کے اصحاب کو "اصحاب الرای" کے معزز لقب سے نوازا ہے۔ اس لقب کا مطلب یہ ہے کہ جدید مسائل اور اُلجھے ہوئے معاملات میں مختلف آرار میں سے قابلِ اعتنار رائے اصحاب امام اعظم ہی کی ہے یہی حضرات صائب الرای ہیں اگرچہ بعض بزعمِ خود غلط قسم کے لوگوں نے اس معزز لقب کو بدنما کرنے کی نہ صرف سعی کی ہے، بلکہ اس قدر پروپیگنڈہ کیا ہے کہ اس کا صحیح مطلب عام طور پر لوگوں کے ذہنوں سے اوجھل ہوکر رہ گیا ہے۔ لیکن اللہ پاک جزائے خیر عطا فرمادیں۔ علامہ ابن حجر مکی شافعی رحمہ اللہ کو کہ انھوں نے "الخیرات الحسان" میں اس غلط پروپیگنڈے کا پردہ چاک کرکے رکھ دیا ہے۔

اصابت رائے کا یہ خصوصی وصف مختلف زمانوں میں علمائے احناف کے مختلف طبقات میں خصوصیت کے ساتھ پایا جاتا رہا ہے، چنانچہ کبھی اہل عراق کو اس میں تفوق حاصل رہا ہے تو کبھی علمائے ماوراء النہر کو۔ ہمارے اس دور میں یہ خصوصی فضل علمائے ہند کو عطا ہوا ہے، جس کا اعتراف متعدد علمائے عرب نے بھی کیا ہے، پھر علمائے ہند میں بھی اس کا حظ وافر علمائے دیوبند کو حاصل رہا ہے، فقیہ النفس قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ فقیہ بے مثال حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی قدس سرہ رہنمائے قوم وملت حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی قدس سرہ مفتی اعظم مملکت پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی قدس سرہ اور فقیہ نکتہ رس حضرت علامہ مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوری قدس سرہ وغیرہم کی مساعی جمیلہ سے کون ناواقف ہے۔ ان حضرات نے نہ صرف پچھلے مسائل کو نکھارا اور ان کی نوک پلک درست کی بلکہ نئے مسائل اور معضلات عصر کی زلفوں کو بھی سنوارا۔ اللہ تعالیٰ کے اس خصوصی فضل وکرم کا جس قدر شکر بجالایا جائے کم ہے۔

علماء دیوبند میں سب سے پہلے حضرت تھانوی قدس سرہ نے حوادث الفتاویٰ کو علیحدہ مرتب فرمایا۔ آپ کے بعد آپ کے مسترشد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے اس سلسلے میں قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔ اب اسی مبارک سلسلے کے ہمارے بزرگ دار العلوم دیوبند کے مفتی حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمی دامت برکاتہم نے ایک نہایت مفید کام انجام دیا ہے۔ آپ کے تحریر فرمودہ ہزاروں فتاویٰ میں سے منتخب کر کے نئے زمانے کی نئی ضرورتوں سے متعلق اہم فتاویٰ کا یہ مجموعہ امت مسلمہ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور امت کو اس مجموعہ سے زیادہ سے زیادہ منتفع فرمائیں۔ (آمین یارب العٰلمین)

حوادث الفتاویٰ کے سلسلے میں ایک خاص بات قابل لحاظ یہ ہے کہ چونکہ ان کا حل کتب فقہیہ میں صراحۃً نہیں پایا جاتا، بلکہ مفتی زمانہ اخذ واستنباط سے کام لے کر حل پیش کرتا ہے اس لئے اس میں خطا (چوک) کا احتمال بہ نسبت دیگر جوابات کے زیادہ پایا جاتا ہے، ائمہ مجتہدین کو بھی ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے، لیکن جب بھی ان کے سامنے اپنی خطا واضح ہوگئی ہے تو ہمیشہ انھوں نے اپنی رائے سے رجوع فرمالیا ہے، کبھی اپنی بات کی پیچ نہیں کی، حضرت

تھانوی قدس سرہ کے یہاں تو ماہنامہ "النور" میں "ترجیح الراجح" کا ایک مستقل عنوان تھا، ہمارے حضرت مفتی صاحب بھی اُسی سلسلے سے وابستہ ہیں، اس وجہ سے آپ کے دل میں بھی اتباعِ حق کا جذبہ موجزن ہے۔ جب بھی آپ کے سامنے اپنی کوئی خطا واضح ہوتی ہے آپ فوراً اس کا تدارک فرماتے ہیں۔

"منتخبات نظام الفتاویٰ" کی شکل میں جن مسائل کو پیش کیا جا رہا ہے، اس کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ بالغ نظر علماء کرام اسے ملاحظہ فرمائیں۔ اور کوئی قابلِ اصلاح بات پیش فرمائیں تو اس کی روشنی میں حوادث الفتاویٰ کے جوابات مزید نکھر کر امت کے سامنے آئیں۔ غرض علماء کرام سے امید ہے کہ وہ ضرور اس کتاب کو قابلِ اعتنا سمجھیں گے۔ اور کوئی بات قابلِ اصلاح محسوس فرمائیں تو اطلاع فرمائیں گے۔ فقد ورد فی الخبر عن النبی الصادق الابر، صاحب القبر الاطہر، صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: الدین النصیحۃ قیل: لمن یا رسول اللہ؟ قال: للہ ولرسولہ ولجماعۃ المسلمین۔

کتبہ العبد الاواہ

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالنپوری

۴/ ذی قعدہ ۱۳۹۹ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظام الفتاویٰ

کمپنیوں کے شیرز و بونڈ کی بیع وشراء کا حکم

سوال (١) یہاں برطانیہ میں لوگ شیرز اور بونڈز (SHEARS & BOND) دلال کمپنیوں سے خریدتے ہیں، جس کی قیمت کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ اور لوگ اپنا نفع ونقصان سوچ کر جب چاہیں فروخت کر کے اپنی لاگت نفع ونقصان کے تحت حاصل کرتے ہیں۔

ایسے بونڈ شیر وغیرہ خریدنا کیسا ہے، جبکہ یہ معلوم ہو جائے کہ دلال کمپنیاں ان لازم سے بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں اور فیکٹریوں میں حصہ لینے کے علاوہ کچھ رقوم سود حاصل ہونے والی جگہوں پر بھی لگاتے ہیں، حالانکہ شیر بونڈ خریدنے والے کو براہ راست اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان شیر و بونڈ کی قیمت اخباروں میں بھی ہفتہ واری اشاعت ہوتی ہے۔ شیر و بونڈ خریدنے والا تو رقم لگا کر شیر خریدتا ہے، لیکن فروخت والی دلال کمپنیاں اس رقم سے سود ملنے والی جگہوں پر بھی حصہ لیتی ہیں۔

الجواب:- شیرز حصوں کا نام ہے۔ شیر کا مالک شیر کے مطابق کمپنی کا حصہ دار اور مالک ہوتا ہے اور کمپنی کے سرمایہ وسامان واثاثہ وغیرہ سب چیزوں کا حسب شیرز مالک ہوتا ہے۔ اور سرمایہ وسامان وغیرہ کی حیثیت وقیمت کی کمی وبیشی کے اعتبار سے شیر کی حیثیت وقیمت بھی کم وبیش ہوتی رہتی ہے۔ اور شیر کا خریدنا و بیچنا ان اصول

کا اور ان حصوں میں داخل شدہ چیزوں کا خرید نا و بیچنا شمار ہوتا ہے اور اس کا جائز ہونا ظاہر ہے۔

بونڈ بھی ان ہی حصوں اور شیرز کی سند کے درجہ کی چیز ہوتی ہے۔ اور ان کے عرف میں ان کی خرید و فروخت سے ان ہی حصوں کی بیع و شراء مراد ہوتی ہے۔ اور "بونڈ" سند و حوالہ کے درجہ میں لئے دیئے جاتے ہیں۔ اس تاویل سے اس بیع و شراء کا حکم مثل شیر کے بیع و شراء کے حکم کے ہوگا، اور جائز رہے گا۔

دلال کمپنیوں کے دلال اور ان کے نائبین و وکلاء دلال یا دلال کے حکم میں ہوں گے اور بائع و مشتری کے درمیان محض واسطہ کے درجہ میں ہوں گے۔ خود اصل مالک شیر یا اس کے اصل بائع و مشتری نہ ہوں گے۔ اور جب ان سے اصل مالکان شیرز نے سود حاصل ہونے والے معاملہ میں لگانے کے لئے نہ کہا ہو اور انھوں نے خود ایسا کر لیا ہو تو وہ دلال خود اس معاملہ کے ذمہ دار ہوں گے۔ اور اس کا مواخذہ اصل مالکان شیرز سے نہ ہوگا۔ اور نہ ان کے مال میں اس معاملہ کی خباثت ہی آوے گی، جبکہ سود کا پیسہ ان کے پاس نہ آیا ہو۔

البتہ علم ہو جانے کے بعد کہ وہ دلال ایسا بھی کر دیتے ہیں، ان کو منع کر دیا جائے کہ وہ لوگ اس کے شیرز و بونڈ کی رقم سود حاصل ہونے والی جگہوں میں نہ لگائیں، پھر اس کے بعد بھی اگر وہ لوگ ایسا کر دیں گے تو عند اللہ وہ خود گنہگار رہوں گے اور مالکان شیرز و بونڈ محفوظ و بری رہیں گے دھکذا ایستفاد من تحقیق صاحب الفتاوی الاحمدیۃ نوراللہ مرقدہ۔ ایضاً۔

سودی قرض لینے کا حکم

سوال (۲) زید کے پاس دس ہزار کی رقم ہے، اس سے پانچ ہزار کا مکان اپنے رہنے کے لئے خرید کر پانچ ہزار سے کام کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ سود دیئے جانے والے قرض سے مکان خریدے اور دس ہزار کی رقم

سے کوئی آمدنی کرے تو ایسا کرنا کیسا ہے۔

الجواب:- اگر دس ہزار کی رقم سے کم رقم میں کام کرنے میں معیشت میں تنگی و پریشانی ہوتی ہے اور ضروریات پوری نہیں ہو پاتیں۔ اور بغیر سودی قرض مکان خریدنے کے لئے نہیں ملتا، تو پورے دس ہزار سے کام بھی کر سکتے ہیں، اور سودی قرض بھی مکان خریدنے کے لئے لے سکتے ہیں، جبکہ رہنے کے لئے مکان نہ ہو، یا بغیر ذاتی مکان کے پریشانی ہو۔

انسانی بالوں کی ٹوپی کا حکم

سوال (۳) یہاں پر بہت سے لوگوں کے سروں پر بال نہیں ہوتے ہیں، اس لئے انسانی بالوں کی ٹوپی کی طرح بناکر سر پر رکھتے ہیں، یا سر کے ساتھ منسلک سیلائی کر دیتے ہیں، جس سے پتہ بھی نہیں چلتا ہے کہ اصلی بال ہیں یا نقلی بعض مسلمان یوں کہتے ہیں کہ ہم یہاں کی سردی کی وجہ سے کرتے ہیں۔ جو بندہ کے نزدیک ضروری نہیں تو ایسا کرنا کیسا ہے۔ اگر انسانی بال کے علاوہ نائلون یا مصنوعی یا حیوانی گھوڑے وغیرہ کے بال سر پر لگائے تو کیسا ہے؟

الجواب:- انسانی بال بھی اجزاء انسانی میں سے ہیں اور اجزاء انسانی اگرچہ کافر اور غیر مسلم کے ہی ہوں وہ بھی مکرم و محترم ہوتے ہیں، اور اس کا استعمال اس کی توہین ہے اور ناجائز ہے کما اشار الیہ قولہ تعالیٰ لقد کرمنا بنی آدم الآیۃ اور مراقی الفلاح میں ہے وجلد الآدمی لحرمتہ صونا لہ لکرامتہ (ای یطھر بالدباغ) وان حکم بطہارتہ بہ لا یجوز استعمالہ کسائر اجزاء الآدمی۔

(وتحتہ فی الطحطاوی ص) وجلد الآدمی ولو کافرا کما فی القھستانی فیطھر ولا یستعمل الخ اور درمختار میں ہے فلا یدبغ (ای جلد الانسان لکرامتہ (الی قولہ) حتی لو طحن عظمہ فی دقیق لم یؤکل فی الاصح احتراما

لہذا انسانوں کے بالوں کی ٹوپی بنانا یا ان سے ٹوپی کا کام لینا یا سر کے ساتھ منسلک کر کے سیلائی کر کے اور اصلی بالوں کی طرح بنا کر استعمال کرنا خواہ اصلی ونقلی ہونے کا امتیاز ہو یا نہ ہو، غرض کسی طرح بھی اس کا استعمال کرنا ناجائز ہوگا، اور مذکورہ عذر معتبر نہ ہوگا۔ ہاں خنزیر کے علاوہ اور جانوروں کے بالوں کو یا نائلون واون یا مصنوعی بالوں کو سردی سے تحفظ حاصل کرنے کے لئے ٹوپی ولباس کے طور پر جیسے کنپوٹ، کوتین کمبل وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں، جائز رہے گا، البتہ ان چیزوں کو اس طرح استعمال کرنا کہ وہ سر یا داڑھی وغیرہ کے قدرتی بالوں کی طرح اور غیر متمیز ہو کر نمایاں ہوں منع ہے۔

یہود کے ذبیحہ کا حکم

سوال (۴) یہاں حلال وحرام میں اچھی طرح تمیز نہ ہونے کی وجہ سے یعنی مسلمان مسلمان کے وہاں سے گوشت لانے کے بجائے یہودی کے وہاں سے لاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہودی اہل کتاب ہیں اور ان کی بات (یعنی حلال ہونے کی) نہایت پکی ہوتی ہے۔ اور مسلمانوں کا اعتبار نہیں ہوتا (افسوس) تو کیا یہودی جہاں یقین ہو کہ حلال کیا ہوا گوشت ملتا ہے، مسلمان پر جہاں یقین نہ ہو ترجیح دے کر خریدا جا سکتا ہے۔؟

الجواب:۔ مسلمان خواہ کتنا ہی گنہگار ہو لیکن مسلمان ہے توحید کا علمبردار ہے۔ جب تک دلیل شرعی سے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس نے ایسے طریقہ پر ذبح کیا ہے، جس سے ذبیحہ حرام ہو جاتا ہے یا اللہ کا نام لئے بغیر ہی ذبح کر دیا ہے، اس وقت تک اس کے ذبیحہ کے مقابلہ میں یہود کے ذبیحہ کا گوشت خریدنا بہتر نہ ہوگا۔ بالخصوص جبکہ جس درجہ آزادی اور مذہب سے لاپرواہی مسلمانوں میں آئی ہوئی ہے اس سے کم یہود میں نہیں آئی ہے، بلکہ کچھ سوا ہی آئی ہے، جو لوگ اس کے خلاف کہتے ہیں یا سوچتے ہیں، وہ غلط سوچتے یا کہتے ہیں۔

ریڈیو و ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ اطلاع ہلال کا شرعی حکم

سوال (۵) آج کل رسل و رسائل و خبر رسانی کے ذرائع اس قدر عام اور آسان ہو گئے ہیں کہ عید اور بقر عید و رمضان کے چاند کی خبریں بھی ہر وقت گاؤں گاؤں، شہر شہر ہر جگہ پہنچ جاتی ہے، کبھی تار و ٹیلیفون سے کبھی ریڈیو سے۔ اور مسلمانوں کا عام طبقہ عموماً مسائل سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایک الجھن اور کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ایسے موقع پر حکم شرع شریف کیا ہے؟ ہمیں عید منا لینی یا روزہ رکھ لینا چاہیئے یا نہیں؟ بالخصوص ریڈیو خبریں بعض مرتبہ حجاز اور مصر اور بعض ایسے دور دراز ممالک سے آجاتی ہیں جس سے کبھی ۲۸ رشعبان ہی کو پہلی رمضان معلوم ہوتی ہے اور کبھی ۲۸ ررمضان ہی کو عید کا دن معلوم ہوتا ہے اور کبھی آٹھویں ذی الحجہ کو بقر عید اور قربانی کا دن معلوم ہوتا ہے۔ ہر جگہ معتبر عالم موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ الجھن اور بڑھ جاتی ہے۔ بعض لوگ اختلاف مطالع کی آڑ لے کر ٹال دیتے ہیں۔ بعض لوگ جنتری کو بنیاد بنا کر حجت کرتے ہیں اور بعض لوگ علم ہیأت کی اصول سے بحث و معارضہ کرتے ہیں۔ اور بعض لوگ ان خبروں کو شہادت کا درجہ دے کر صحیح تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کر ڈالتے ہیں۔ اور بعض لوگ مقامات مقدسہ یا اسلامی ممالک کا نشریہ ہونے کی بنا پر بلا کسی قید و شرط کے لحاظ کئے ہوئے واجب العمل قرار دے کر دوسروں کو بھی ماننے پر مجبور کرتے ہیں غرض اس سے عوام میں بڑے بڑے فسادات رونما ہو جاتے ہیں، ایک ہی آبادی کے کچھ حصہ میں عید منائی جاتی ہے اور کچھ حصہ میں روزہ ہوتا ہے، بعض جگہ عید گاہوں میں جھگڑا فساد کی نوبت آجاتی ہے۔

بعض مفسدین دین کو بازیچہ شیاطین بنانے اور کھلونے کی شکل دینے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔

اس لئے گذارش ہے کہ ان خبروں سے متعلق کچھ مسائل اور اصول وقواعد مفصل اور مدلل اس طرح بیان کردیئے جائیں جس سے بصیرت کے ساتھ مسئلہ کی صحیح حیثیت ذہن میں اتر سکے اور عمل کرنے میں روشنی مل سکے اور کشمکش ختم ہوسکے بینوا توجروا۔

الجواب:- یہ تو صحیح ہے کہ ریڈیو خبر یا اعلان شہادت شرعیہ نہیں، لیکن مطلقاً ہر حال میں بالکل ناقابل عمل اور ناقابل التفات قرار دیدینا بھی صحیح نہیں، اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ ریڈیو پر آنے والی ہر خبر اور اعلان بالکلیہ صحیح اور درست ہو کہ اس پر تحقیق وتفتیش کی بھی ضرورت نہ رہے اور اس پر عمل واجب ہوجائے، بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے کچھ قیود وشرائط ہیں، ان کے ساتھ ریڈیو کا نشریہ واعلان معتبر وقابل عمل ہوسکتا ہے۔ اور ان شرائط اور قیود کے بغیر غیر معتبر اور ناقابل توجہ وعمل رہے گا، ان تفصیلات وقیودات کی اجمالی نشان دہی ذیل میں نمبروار کی جائے گی، اور امید ہے کہ اس سے مذکورہ جملہ شقوق کا جواب اور جملہ شکوک کا ازالہ بھی ہوجائیگا ان تفصیلات وقیودات کی نشاندہی کرنے سے پہلے پیشتر چند ضمنی گفتگو بطور تمہید ومقدمہ پیش کی جاتی ہے جو مفہوم مسئلہ کے حل کرنے میں معین ونافع ہوسکتی ہے

تمہید ومقدمہ

اولاً چند عبارات فقہیہ نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) ولا عبرة بقول الموقتین ولو عدولا علی المذهب قال فی الوهبانیه وقول اولی التوقیت لیس بموجب (درمختار)	مذہب مختار کے مطابق موقتین کے قول کا کچھ اعتبار نہیں وہبانیہ میں کہا ہے کہ موقتین (حساب داں) کے قول سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا۔
(۲) وتحته فی الشامیه صفحہ ۱۲۵/۲ ای	شامیہ میں اسی کی شرح کرتے ہوئے لکھا

فی وجوب الصوم علی الناس بالاجماع وفی النهر فلا یلزم بقول الموقتین انه ای الهلال یکون فی السماء لیلة کذا وان کانوا عدولا فی الصحیح (الی قوله) قلت ما قاله السبکی رده متاخروا اهل مذهبه (ای الشافعی) ومنهم ابن حجر والرملی (ثم الی قوله) وما قاله السبکی الشافعی مردود رده علیه جماعة من المتأخرین منه (ای الشافعیه) و لیس فی العمل بالبینة مخالفة لصلوته صلی الله علیه وسلم ووجهه ماقلنا ان الشارع لم یعتمد الحساب بل الغاه بالکلیة لقوله نحن امة امیة (ثم الی قوله) وقال ابن دقیق العید الحساب لایجوز علیه الاعتماد فی الصلوٰة - انتهی ماقاله الرملی الشافعی - شامی ص $\frac{۱۲۵}{۲}$

(۳) واختلاف المطالع غیر معتبر

ہے کہ مثبت حکم نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے قول سے لوگوں پر روزہ کا وجوب بالاتفاق نہ ہوگا، اور نہر میں ہے کہ موقتین کے کہنے سے لازم نہیں آتا کہ چاند اس رات آسمان میں موجود ہی ہو، گویہ لوگ ازروئے شرع عادل ہی کیوں نہ ہوں، صحیح قول یہی ہے۔ پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں کہ علامہ سبکی شافعی کا قول غیر مقبول ہے۔ متاخرین شافعیہ نے اس کو رد کر دیا ہے اور گواہوں کی بات پر عمل کرنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز کی مخالفت نہیں ہوتی۔ اور موقتین کی بات کے غیر معتمد ہونے کی دلیل وہی ہے جو اوپر بیان کر چکے ہیں کہ شارع علیہ السلام نے حساب پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ حساب کو سرے سے لغو قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے نحن امة امیة ہم تو ان پڑھ لوگ ہیں۔ ابن دقیق العید (صاحب احکام الاحکام) فرماتے ہیں کہ نماز کے سلسلے میں حساب پر اعتماد کرنا جائز نہیں۔ انتہی ماقال الرملی الشافعی

شامی ص $\frac{۱۲۵}{۲}$

اور درمختار میں بحوالہ بحر لکھا ہے کہ ظاہری

علی ظاهر المذهب وعلیه اکثر المشائخ وعلیه الفتوی بحر عن الخلاصه (در مختار)	مذہب کے مطابق اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں، اس پر اکثر مشائخ کا عمل ہے اور یہی مفتی بہ ہے
(۳) قوله ورویته نهاراً الخ (تحته فی الشامی ص ۹۶/۲) انما الخلاف فی اعتبار اختلاف المطالع بمعنی انه هل یجب علی کل قوم اعتبار مطلعهم ولا یلزم احد العمل بمطلع غیره ام لا یعتبر اختلافها بل یجب العمل بالاسبق رویة (الی قوله) وظاهر الروایة الثانی وهو المعتمد عندنا وعند المالکیة والحنابلة لتعلق الخطاب عاماً بمطلق الرویة فی حدیث صوموا لرویته (الی قوله) بخلاف اوقات الصلوٰة۔ شامی ص ۹۶/۲	اور اختلاف مطالع کے معتبر وغیر معتبر ہونے میں جو اختلاف ہے، اس معنی کر کے ہے کہ گیا ہر بستی پر لازم ہے کہ وہ صرف اپنے مطلع کا اعتبار کرے اور کسی کے لئے دوسرے کے مطلع پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے یا یہ کہ اختلاف مطالع کا کچھ بھی اعتبار نہیں، بلکہ جو شخص بھی پہلے چاند دیکھے سب کے ذمے اس کی پیروی ضروری ولازم ہے کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ دوسری ظاہر الروایۃ ہے اور حنفیہ کے نزدیک یہی معتبر ہے اور مالکیہ اور حنابلہ کا بھی اسی پر اعتماد ہے اس لئے کہ حدیث صوموا لرویتہ میں مطلقاً رویت کا خطاب ہر فرد کے لئے عام ہے۔ لیکن اوقات صلوٰۃ کا حکم اس سے مختلف ہے۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ اختلاف مطالع کا اعتبار اور حساب منجمین وموقتین کا اعتبار محققین احناف کے نزدیک اور محققین ائمہ اربعہ کے نزدیک صحیح نہیں، بلکہ طرق موجبہ سے جو ثبوت رویت کا ہوگا فقط وہ معتبر ہوگا، خواہ وہ ثبوت دنیا کے کسی حصہ وگوشہ سے آئے کسی بھی طرح سے آئے۔ صرف شرط اتنی ہے کہ نصوص صریحہ صحیحہ

یا متون صحیحہ شرعیہ کے خلاف نہ ہو، اور مقصد شرع سے بھی متجاوز نہ ہو، اس لئے کہ طرق موجبہ خود نصوص نہیں کہ نص کا یا حقیقت واقعہ کا معارضہ یا مقابلہ کر سکیں بلکہ نصوص سے متأخر و ثانوی درجہ میں ہے، مثلاً نصوص میں وارد ہے۔ صوموا الرویۃ

(۵) صوموا لرویتہ وافطروا لرویتہ فان غم علیکم فاکملوا عدۃ شعبان ثلاثین (متفق علیہ)

چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو (عید مناؤ) اگر گرد و غبار وغیرہ کی وجہ سے چاند ڈھک جائے تو تیس دن شعبان کے پورے کرلو ۱۲ بخاری و مسلم۔

انا امۃ امیۃ لانکتب ولا نحسب الشھر ھکذا وھکذا وعقد الابھام فی الثالثۃ ثم قال الشھر ھکذا وھکذا یعنی تمام الثلاثین یعنی مرۃ تسعا وعشرین ومرۃ ثلاثین (متفق علیہ)

ہم لوگ امت امیہ ہیں حساب و کتاب پر مدار ان چیزوں کا نہیں رکھتے بلکہ مہینہ اتنا ہوتا ہے اور اتنا ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ دونوں ہاتھ انگلیاں اٹھا کر تین بار اشارہ فرمایا اور تیسری بار اشارہ کرتے ہوئے انگوٹھا کو موڑ کر چھپا لیا۔ پھر دوسری مرتبہ پھر مثل سابق دونوں ہاتھ کی انگلیاں اٹھا کر تین بار اشارہ فرمایا۔ اور اس مرتبہ تیسری بار کی اشارہ میں انگوٹھا بھی اٹھائے رکھا، اور اس سے آپ تیس دن پورے مراد لے رہے تھے اور بتلانا یہ تھا کہ مہینہ ۲۹ر دن کا بھی ہوتا ہے اور کبھی پورے تیس دن کا (بخاری و مسلم)

(۶) عن ابن عباس رض قال

حضرت ابن عباس رض سے مروی ہے کہ

جاء اعرابی ای نبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال انی رأیت الهلال یعنی هلال رمضان فقال أتشهد ان لا اله الا الله فقال نعم۔ قال أتشهد ان محمد الرسول الله قال نعم قال یا بلال اذن فی الناس ان یصوموا غداً (رواہ ابوداؤد وترمذی، نسائی ابن ماجه، دارمی، مشکوٰۃ وغیر ذلك من النصوص الواردة فی هذا الباب)

ایک دیہاتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہا کہ میں نے ابھی رمضان کا چاند دیکھا ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم وحدانیت رب ذوالجلال کی شہادت دیتے ہو۔ اس نے کہا ہاں، پھر آپ نے فرمایا کہ تم مجھے اللہ کا رسول برحق سمجھتے ہو، اس نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا کہ اے بلال لوگوں میں اعلان کردو کہ صبح روزہ ہے لوگ کل روزہ رکھیں (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی۔ اس کے علاوہ اور بھی نصوص وارد ہیں)

ان نصوص سے چند امور ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً یہ ہے کہ مہینے ۲۹ ردن یا ۳۰ ردن میں دائر ہوں گے، اُس سے کم یا بیش نہیں ہوں گے۔ یا مثلاً یہ ہے کہ دین اسلام عالمگیر مذہب ہے، یہ عالم جاہل یا متمدن بدوی، بادشاہ، رعایا، حکماء، فلاسفہ غرض سب کو ایک سا مخاطب کرتا ہے، اور اصول فطری وسادہ وضع کرتا ہے، اور ان ہی سادگی پر بنیاد رکھتا ہے۔ تاکہ سب یکساں عمل کرسکیں، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دین کی بنیاد ہی سادگی اور فطرت پر ہے، جو علوم ہندسہ وریاضہ کی کشاکش سے معریٰ ہے، اسی طرح تکلفات وتدقیقات سائنسیہ سے مبرا ومنزہ ہے۔ لہذا نہ خوردبین سے تلاش ہلال کی ضرورت ہے نہ فضا میں پرواز کی حاجت ہے۔ بلکہ اگر نصوص صحیحہ ومتون شرعیہ صحیحہ میں غور کیا جائے تو یہ امر بالکل واضح طور پر نمایاں ہوجاتا

ہے کہ تکلفات وتدقیقات غیر مطلوب، یہی نہیں بلکہ غیر مستحسن بھی نہیں بلکہ بعض اوقات مضر وغیر معتبر بھی ہوں گی، جس طرح اگر بغیر تدقیق وتشقیق اور بغیر اہتمام والتزام کے کوئی حکم ان سے مل جائے تو معتبر اور مقبول ہوگا۔

کما حققہ الشیخ المفتی محمد شفیع الدیوبندی مدظلہ فی رسالۃ "آلات جدیدہ کے شرعی احکام" ص۱۸۳۔ خلاصہ یہ ہے کہ ثبوت رویت ہلال کا مدار یا تو خود رویت پر ہے یا شہادت پر ہے، شہادت میں قاضی شرعی ومجلس قضاء وغیرہ شرط ہے۔ اور بسا اوقات اس کا فقدان ہوتا ہے۔ ایسے مواقع میں عادل مسلمان کی خبر بھی بتفاصیلہ وشرائط جب اس طرح پر ہو کہ اس سے ثبوت کا ظن غالب حاصل ہو جائے تو کافی ہوجاتی ہے کما فی التنویر۔

(۷) لو کانوا ببلدۃ لا حاکم فیھا صاموا بقول ثقۃ وافطروا باخبار عدلین للضرورۃ۔ تحت قولہ ببلدۃ فی الشامی ص $\frac{125}{2}$ او قریۃ قال فی السراج ولو تفرد واحد برؤیتہ فی قریۃ لیس فیھا وال ولم یأت مصرا لیشھد وھو ثقۃ یصومون بقولہ والظاھر انہ یلزم لاھل القری الصوم

تنویر الابصار میں ہے کہ اگر لوگ ایسے شہر میں ہوں جس میں کوئی حاکم شرع نہ ہو تو لوگ اس میں ایک ثقہ ومعتبر آدمی کے قول پر روزہ رکھیں اور دو ثقہ وعادل شخصوں کی خبر پر افطار کریں یہ حکم ضرورت کی وجہ سے ہے۔ (اسی کے تحت) شامی ص $\frac{125}{2}$ میں یہی دیہات کا بھی ہے۔ سراج وہاج میں ہے کہ اگر کوئی آدمی تنہا کسی ایسے دیہات میں چاند دیکھے اور شہر تک قاضی کے پاس شہادت دینے کے لئے نہ آئے اور وہ ثقہ معتبر شخص ہو تو لوگ اس کے قول کے مطابق روزہ

بسماع المدافع او برؤیۃ القنادیل من المصر لانہ علامۃ ظاہرۃ تفید غلبۃ الظن حجۃ موجبۃ للعمل۔

شامی ص ۱۲۵/۲

رکھیں اور یہ حکم ظاہر مسلم کے دیہات والوں پر شہر کی توپ کی آواز سن کر یا شہر کے میناروں اور قندیلوں کی روشنی دیکھ کر روزہ رکھنا لازم ہو جاتا ہے، اس لئے کہ ایسی ظاہری علامت جس سے رویت کا ظن غالب حاصل ہو جاتا ہے، اور یہی عمل کرنے کے لئے حجت موجبہ ہے۔

اور یہ متنوں کا ادنی درجہ ہے اور مخبر کا مسلمان عادل ہونا، اس بات پر موقوف ہے کہ اس کی پوری پوری شناخت اور تعین ہو، نیز اس کے دینی حالات و عادات کا بھی صحیح علم ہو، کہ آیا یہ ثقہ و عادل ہے یا نہیں۔ ٹیلیگرام و وائرلیس میں یہ سب امور غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہیں کچھ خبر نہیں ہوتی کہ خبر دینے والا کون ہے اور کیسا ہے اس لئے ان کی خبریں اس باب میں مفید و معتبر نہ ہوں گی، یہ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص موقع پر ان خبروں سے قوت و تائید کا فائدہ حاصل ہو جائے، مگر مدار ثبوت ان پر نہیں ہو سکتا ہے۔ ٹیلیفون کی خبروں میں اگرچہ اتنی جہالت اور اتنا ابہام نہیں ہوتا جتنا وائرلیس و ٹیلیگرام کے خبروں میں ہوتا ہے۔ لیکن اس میں بھی اتنی بات ضرور ہوتی ہے کہ آواز کی پوری شناخت ہوئی بھی ہے تو بہت کم اور دشواری سے حتی کہ محققین نے اس کا درجہ خط سے بھی کم شمار فرمایا ہے۔

کما حققہ الشیخ الموصوف بالبسط والتفصیل فی رسالۃ کشف الظنون عن حکم الخط والتیلیفون۔

جیسا کہ شیخ موصوف (مفتی محمد شفیع صاحب) نے نہایت بسط و تفصیل سے اس کو اپنے رسالہ کشف الظنون عن حکم الخط والتیلیفون میں واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔

اس لئے اس پر بھی عام طور سے مدار نہیں رکھ سکتے۔ البتہ بعض خاص صورتوں میں اس کا اعتبار کر سکتے ہیں، جس کی تعین و تشریح بعد میں اپنے موقعہ پر عرض ہوگی، رہ گیا ریڈیو تو جن میں چند قیود و شرائط کا اگر لحاظ کر لیا جائے تو صحت کا غلبہ ظن بھی بسہولت حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر چونکہ ریڈیو دنیا کے ہر خطہ سے آسکتا ہے اور آتا ہے، ایسے مقام سے بھی آتا ہے جہاں کا مطلع مختلف ہونا بالکل ظاہر اور مسلمات میں سے ہے جیسے کہ لندن، امریکہ، قسطنطنیہ، بلغاریہ، اور ان مقامات سے بھی اعلانیہ ضابطہ شرعی کے مطابق آسکتا ہے، اور اختلاف مطالع کے نفس وقوع سے اختلاف یا انکار بھی نہیں ہے۔ اگر انکار یا اختلاف ہے تو محض رویت ہلال کے ثبوت میں اس کے اعتبار کرنے یا اس پر مدار رکھنے میں ہے۔ اس لئے ریڈیو کے اس نشریہ کے اعتبار کرنے میں جو قیود و شرائط ہیں اور جن کا لحاظ رکھنا بہر حال ضروری ہے، اُن کو ہم ذرا تفصیل سے بیان کریں گے تاکہ منشار شارع علیہ السلام اور مقصد شرع سے تخالف یا تجاوز لازم نہ آئے جو کسی طرح درست نہ ہوگا۔

غرض اس مختصر تمہید کے بعد خاص طور سے ریڈیو سے متعلق تفصیلات و قیودات موعودہ نمبروار بیان کی جاتی ہیں جن کو احکام و مسائل کے لئے اصول موضوعہ اور قواعد کلیہ کے درجہ میں بھی کہا جا سکتا ہے اور اسی لئے ہم ہر صورت کو الگ الگ بعنوان مسئلہ نمبروار بیان کرتے ہیں تاکہ سمجھنا اور بھی آسان ہو جائے۔

مسئلہ نمبر ۱۔ جہاں حکومت کی جانب سے قاعدہ شرعی کے مطابق رویت ہلال کا ثبوت حاصل کر کے اعلان کرنے کا قانون و انتظام ہو، اور اس پر عمل رائج و مشہور ہو تو وہاں پر مقامی طور سے پورے حدود مملکت کے اندر عمل کرنے کے لئے یہ مطلق اعلان بھی مثل اعلان قاضی و مثل طبل قاضی و صوت مدافع وغیرہ معتبر ہوگا خواہ حکومت مسلمہ ہو یا کافرہ، اس اعلان اور نشریہ پر عمل کرنا لازم ہوگا۔

لحصول غلبۃ الظن بھذا الطریق فی ھذہ الصورۃ (حکم اس لئے ہے کہ) اس صورت میں اس طریقہ سے غلبہ ظن حاصل ہوجاتا ہے۔

اور اس صورت میں حدود مملکت سے باہر بھی اس اعلان ونشریہ پر عمل کرنا ضروری ہوگا، بشرطیکہ مہینہ بجائے ۲۹ و ۳۰ دن کا ہونیکے بجائے ۲۸/دن یا ۳۱/دن کا نہ ہورہا ہو (بحوالہ عبارت ۵)

اس لئے کہ یہ اعلان من کل الوجوہ محض طبل قاضی یا صوت مدافع وغیرہ کے مانند نہیں ہے کہ محض انہی کے حکم کے تابع اس کا بھی حکم ہو، اور وہی چیزیں اس کا مقیس علیہ ہوجائیں اور نہ ہی قضاۃ کے امور قیاسیہ مجتہدہ میں سے ہے کہ محض ان کے حدود اختیار ودائرہ حکومت کے اندر اندر محصور ہے اور نہ ہی معاملات محضہ یا امور سیاسیہ ملکیہ میں سے ہے کہ لنا دارنا ولکم دارکم کے قاعدے سے حدود حکومت ومملکت کے اندر اندر محدود رہے۔ بلکہ اعلان ان تمام مذکورہ چیزوں سے بہت قوی وبلند ہے۔ اور یہ اعلان ان صحابی رضؓ کے اعلان کے مانند ہے جن کو رویت ہلال کا شرعی ثبوت ہوجانے کے بعد خود سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کرنے کا حکم فرمایا تھا کما رواہ الجماعۃ والدارمی عن ابن عباسؓ قال جاء اعرابی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال انی رأیت الہلال یعنی ہلال رمضان فقال أتشہد ان لا الہ الا اللہ قال نعم قال أتشہد ان محمدا رسول اللہ قال نعم قال یا بلال اذن فی الناس ان یصوموا غدًا (مشکوٰۃ ص۱۷۴) یہ اعلان نبوی اس اعلان کا مقیس علیہ ہوسکتا ہے اور جس طرح یہ اعلان نبوی کسی دار یا حکومت کے حدود سے محدود نہیں تھا، اسی طرح یہ اعلان بھی کسی دار یا حکومت کے حدود سے محدود نہ ہوگا جیسا کہ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ کے مرادآباد کے اجلاس جمیعۃ العلماء کے اندر اپنے اکابر حضرت شیخ الاسلام اور حضرت

مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہم اللہ کے فیصلہ سے بھی معلوم ہوتا ہے ۔ نیز یہ اعلان خالص امور دینیہ سے متعلق ہے اور باب دیانات سے ہے بلکہ از قبیل عبادات اور خالص عبادات سے متعلق ہے ۔ بعض مہینوں میں کچھ آمیزش معاملات کی (جیسے ماہ عید الفطر وغیرہ)، جو نظر بھی آتی ہے تو وہ محض تبعاً وضمناً ہے ۔ اس میں صلاحیت نہیں کہ اس کو مقیس علیہ بنایا جائے اور اس پر مستقل احکام متفرع کئے جائیں بلکہ جس طرح اور امور دینیہ اور عبادات کے مخاطب سارے عالم کے مسلمان ہوتے ہیں، اسی طرح اس کے مخاطب بھی سارے عالم کے مسلمان ہو سکتے ہیں اور جس طرح وہ سب فلیبلغ الشاھد الغائب کے قاعدہ سے سب پر متوجہ رہتے ہیں، اسی طرح یہ بھی اسی قاعدہ سے سب پر متوجہ رہ سکتا ہے بشرطیکہ مخصوص شرعی الفاظ میں ہو، اور تمام شرائط وقیود کو حاوی ہو جن کی تشریح وتفصیل اپنے اپنے موقعہ پر آجائے گی ۔

مسئلہ ۲ ۔ جہاں پر حکومت کی جانب سے ایسا انتظام نہ ہو وہاں ایسا مسلمان حاکم جس کو حکومت کی جانب سے شرعی ثبوت حاصل کر کے اعلان کرنے کا اختیار ہو اور وہ اعلان کرے یا ہلال کمیٹی جس کے تمام افراد مسلمان باشرع ہوں اور اس کی پوری کارروائی میں کوئی مستند وتجربہ کار مفتی شریک ہو یا مستند مفتی شہر یا عالم مقتدا، ومتدین یہ لوگ اعلان کریں کہ شرعی ثبوت حاصل کرنے کے بعد یہ اعلان کیا جاتا ہے اور قرائن شرعیہ سے صحت کا ظن غالب ہو تو مقامی طور پر یہ اعلان بھی معتبر ہوگا، اور اس پر عمل کرنا درست ہوگا ۔

مسئلہ ۳ ۔ جہاں پر حکومت کی جانب سے کوئی شرعی انتظام نہ ہو اور نہ کوئی مسلمان حاکم منجانب حکومت حسب قاعدہ شرع ثبوت لے کر اعلان کا اختیار رکھتا ہو اور نہ کوئی شرعی ہلال کمیٹی وغیرہ ہو، جیسا کہ ہمارے ملک کی اکثر آبادیوں کا بالخصوص دیہاتوں کا یہی حال ہے ——— حالانکہ وہاں بھی مسلمان آباد ہیں، ور

بکثرت ہیں اور ان کو بھی روزے رکھنا اور شوال کی پہلی تاریخ متعین و معلوم کرنا ضروری ہے کیونکہ یکم شوال کو روزہ رکھنا حرام ہے، اور چاند ہر جگہ یا ہمیشہ نظر آنا ضروری نہیں اور ریڈیو بوجہ کثرت قریب قریب ہر گاؤں میں رائج ہو چکا ہے۔ اگر ریڈیو سے خبر آجائے اور آہی جاتی ہے، ایسے موقع پر کس طرح عمل کیا جائے تو اس کا حکم یہ ہے کہ یہ خبر اگرچہ اپنے ملک کے کسی حصہ سے آئے لیکن بایں الفاظ آئے کہ یہاں چاند ہوا ہے، یا فلاں شخص نے دیکھا ہے۔ یا بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے، تو یہ بالکل معتبر نہیں، خواہ کتنی ہی تعداد میں ایسی خبریں کیوں نہ آئیں۔

لانها حكاية محض لا خبر معتبر كما هو ظاهر۔	اس لئے کہ یہ خبر و حکایت محض ہے جو شریعت میں غیر معتبر ہے۔

اور ہمارے ملک میں آجکل ریڈیو کی خبریں اکثر ایسی ہی ہوتی ہیں، اور عوام بھی اکثر بلا لحاظ شرائط و قیود اس کو معتبر اور قابل عمل قرار دے کر عمل کر بیٹھتے ہیں اور ان ہی وجوہ کے بناء پر بعض حضرات علماء نے ریڈیو وغیرہ کی خبروں کو مطلقاً غیر معتبر و ناقابل عمل قرار دیا ہے۔ ورنہ راجح و محقق یہ ہے کہ اگر بایں الفاظ اعلان یا نشر خبر ہو کہ میرے سامنے فلاں حاکم شرعی نے یا فلاں ہلال کمیٹی نے جس کے تمام افراد باشرع ہیں یا فلاں مفتی شہر نے یا فلاں عالم مقتدیٰ و متدین نے یا فلاں مسلمان حاکم یا مسلمان وزیر نے (جس کو حکومت وقت کی جانب سے بااختیار بنایا گیا ہو) ثبوت شرعی حاصل کر کے ثبوت رویت کا حکم یا فیصلہ دیدیا ہے، اور ان الفاظ کا نشر کرنے والا شخص بھی معلوم و معتبر ہو تو اس نشریہ پر بھی عمل کرنا درست اور صحیح ہوگا۔

لان البلدة لا تخلوا عن حاكم شرعي عادة ينفذ احكامه فيستند هذا الخبر	اس لئے کہ کوئی شہر ایسے حاکم شرع سے عادۃً خالی نہیں رہتا جس کے احکام اس شہر میں نافذ ہوتے ہیں، پس یہ خبر اس حالت

الی موجب شرعی صحیح واقلہ ان یحصل بہ غلبۃ الظن الموجب للعمل کما یحصل بسماع اصوات المدافع وبرویۃ القنادیل من المصر	ہیں، صحیح شرعی سبب کی جانب سے منسوب ومستند ہوگی اور اس کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ اس سے ایسا غلبۂ ظن حاصل ہو جائے گا جو عمل کرنے کی وجہ سے ہو سکے گا۔

اسی طرح بایں الفاظ خبر یا اعلان نشر ہو کر میں نے خود چاند دیکھا ہے یا مجھ سے فلاں فلاں (کم از کم دو معتبر عادل) شخصوں نے خود اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے اور ان الفاظ کا نشر کرنے والا شخص معلوم اور معتبر ہے اور قرائن شرعیہ سے صحت کا ظن غالب ہے تو مقامی طور پر یہ خبریں بھی طرق موجبہ کے مطابق ہونے کی وجہ سے معتبر ہوں گی اور قابل عمل ہوں گی۔

کما حققہ العلامہ التھانوی رحمہ اللہ فی رسالۃ زوال السنۃ عن اعمال السنہ وفی امداد الفتاویٰ ص ۲/۲۶۔	جیسا کہ علامہ تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ زوال السنہ عن اعمال السنہ میں اور امداد الفتاویٰ ص ۲/۲۶ میں اس کی تحقیق کی ہے ۱۲

مگر اس کے معتبر ہونے میں یہ تفصیل ہوگی کے اس خاص آبادی کے آس پاس آبادی میں جہاں جانا آنا زیادہ دشوار نہ ہو، اگر کوئی عالم متدین موجود ہو جو اس قسم کے مسائل سے واقف ہو، اس کے سامنے ریڈیو سے خبر سننے والوں کو پیش کر کے بیان دلائیں پھر حکم شرعی معلوم کر کے اس کے مطابق عمل کریں، عوام خود رائی و عجلت نہ کریں۔

مسئلہ۔ جو دیہات یا آبادی ایسی ہو کہ اس کے آس پاس کی آبادی میں ویسا متدین اور ذی علم شخص موجود نہ ہو جو اس قسم کے مسائل سے بخوبی واقف ہو۔ اور اس کے مقتضی پر عمل کرتا ہو یا موجود ہو مگر وہاں تک ریڈیو سے خبر سننے والوں کا جانا آنا دشوار ہو اور ان عالم کا آنا بھی دشوار ہو، مندرجہ ذیل طریقہ سے عمل کیا جائے تو درست ہوگا اور نجات آخرت کے لئے انشاء اللہ کافی ہوگا، البتہ دوسروں سے الجھنا

یا زبردستی کرنا یا دوسروں کو ماننے پر مجبور کرنا ہرگز درست نہ ہوگا۔ اور وہ طریقے یہ ہیں۔

(الف) اگر مطلع صاف ہونے کی حالت میں اس معتبر مضمون کا نشریہ آجائے جو مسئلہ ۳ میں راجح اور محقق کہہ کے لکھا گیا ہے، یعنی یہ ہے کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے (اور یہ شخص معلوم و معتبر ہو) یا یہ مضمون ہو کہ مجھ سے فلاں (معلوم و معتبر) شخص نے خود اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے یا میرے فلاں شرعی ہلال کمیٹی یا فلاں با اختیار مسلمان حاکم نے یا فلاں قاضی شرع نے یا فلاں مفتی شہر نے (اور یہ سب لوگ معتبر و معلوم ہوں) شرعی ثبوت لے کر رویت ہلال کا حکم دیا ہے، اور یہ اعلان یا خبر اتنی تعداد میں آجائے کہ عادۃً ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا مقصود نہ ہو یا متعذر ہو تو عمل کرنا جائز ہوگا، صرف دو ایک نشریہ کبھی اس صورت میں عمل کے لئے کافی نہ ہوگا، خواہ ہلال عید کے موقع پر ہو یا ہلال رمضان کے۔

(ب) اگر مطلع صاف نہ ہو اور موقع ہلال رمضان کے ثبوت کا ہو، اور مضمون وہی ہے جو ابھی (الف) میں راجح اور محقق کہہ کے لکھا گیا ہے۔ یعنی یہ ہے کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے الخ تو ایک نشریہ بھی عمل کے لئے کافی ہو جائے گا۔

(ج) اگر مطلع صاف نہ ہو، اور موقع ہلال عید کے ثبوت کا ہو یا رمضان کے علاوہ کسی اور مہینہ کا ہو، مثلاً شعبان یا بقرعید وغیرہ کا ہو تو ایسے معتبر مضمون کا نشریہ جس کو راجح اور محقق کہہ کے ابھی لکھا گیا ہے کم از کم دو کی تعداد میں آنا ضروری ہے جو مختلف مقامات سے کیف ما اتفق آرہے ہوں، اور اس نشریہ کے صادق ہونے کا اور نشر کرنے والوں کے عادل ہونے کا ظن غالب ہو۔

مسئلہ ۵ اگر منجانب حکومت ثبوت رویت کا کوئی شرعی انتظام نہ ہو، اور نہ کوئی مسلمان حاکم منجانب حکومت شرعی قاعدہ کے مطابق بذریعہ ریڈیو وغیرہ اعلان نشر کرتا ہو اور نہ کوئی شرعی ہلال کمیٹی حسب ضابطہ شرع اس خدمت کو انجام دیتی ہو،

اور نہ وہ آبادی ایسی ہو کہ اس میں یا اس کے آس پاس کی آبادی میں کوئی ایسا متدین اور ذی علم موجود ہو جو اس قسم کے مسائل سے بخوبی واقف ہو، اور اس کے مقتضی پر عمل کرتا کراتا ہو یا موجود ہو مگر وہاں تک ریڈیو سے خبر یا اعلان سننے والوں کا جانا آنا دشوار ہو، اور ان عالم کا آنا بھی دشوار ہو تو ان حالات میں ہلال رمضان کے ثبوت کے لئے ٹیلیفون کے اعتبار کر لینے کی بھی گنجائش ہو سکتی ہے۔

ٹیلیفون سے آنے والی اطلاع اگرچہ شرعی شہادت نہیں ہوگی کیونکہ باب شہادت میں شاہد کا مجلس شہادت میں حاضر ہونا ضروری ہے اور وہ یہاں مفقود ہے۔ اور پس پردہ کی شہادت شرعاً معتبر نہیں، لیکن چونکہ اس پر دین کے ایک بہت بڑے مسئلہ کی بنیاد واقع ہو رہی ہے، اس لئے اس کو مؤثق کرنے کے لئے حتی الامکان ان قیود کا اعتبار کرنا ضروری ہے جو شہادت میں ملحوظ ہوتی ہیں۔

اس لئے ٹیلیفون کا مضمون وہی ہو، جو مسئلہ ۳ میں محقق و راجح کہہ کر لکھا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ ٹیلیفون سے بولنے والا یہ اطلاع ان الفاظ میں دے رہا ہو کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے یا مجھ سے فلاں معتبر شخص نے جس کو میں خوب جانتا ہوں، اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے یا میرے سامنے فلاں شرعی ہلال کمیٹی نے جس کو میں خوب جانتا ہوں، اور اس کے تمام ارکان ذی علم اور متدین ہیں۔ شرعی ثبوت لے کر رویت ہلال کا حکم و فیصلہ دیا ہے یا ٹیلیفون پر کہنے والا یہ کہہ رہا ہو کہ میرے سامنے فلاں مسلمان حاکم جو اس قسم کے معاملات میں اعلان کرنے کا اختیار رکھتا ہے، اس نے یا فلاں قاضی شرعی نے یا فلاں مفتی شہر نے شرعی ثبوت لے کر رویت کا حکم و فیصلہ دیا ہے۔ اور اس مسلمان حاکم اور قاضی شہر یا مفتی شہر کو میں خوب جانتا ہوں اور یہ لوگ معتبر و متدین ہیں۔ اور پھر یہ شخص جو ٹیلیفون پر بول رہا ہے۔ یہ بھی خوب جانا پہچانا اور معتبر و متدین شخص ہو۔ اور اس کی آواز بھی خوب پہچانی جا رہی ہو،

اور پھر ان الفاظ میں ان قیود کے ساتھ آنے والے ٹیلیفون کے معتبر ہونے کے بعد اس پر عمل کرنے کی محض مندرجہ ذیل صورتیں ہیں۔

(الف) مطلع صاف ہو تو محض دو ایک ٹیلیفون کافی نہیں خواہ کمیٹی ہی ثقہ اور معتبر لوگوں کی ہو، بلکہ ملک کے مختلف گوشوں سے ان ہی مذکورہ بالا الفاظ میں اتنی تعداد میں آجانا ضروری ہے کہ عادۃً ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا متصور نہ ہو یا متعذر ہو۔

(ب) مطلع صاف نہ ہو اور موقع ہلال رمضان کے ثبوت کا ہو تو صرف ایک ٹیلیفون بھی اپنے عمل کے لئے کافی ہوگا۔

(ج) مطلع صاف نہ ہو اور موقع ہلال عید کے ثبوت کا ہو یا رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے کا ہو مثلاً شعبان یا بقرعید کا، ہو تو کم از کم ان مذکورہ معتبر الفاظ میں دو ٹیلیفون کا آنا ضروری ہے جو مختلف مقامات سے کیف ما اتفق آرہے ہوں۔ اور ان کے صادق اور معتبر ہونے کا ظن غالب حاصل ہو رہا ہو۔ اسی طرح اگرچہ کوئی شرعی انتظام ہو اور خبر کو ثبوت شرعی کے ساتھ نشر کرنے کے مراکز بھی موجود ہوں، لیکن ٹیلیفون کی اطلاع ایسے مقام سے آرہی ہو کہ وہاں سے شرعی اصول وضابطہ کے مطابق ان مراکز تک اطلاع پہنچنا سخت دشوار و متعذر ہو، اس حالت میں اگر یہ اطلاع ان ہی معتبر الفاظ میں آرہی ہو تو یہ بھی اِن ہی مذکورہ بالا تفاصیل وقیود کے مطابق معتبر ہو سکے گی۔

تنبیہ:۔ یہی وہ حالتیں اور صورتیں ہیں جن میں ٹیلیفون کے اعتبار کی گنجائش ان مذکورہ تفصیل وشرائط کے ساتھ ہو سکتی ہے اور جن کے بیان کا شروع وعدہ کیا گیا تھا۔

ھذا ایضاً استفاد من رسالۃ زوال السنۃ عن اعمال السنۃ ص۱۹-۱۸	یہ احکام بھی رسالہ زوال السنۃ عن اعمال السنۃ سے اور امداد الفتاویٰ ص۲ سے

ومن اصل امداد الفتاوی ص۲۲ ج ۲ لمجدد الوقت المحقق العلام اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ۔ مستفاد ہوتے ہیں، جو مجدد وقت حضرت علامہ تھانویؒ کے افادات میں سے ہے۔

مسئلہ ۶۔ جب یہ اعلانات اور نشر بیرون ملک سے آئیں اور اپنے یہاں مثل مسئلہ ۱ کے انتظام موجود ہو تو اس انتظام کے تحت جو اعلان ہو فقط اس پر عمل کریں خود عجلت نہ کریں اور اگر مثل مسئلہ ۱ کے انتظام نہ ہو تو مسئلہ ۲ کے مطابق عمل کریں اور اگر اس کی بھی صورت نہ ہو تو مسئلہ ۳ میں راجح و محقق کہکر بایں الفاظ لکھا گیا ہے۔ "میں نے خود چاند دیکھا ہے یا میرے سامنے فلاں حاکم شرعی نے ثبوت کا فیصلہ دیا ہے الخ" اس کے مطابق عمل کریں اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو تو مسئلہ ۴ کے مطابق عمل کرلیں۔ اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو مگر ٹیلیفون آرہے ہوں تو مسئلہ ۵ کے مطابق عمل کریں۔

تنبیہ ۲۔ ان تمام صورتوں میں عمل جائز ہونے کے لئے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ ان کے اعلانات یا خبروں پر عمل کرنے سے مہینہ ۳۰ / یا ۲۹ / دن کے بجائے ۲۸ / دن یا ۳۱ / دن کا نہ ہو رہا ہو۔ ورنہ کسی صورت میں بھی عمل کرنا قطعاً جائز نہ ہوگا مثلاً رمضان کی ۲۸ / ہی تاریخ کی شام کو اعلان یا خبر آجائے خواہ ان الفاظ میں کیوں نہ آجائے۔ جس کو راجح و محقق کہہ کر لکھا گیا ہے۔ یعنی میں نے چاند دیکھا ہے یا فلاں فلاں نے چاند دیکھا ہے الخ تو یہ اعلان یا خبر کسی طرح شرع میں معتبر نہ ہوگی چاہے مسئلہ ۱ کی حالت ہو یا مسئلہ ۲ یا مسئلہ ۳ کی یا مسئلہ ۴ کی۔ یا مثلاً شعبان کی ۳۰ / کو بدلی تھی چاند نظر نہ آنے کے باوجود اس کے بعد والے دن کو فقہی قاعدہ کے مطابق رمضان قرار دے کر روزہ رکھ لیا اور بعد دوپہر بذریعہ ریڈیو یہ اعلان آگیا کہ میں نے آج چاند دیکھا ہے اور کل آئندہ رمضان کی پہلی تاریخ ہے، تو اس اعلان یا خبر پر عمل نہ کریں گے۔ اور روزہ نہ توڑیں گے بلکہ اسی دن کو جس میں روزہ رکھا ہے رمضانًا

کی پہلی تاریخ ماننا ضروری رہے گا ورنہ شعبان کا مہینہ ۳۱ ردن کا ہونا لازم آجائے گا، اور یہ جائز نہیں۔ نص صریح کے خلاف ہے۔ کما مر فی التمھید۔

تنبیہ۳ - خوب یاد رہے کہ اس قسم کے اعلانات وخبروں پر عمل کرنے میں بڑی ہی احتیاط لازم ہے۔ حتی کہ اگر بعد میں دلیل شرعی سے بالیقین معلوم ہو جائے کہ اس اعلان یا خبر کی وجہ سے جس دن روزہ افطار کرلیا یا روزہ نہیں رکھا، حالانکہ اس دن روزہ رکھنا چاہیے تھا یا وہ دن رمضان ہی کا تھا تو اس دن کی قضا رکھنی ضروری اور لازمی ہوگی۔ مثلاً دلیل شرعی سے یہ معلوم ہو جائے ۲۹ رمضان کی بذریعہ ریڈیو رویت کی خبر غلط تھی۔ اس کے بعد والے دن یکم شوال نہ تھی بلکہ ۳۰ رمضان تھی جیسے خود ریڈیو ہی نے تردید کردی کے وہ خبر غلط ثابت ہوگئی ہے تو اس کی قضا رکھنی ضروری اور لازمی ہوگی۔

تنبیہ۴ - شہر کے لوگوں کی طرح دیہات کے لوگوں کو بھی چاہیئے کہ دو دو چار چار گاؤں کا حلقہ بنا کر اس میں ہلال کمیٹی بنالیں اور اس میں ایک متدین کو بھی جو مسائل متعلقہ سے واقف ہو شریک کرلیں۔ پھر حسب قاعدہ شرعی مذکورہ بالا اس کے ماتحت عمل کرلیا کریں۔ اور ان ہلال کمیٹیوں کے بنانے میں حتی المقدور سعی وکوشش کریں کچھ ایثار کریں۔ بہرحال جہاں یہ بھی ممکن نہ ہو وہاں جو شہر یا قصبہ قریب ہو، اور وہاں اس کا نظم ہو اپنے کو اس سے وابستہ کرلیں اور اس کے ہدایات کے مطابق عمل کرلیا کریں۔

تنبیہ۵ سب سے عمدہ اور بہتر صورت تو یہ ہے کہ حکومت وقت کیجانب سے رویت ہلال کا انتظام باقاعدہ قانونی شکل میں کرالیا جائے۔ کم از کم ہلال عید دبقر عید وشعبان ورمضان ہی کا نظم کرالیا جائے، اس لئے کہ خبر رسانی کے ذرائع ووسائل کثیر وآسان وعام ہوتے جا رہے ہیں۔ ٹیلیگرام وٹیلیفون ریڈیو لاسلکی

وغیرہ جن میں بعض تو گھر گھر نہیں تو گاؤں گاؤں تقریباً ہوتے نظر آرہے ہیں اگر اسطرف توجہ نہ کی گئی تو بعد چندے عامۃ المسلمین بڑی الجھنوں میں مبتلا ہونے لگیں گے۔ اس انتظام کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حکومت ایک متدین ذی علم مسائل و احکام رویت سے بخوبی واقف اور مستند مسلمان کو متعین کر کے اس کو قانوناً اختیار دیدے کہ وہ اپنے طور پر شرعی قاعدہ سے رویت ہلال کا ثبوت حاصل کر کے وقت پر قیود و تفصیلات شرعیہ مذکورہ کے ماتحت اعلان کر دیا کرے اور سارا ملک اس کے مطابق عمل درآمد کر لیا کرے۔ یا مثلاً اس طرح انتظام کر لیا جائے کہ ہلال کمیٹی جس کے سب ارکان باشرع ہوں، اور اس میں ایک مستند اور تجربہ کار مفتی شریک کار ہو وہ کمیٹی ایسے انتظام میں رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کر کے حکومت سے اجازت لے کر بایں الفاظ اعلانیہ نشر کر دے یا کرا دے کہ ہم فلاں ہلال کمیٹی کے تمام افراد رویت کا شرعی ثبوت کے ملنے کے بعد باتفاق آرا اعلان کرتے ہیں یا کراتے ہیں کہ رویت ہلال کا شرعاً ثبوت ہو چکا ہے اور کل یکم رمضان ہے روزے رکھے جائیں۔ یا یکم شوال ہے نماز عید ادا کی جائے۔ پھر اسی طرح ہلال شعبان وذی الحجہ وغیرہ کے لئے اعلان کر دیا جائے یا کرا دیا جائے۔ نیز اگر ضرورت پڑے (ضرورت واقعی ہے) تو جہاں جہاں اسی قسم کے لہر (یعنی ریڈیو وغیرہ) کے مراکز ہوں، اسی قاعدہ مذکورہ تنبیہ کے مطابق انتظام کر لیا جائے اور پھر سب کو ایک میں منسلک کرا لیا جائے۔

امید ہے کہ اس تفصیل سے صورت مسئولہ کے تمام شقوں کا جواب بقدر ضرورت نکل آئے گا اور انشاء اللہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہے گا۔ اس لئے اب کسی مزید تفصیل کی حاجت نہ رہی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ الاحقر محمد نظام الدین عفی عنہ

الجواب الصحیح سید احمد علی سعید ۲۱/۸/۲ھ الجواب الصحیح محمود عفی عنہ ۲۱/۸/۲ھ

ذبیحہ مشینی کا حکم

سوال (۶) :- ایک شخص کا قیام ایک ملیشیائی ملک میں ہے۔ جہاں عام طور پر حلال گوشت نہیں ملتا یا ذبیحہ کا گوشت فراہم نہیں ہوتا، دوسری میتہ در غذا بھی روزانہ ملنی مشکل ہیں کیونکہ بحد گرانی ہے، سبزی بھی کمیاب ہے۔ البتہ گائے کا گوشت وہاں ملتا ہے، مگر معمول کے مطابق ہاتھ سے ذبیحہ نہیں کیا جاتا، بلکہ مشین کے ذریعہ ذبح کیا جاتا ہے۔ مشین کے اندر چھرا لگا رہتا ہے۔ وہ چھرا گردن پر آکر لگتا ہے اس سے گردن کٹتی ہے، اس کے بعد باقی جسم کا گوشت مشین کے ذریعہ کٹتا ہے، اس سارے کام کو ایک ہی آدمی مشین کے سوئچ سے کنٹرول کرتا ہے، اس کو کرنے والے اہل کتاب ہی ہوتے ہیں، نہیں معلوم وہ شخص اس وقت اللہ کا نام لیتا ہے یا نہیں۔ اس صورت میں اور ان حالات میں مشین کا ذبح ایک مسلمان کو کھانا درست ہوگا یا نہیں۔

الجواب :- ذبح کا مسنون اور بہتر طریقہ یہی ہے کہ جانور کو قبلہ رخ اس کے بائیں پہلو پر لٹا کر ذبح کرنیوالا بسم اللہ، اللہ اکبر کہتا ہوا چھری اپنے ہاتھ سے اس کی گردن پر چلاتا ہوا گردن کی چاروں رگوں (حلقوم - ودی - ود - وجین) کو کاٹ کر دم سائل بہا دے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو کہ ذابح براہ راست خود گلے پر چھری چلائے مگر انہارِ دم اپنی شرائط وقیود شرعیہ کے تحت ہو جائے جب وہ ذبیحہ حلال اور جائز کہا جائے گا۔ جیسے بسم اللہ، اللہ اکبر کہکر بذریعہ کمان تیر چلا کر شکار کر لینا اور اسی چیز کے ذریعہ انہار دم کو باقی قرار دینا اور ذبیحہ کو حلال سمجھنا یا بسم اللہ اللہ اکبر کہنے کے ساتھ کلب معلم کو شکار پر چھوڑنا اور اس کے دانتوں کے ذریعہ انہارِ دم کو کافی مذبوح اور حلال سمجھنا وغیرہ بہت سی صورتیں اس کی مثال مل سکتی ہیں، اور اسی طرح مشینی ذبیحہ میں بھی اگر بٹن دبا کر چھری چلانے والا کوئی مسلمان یا اہل کتاب ہو، اور بٹن دبلتے وقت کسی غیر اللہ کا نام نہ لیتا ہو بلکہ صرف اللہ کا نام لیتا ہو۔ مثلاً بسم اللہ اللہ اکبر

کہتا ہو، اور چھری غیر مسلموں کے جھٹکے کی طرح گردن نہ اڑا دیتی ہو بلکہ ذبح کی طرح گردن کی چاروں رگوں کو پہلے کاٹ لی ہو اور دم سائل اچھی طرح خارج ہو جاتا ہو تو وہ ذبیحہ بلاشبہ حلال اور جائز رہے گا۔ اور یہ بات الگ رہے گی کہ یہ طریقہ اور عمل خلاف سنت سلوک ہونے کی وجہ سے مکروہ اور قبیح شمار ہو، اور اصلاح کی کوشش کرنا ان لوگوں پر جو اصلاح پر قدرت رکھتے ہوں حسب قدرت واستطاعت ضروری ہے۔ اور پھر جب یہ معلوم ہے کہ وہ بٹن دبانے والے اہل کتاب ہی ہوتے ہیں تو غالب گمان یہ ہے کہ وہ محض اللہ ہی کا نام لیتے ہوں گے کبھی غیر اللہ کا نام نہیں لیتے ہوں گے جیسا کہ یہود کے یہاں یہی طریقہ رائج ہے کہ وہ محض اللہ کا نام لے کر ذبح کرتے ہیں، اس لئے جب تک دلیل سے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ غیر اللہ کا نام لیتے ہیں جیسے عزیر ابن اللہ مسیح ابن اللہ وغیرہ کا نام لیتے ہیں۔ یا قصداً اللہ کا نام لینا ترک کر دیتے ہیں حرمت کا حکم نہ لگائیں گے، اور نہ اس کی کاوش وکرید کرنا ذمہ میں لازم ہوگی البتہ اگر قرائن قویہ صحیح سے اللہ کا نام لینا قصداً ترک کر دینے کا یا غیر اللہ کا نام لے لینے کا شبہ ہو یا شرائط وقیود شرعیہ جن کی رعایت علت ذبح کے لئے ضروری ہے مفقود ہو جانے کا شبہ ہو تو نہ کھانے میں احتیاط ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ الاحقر نظام الدین عفی عنہ

دار العلوم دیوبند ۱۸/۷/۹۱ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید الجواب صحیح محمود غفرلہ

بعض ناجائز کاروبار سے بچنے کی تدبیر

سوال (۷)۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید سینما ہال کا مالک بھی ہے، اور وہ فلم کی ریل منگوا کر فلم بھی چلاتا ہے اس طرح کی کمائی ہوئی دولت، مکانات، کھیتیاں اور نقد روپیہ کی شکل میں رکھتا ہے۔ آٹھ، دس سال سے باقاعدہ پنجگانہ نماز ادا کرتے رہتے ہیں

حاجی بھی ہے مگر ذریعہ معاش سینما ہال اور کھیتیوں کی آمدنی ہے۔ کھیتیاں وغیرہ بھی سینما ہال کی آمدنی سے ہی خریدی گئی ہے۔ نیز وہ سینما ہال کا دھندا چھوڑ کر کوئی اور تجارت کرنے کی جدوجہد بھی کر رہا ہے۔ مگر لاکھوں روپیہ مذکور تجارت میں پھنسے ہونے کی وجہ سے جلد علیحدہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اب وہ چاہتا ہے کہ ایک مدرسہ کھولے جہاں دینیات، حدیث و تفسیر اور ابتدائی علوم دینیہ پڑھائے جائیں، بچوں کے لئے ایک قیام گاہ اور ایک مسجد تعمیر کی جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا زید کی اس آمدنی سے زید کا مدرسہ کھولنا مسجد تعمیر کرنا جائز ہے۔ اور جائز نہ ہونے کی صورت میں اس کی لاکھوں روپے کی دولت کی تطہیر کی شریعت مطہرہ میں کونسی صورت ہے، بیان فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب: ان روپیوں سے براہ راست مسجد وغیرہ کی تعمیر نہ کریں بلکہ کسی سے قرض لے کر تعمیر کرلیں، اور وہ قرض ان روپیوں سے ادا کردیں۔ اور اگر کسی غریب شخص سے جو مصرف صدقہ ہو کہیں کہ تم اتنے روپے کسی سے قرض لے کر مجھے بطور اعانت مدرسہ و چندہ دیدو، میں تمہارا قرض ادا کردا دوں گا، اور اس کو اطمینان دلا دیں۔ وہ غریب شخص کسی سے قرض لے کر دیدے اور پھر یہ شخص اسی اپنے روپیہ سے اتنا روپیہ بطور صدقہ اس غریب کو دیدے جس سے وہ اپنا قرض ادا کردے تو اس طرح تطہیر بھی اتنے صدقہ کردہ روپیہ کی ہو جائے گی۔

اس روپیہ سے جو کھیت خریدا ہے، اگر اس کھیت کو اجارہ یا لگان پر دے گا تو اس کا نفع بھی صدقہ کرنا ہوگا۔ ہاں اگر اس کھیت میں خود کاشت کرے اور کھیتی کرے اور اپنی محنت سے جو غلہ و پیداوار ہوگی وہ حلال ہوگی، اس کا کھانا درست رہے گا پس اس سابق حاصل کردہ روپیہ سے ہزار دو ہزار ایکڑ یا جتنا ہو سکے آراضی خرید کر اس میں اپنا فارم بنا کر کھیتی کرے اور پیداوار حاصل کرے۔ اور اس کو اپنا

ذریعہ معاش بنالے اور تھوڑا تھوڑا حسب موقع بغیر نیت ثواب محض وبال سے بچنے کے لیے صدقہ بھی کرتا رہے۔ تو انشاء اللہ ذریعہ معاش بھی پاک رہے گا اور تطہیر بھی ہوجائیگی جب کہ اس طرح حرام کمائے ہوئے روپے کی مقدار صدقہ ہوجائے گا۔

صدقہ کرنے میں جو مدرسہ کھولے گا اس کے اندر غریب و مسکین طلباء کے کھانے کپڑے پر بھی خرچ کرنا درست ہوگا۔

سینما ہال اگر حرام روپیہ سے نہیں بنوایا ہے بلکہ پاک روپیہ سے بنا ہوا ہے تو اس میں فقط سینما خود کرانا بند کر کے اس کو کرایہ پر دیدینا کافی ہوگا۔ جو کرایہ ملے گا وہ طیب ہوگا۔ اور اگر سینما ہال بھی حرام ہی روپیہ سے خریدا ہے تو اس کی خرید کی قیمت کے برابر اسی طرح اور جو مکانات ہیں ان کی قیمت کے برابر بھی جب تصدق کردے گا تھوڑا تھوڑا کر کے تو وہ بھی طیب ہوجائے گا۔ اور اس کا کرایہ وغیرہ کی آمدنی بھی حلال ہوجائیگی البتہ ریل کو فروخت کردے۔ اور اس ناجائز کاروبار کو ختم کردے۔

فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۔ ۲۸/۲/۵ھ

ادھیا پر دی ہوئی بکری کے بچہ کی قربانی مالک بکری کو درست ہے

سوال (۸) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ:۔

زید نے اپنی بکری کو اس شرط پر دیا کہ وہ اس کی رکھوالی کرے اور اس سے جو بچہ پیدا ہو۔ ہم دونوں بانٹ لیں۔ اتفاق سے بکری نے ایک بچہ دیا، زید نے اس بچہ کی قیمت لگا کر نصف رقم بکر کو دے کر بچہ لے لیا۔ اب وہ بچہ ایک سال سے زائد کا ہوچکا ہے، اور زید اس کی قربانی کرنا چاہتا ہے۔ جب کہ کچھ لوگ اس کو قربانی سے منع کر رہے ہیں، کیا وہ قربانی کرسکتا ہے۔

الجواب:- یہ معاملہ فاسد ہے، شرعًا اجارہ فاسدہ ہے۔ بکری اور اس کے بچہ کا اصل مالک زید ہی ہے، بکر صرف اجرت مثل کا شرعًا مستحق ہے اور زید جس طرح بکری کا صحیح مالک ہے اسی طرح چونکہ وہ بچہ اسی بکری سے مستفاد ہوا ہے اس کا بھی صحیح مالک ہے جب ملک صحیح ہے وہ بچہ مملوک زید ہے تو اس کی قربانی کرنا زید کے لئے بلاشبہ درست ہے منع کرنا صحیح نہیں، البتہ بکر کو جب تک باصول شرع تملیک کا صحیح معاملہ نہ کرے خود اس کی قربانی کرنا منع ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب - کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دار العلوم دیوبند

الجواب صحیح سید احمد علی سعید ۲۷ ۱۲ ھ

انعام کا غلط طریقہ

سوال (۹) کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل میں کہ

چند لڑکوں نے مل کر ایک کمپنی شروع کی ہے اس کا نام "سونا ٹریڈرس" ہے کمپنی کا اصول یہ ہے کہ دس ہزار ممبر بنائے جائیں اور ہر ممبر سے دس روپے فیس لی جائے۔ کل رقم ۱۰۰۰۰۰ ایک لاکھ روپے ہوئے، اس رقم کو لے کر تجارت کرنے کا ارادہ ہے، اور ممبران کو ان کی اصلی رقم واپس کرنے کی صورت یہ ہے کہ ہر ماہ پانچ سو روپے کی ہم انعامات کھولے جائیں ۸ رانعامات ۲۵/۲۵ روپے کے اور ایک انعام تین سو روپے کا۔ ان انعامات کی ترتیب قرعہ اندازی جیسی ہوگی کہ دس ہزار ناموں کو ایک ڈبہ میں ڈال کر ۹ ر پرچہ ہر ماہ نکالے جائیں، اسی طرح ۵ رسال تک ہر ماہ کیا جائے اور ۵ رسال بعد بقیہ ممبران کو کمپنی جو بونس (نفع) مقرر کرے وہ مع اصلی رقم کے واپس کر دیا جائے گا آیا اس کمپنی میں ممبر بننا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی تقسیم شرع کے خلاف تو نہیں ہے مفصل تحریر فرمادیں۔

(نوٹ) جن ممبران کا نام انعامات میں آجائے گا ان کو پھر کمپنی سے کوئی جوڑ یا تعلق

باعتبار پیسے کے نہیں ہوگا۔

الجواب:- اس کمپنی کا یہ طریقہ انعام و نفع تقسیم کرنے کا غلط ہے۔ قمار اور سود کو شامل ہے جائز نہیں، اس لئے اس میں شریک ہونا اس کا ممبر بننا جائز نہیں ہے

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہٗ

دار العلوم دیوبند۔ ۲۲/۷/۹۱ھ

الجواب صحیح محمود غفرلہٗ　　　الجواب صحیح سید احمد علی سعید

ایک خاص قسم کے بیمہ زندگی کا شرعی حکم

سوال (۱۰) کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان شرع مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ ہندوستان میں گورنمنٹ کی طرف سے ایک کمپنی قائم ہے جس میں انسان کے زندگی کا بیمہ کرتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً زید کی زندگی کا بیمہ مبلغ پچیس ہزار کا کیا اور مدت بیمہ پندرہ سال ہے۔ پندرہ سال میں زید کو پچیس ہزار روپیہ کی رقم اس کمپنی کو دینا ہے۔ لیکن قسطوار، جب پندرہ سال پورا ہوجائے تو پچیس ہزار روپیہ زید کو پورا کرنا ہوگا۔ پندرہ سال کے بعد پوری رقم مع اس کے نفع کے کمپنی زید کو واپس کرے گی۔

لیکن اس شرط کے ساتھ کے نفع میں پانچ فیصدی کمپنی نفع سے لے گی بقیہ نفع زید کو واپس کرے گی۔ اور دو سال ابتدائی میں زید کو قسط برابر دینا ہوگی، اگر اس نے ناغہ کر دیا تو جو رقم زید نے دیا ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ دو سال کے بعد اگر قسطوار نہیں دیا تو ساری نہیں جائے گی۔ اور اگر خدانخواستہ ایک قسط ادا کرنے کے بعد زید کا انتقال ہو جائے تو زید کے وارث کو پورا پچیس ہزار روپے مع نفع کے ملے گا، تو آیا اس صورت میں زید کو زندگی کا بیمہ کرانا جائز ہے یا نہیں۔ پانچ فیصدی رقم نفع کی جو کمپنی کاٹ لیتی ہے وہ نفع خود نہیں بلکہ بیواؤں کو جو لوگ مرجاتے ہیں ان کی رقم عوض کر کے دیدیتی ہے

بینوا و توجروا۔

الجواب :- اس شرط سے کہ کمپنی نفع میں سے پانچ فیصدی کاٹ کر بقیہ نفع دے گی، تو خرابی واقع نہ ہوگی، البتہ اس معاملہ میں دوسری اور خرابیاں ہیں۔ مثلاً پندرہ سال بعد پوری رقم مع اس کے نفع کے کمپنی جو واپس دے گی، اس میں وہ پورے سرمایہ کے فیصد کے حساب سے دیگی جیسے پورے سرمایہ (پندرہ ہزار کا) پانچ فیصد یا سات فیصد نفع تخصیص کریگی یا کیا صورت ہوگی، اگر سرمایہ کے فیصد کے تعین کے ساتھ نفع متعین ہے، تو یہ نفع تجارت کے اصول پر نہیں ہوگا، کیونکہ تجارت میں کبھی نفع کم کبھی زیادہ ہوتا ہے، اسی طرح پورے سرمایہ پر پندرہ سال میں بھی سرمایہ کا فیصد متعین نہیں ہوسکتا۔ فیصد سرمایہ کا متعین کر کے نفع مشخص کرنا یہ سود ہوجائے گا دوسری خرابی یہ ہے کہ ابتدائی دو سال میں اگر کوئی ایک قسط بھی ناغہ ہوگئی تو کل دی ہوئی رقم ضبط ہوجائے گی۔ یہ شرط غلط اور ناجائز ہے معاملہ کو قمار بنادیتی ہے۔ اسی طرح اگر رقم جمع کرنے والا ایک قسط بھی ادا کر کے مرجائے تو کمپنی پورے پچیس ہزار روپے ادا کرنے ہوں گے یہ شرط کھلی ہوئی قمار کی ہے۔ اور ان خرابیوں کی وجہ سے یہ معاملہ (زندگی بیمہ کا) ناجائز و نادرست ہے۔ البتہ اگر بقائے ملازمت کی خاطر قانون حکومت سے مجبور ہو کر بیمہ زندگی کرانا پڑجائے یا کسی خطہ کے ملکی حالات ایسے خراب و خطرناک ہوجائیں کہ بغیر بیمہ کے جان و مال وغیرہ کا تحفظ مشکل ہوجائے تو بات دوسری ہوگی اور ان مجبوریوں میں بوجہ مجبوری اس بیمہ کی اجازت ہوگی۔ البتہ اس بیمہ میں جمع کی ہوئی اپنی رقم سے زائد جو رقم ہے اس کو مسلم غرباء و مساکین کو دیدینا ضروری رہے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دارالعلوم دیوبند

$\frac{9}{91}$ ۴ھ

بنک کے ذریعہ تجارت

سوال (۱۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کچھ زمانہ پہلے معدودے چند ہی تاجر جو برطانیہ وغیرہ بیرون ہند سے بڑا بڑا کاروبار کرتے تھے بنک کے واسطہ سے لین دین کرتے تھے، پھر یہ طریقہ بڑھ کر اندرون ملک بھی بڑے بڑے کاروبار بنک کے واسطہ سے ہونے لگے۔ لیکن اب تو یہ حال ہے کہ چھوٹی چھوٹی تجارت میں بھی مال وقیمت دونوں کی درآمد برآمد خواہ اندرون ملک ہی کیوں نہ ہو جہاں ڈاکخانہ کا واسطہ بلٹی وقیمت بھیجنے میں ہوا، محض بنک کے ذریعہ و واسطہ سے ہونے لگی، اور بنک اکثر اصل قیمت سے زیادہ کچھ رقم مختلف طور سے سود کے نام سے وصول کرتا ہے، اگر کوئی شخص نقد کاروبار کرنا چاہے اور مال کی بلٹی وقیمت کی محض ڈاکخانہ کے ذریعہ سے بغیر توسط بنک کے درآمد برآمد کرنا چاہے تو سخت دشواریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، گویا آزاد کاروبار کرنا ناممکن سا ہو رہا ہے۔

لہذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ جو رقم بنک سود کے نام سے لیتا ہے۔ وہ شرعاً سود ہے یا نہیں، اگر ہے تو اس سے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب :- بنک کے ذریعہ کاروبار کی مختلف و متعدد صورتیں ہوتی ہیں اور اس کے احکام بھی مختلف ہیں۔

(۱) ـــــ مالک مال ازخود بنک کا واسطہ اختیار کرتا ہے، خریدار اس کو پسند نہیں کرتا مگر وہ بلٹی بنک کے واسطہ سے خریدار کے پاس بھیجتا ہے، اس میں مالک مال کو کئی فائدے ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ بنک سے قیمت فوراً نقد یا کم از کم مدت میں اور بہت آسانی سے وصول ہو جاتی ہے، دوسرے مال کے ضائع ہونے یا فریب دھوکہ کھانے یا ادر معاملہ میں پڑکر قیمت ڈوب جانے وغیرہ کے احتمالات بہت کم ہو جاتے ہیں

(۲) ـــــ کبھی مالک مال ازخود نہیں بلکہ قانون وقت کے تقاضے سے مجبور ہو کر بنک کا واسطہ اختیار کرتا ہے اور پھر بقیہ کل وہی کرتا ہے جو نمبر (۱) میں گذرا، اور خریدار

اگرچہ اس کو پسند نہیں کرتا مگر انکار بھی نہیں کرتا۔

(۳) کبھی حکومت خود دخیل ہو کر بائع و مشتری کے درمیان بنک کو قانوناً واسطہ بنا دیتی ہے، اور بنک کے ذریعہ سے خرید و فروخت کراتی ہے، یہ دونوں صورتیں پہلی صورت کے اعتبار سے کم ہوتی ہیں۔

(۴) کبھی بنک خود پیشکش کر کے یہ طریقۂ کار جو نمبر ایک میں گذرا مالک مال سے اختیار کرا لیتا ہے کیونکہ اس طریقۂ کار میں بنک کو بھی فائدہ پہنچتا ہے، بنک کی آمدنی بڑھتی ہے۔ یہ صورت پہلی تینوں صورتوں سے کم ہوتی ہے۔

(۵) —— کبھی یہ طریقہ کار (بذریعہ بنک کاروبار) خود خریدار بھی اختیار کرتا ہے، مگر صرف ان صورتوں میں جب خریدار کے پاس اتنا سرمایہ نہیں رہتا کہ ہمیشہ نقد ہی قیمت ادا کر سکے۔ یا کوئی اور مجبوری قانونی ہوتی ہے یا راستہ وغیرہ کے خطرہ سے حفاظت مقصود ہوتی ہے۔

(۶) —— انہی مواقع میں کبھی بنک خود بھی پیش کش کر کے خریدار سے براہ راست یہ طریقۂ کار اختیار کرا لیتا ہے، یہ اخیر کی دونوں صورتیں بہ نسبت پہلی چار صورتوں کے اور بھی بہت کم ہوتی ہیں اس لئے کہ اس میں خریدار کو اگرچہ کچھ فائدے بھی ہوتے ہیں مگر اس پر کچھ خرچ کا بار زائد ہو جاتا ہے۔ نیز کچھ ذمہ داریاں اور پریشانیاں بھی سوار ہو جاتی ہیں۔ ان چھ صورتوں میں سے پہلی چار صورتوں میں بنک سے خریدار کے قرض لینے یا بنک کو قرض پر نفع دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان صورتوں میں خریدار بنک سے قرض کا کوئی معاملہ ہی نہیں کرتا، بلکہ مالک خود یا حکومت یا خود دونوں براہ راست بنک سے اپنا معاملہ کر کے اس کو اپنا وکیل یا اجیر بناتے ہیں یا بنک خود دخیل ہو کر بجائے خریدار کے مالک مال سے اپنا معاملہ کر لیتا ہے اور اس کی ہدایات کے مطابق خود جو معاملہ چاہتا ہے کرتا ہے اس میں خریدار بنک سے

کہنے نہیں جاتا کہ میری طرف سے اتنا قرضہ دیدو، بلکہ یہ صورت قریب قریب ویسی ہی جیسی صورت اصل پرائیویڈ یٹ فنڈ میں ہوتی ہے کہ محکمہ خود جو معاملہ چاہتا ہے اپنے ملازم کے ساتھ کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ملازم کی تنخواہ سے وضع کردہ روپیوں کے مثل خود اضافہ کرتا ہے یا مثلاً خود ہی نام نہاد جمع شدہ فنڈ پر سود یا سود در سود وغیرہ کے نام سے کچھ رقم بڑھاتا رہتا ہے لیکن کوئی اس کو سود نہیں کہتا۔ پس جس طرح وہاں سود کا تحقق نہیں ہوتا یہاں بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ سود کا تحقق عقود معاوضہ میں ہوتا ہے اور یہاں سرے سے خریدار کا بنک سے کوئی عقد ہی نہیں ہوتا اور یہ ظاہر ہے۔

اور پانچویں و چھٹی صورت میں (جب خریدار خود بنک کا واسطہ اختیار کرے یا بنک خود براہ راست خریدار سے معاملہ کرے) بھی صورتیں مختلف ہوتی رہتی ہیں۔ (یہاں الف، ب، ج، د) کے عنوان سے چھ صورتیں لکھی جاتی ہیں۔

(الف) خریدار کا نقد سرمایہ بنک میں داخل و موجود ہے اور بنک خود مالک مال کو قیمت جمع کردیتا ہے تو اس کو بھی خریدار کا قرض لینا نہیں کہیں گے بلکہ اسی جمع شدہ سرمایہ سے ادا کرنا یا جمع کرنا محسوس کریں گے۔ اور بنک کو اس کا اجیر یا وکیل کہیں گے اور جو پیسے بنک خریدار سے مزید وصول کرے گا اس کو اس کے عمل کی اجرت قرار دیں گے۔

(ب) خریدار کا کچھ سرمایہ تو بنک میں جمع نہیں ہے لیکن بنک از خود ادائیگی ثمن کی مقررہ مدت سے قبل ہی مالک مال کو قیمت ادا کردے تو بھی خریدار کا قرض لینا نہ کہیں گے، اور پھر بنک خریدار سے جو رقم اصل قیمت سے زائد لے گا، اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا اور یہ ظاہر ہے۔

(ج) ادائیگی ثمن کی مقررہ تاریخ ختم ہونے کے بعد اگر بنک از خود قیمت جمع کردے لیکن خریدار سے کوئی معاملہ نہ کرے جب بھی قرض لینا صادق نہ آئے گا۔ اور اس پر

بنک جو رقم اصل ثمن سے زائد لے گا، اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا۔

(د) اسی طرح اگر خریدار کا کچھ سرمایہ بنک میں جمع نہ ہو لیکن بنک مال کو اپنے قبضہ و نگرانی میں لے کر قیمت مال کو جمع کر دے۔ پھر جب خریدار قیمت ادا کرے اس کے بعد مال پر قبضہ کرنے دے تو اس صورت میں بھی قرض لینے کا معاملہ خریدار سے نہ ہوگا۔ اور جو پیسے بنک لے گا وہ بجائے سود کے اجرت عمل شمار ہوگی۔

(ہ) ان تمام صورتوں میں خواہ پہلی نمبر وار چھ صورتیں ہوں یا یہ الف، یا وغیرہ پانچ صورتیں ہوں سب میں اگر بنک اپنے پاس سے قیمت مال ادا نہ کرے بلکہ خریدار جس جس طرح قیمت ادا کرتا جائے باقساط یا قسط واحد بنک وصول کر کے محض وہ قیمت مالک مال کو دیتا جائے تو اس صورت میں بھی جو پیسہ خریدار سے یا مالک مال سے بنک طے کر کے خود لے گا، وہ سود نہ ہوگا بلکہ وہ اس کی اجرت و حق المحنت ہوگی، اور یہ دینا لینا جائز رہے گا۔

(و) البتہ اگر خریدار بنک سے واقعی قرض لے کر خود مالک مال کو قیمت ادا کرے یا بنک سے قرض لینے کا معاملہ کرے مثلاً اس طرح معاملہ کرے تم مالک مال (بائع) کو میری طرف سے قیمت ادا کر دیا کرو، میں بعد میں تم کو ادا کر دیا کروں گا، تو بیشک یہ دونوں معاملے قرض کے ہوں گے، پہلا خالص قرض کا اور دوسرا قرض اور وکالت دونوں کا ہوگا اور ان دونوں صورتوں میں بنک اپنے دیئے ہوئے روپیہ سے زائد رقم جو خریدار سے وصول کرے گا وہ بلاشبہ سود ہوگی، اور اس صورت میں بیشک سود دینے کا ارتکاب خریدار سے ہوگا، جس کی اجازت بغیر شدید حاجت کے نہ ہوگی، مثلاً بغیر قرض لئے کام نہ چلتا ہو اور بنک کے علاوہ کہیں اور سے قرض نہ ملتا ہو یا ملتا ہو مگر باعتبار بنک کے سود زیادہ دینا پڑتا ہو، یا مثلاً کوئی قانونی مجبوری ایسی ہو جائے کہ بغیر توسط بنک کاروبار نہ ہو سکے۔

الاشباہ والنظائر ص۱۱ میں ہے "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" اور

اسی طرح اس کی شرح حموی میں ہے۔

تنبیہ:۔ یہ حوادث الفتاویٰ کے قسم کی چیز ہے، اس لئے اور علماء فحول بھی اس پر غور فرما کر اس کے صحت وسقم پر اپنی رائے ظاہر فرما کر مستفید فرمائیں ۔ ۱۲

سوال (۱۲) | ہندی رسم الخط میں قرآن کریم کی اشاعت | کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ کسی شخص نے قرآن مجید کو ہندی رسم الخط میں اس طرح لکھا کہ لکھنے اور پڑھنے میں عربی الفاظ وکلمہ دونوں میں کمی اور اضافہ ہو کر پورا قرآن مجید عربی مسخ ہو جاتا ہے اور غلط تلفظ کی وجہ سے عربی زبان تو الگ مسخ ہوتی ہے اور معنی کی غلطی سے کفر تک کا خطرہ ہو جاتا ہے، مثلاً قرآن عربی ہے، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ایک آیت ہے، اس آیت کو ہندی رسم الخط میں یوں لکھا گیا ہے (ہندی خط میں تحریر تھی) اگر ہندی تحریر کو عربی میں لکھے تو یوں آیت ہوگی (بسم ل للّٰہ ررحمان ررحیماہ) جو تحریراً بھی غلط، قرأۃً بھی غلط ہے اور عربی بسم اللہ میں اللہ کا الف اور الرحمٰن کا ال اور الرحیم کا ال کم ہے، اس طرح ہندی بسم اللہ میں پانچ حرف کم کئے گئے اور الرحمٰن کی (ر) اور الرحیم کی (ر) زیادہ اور دوبارہ لکھی گئی ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ دو (ر) زیادہ اور اضافہ ہے، گویا ایک آیتِ مذکورہ میں سات غلطیاں ہیں، پورے قرآن شریف میں تو ہزاروں حروف کی کمی اور اضافہ ہے۔ اس طرح پورا قرآن مجید عربی میں ترمیم وتنسیخ کر کے مسلّم قرآن مسخ کیا گیا ہے۔ اور اس کو ہندی قرآن کا نام دیا گیا ہے، کیا ایسی صورت میں اس ہندی قرآن کا لکھنا اور پڑھنا جائز ہے یا ناجائز ہے، اور لکھنے والا ماسخ قرآن ہے یا نہیں، اور یہ حرکت تمسخر قرآن میں داخل ہے یا نہیں، اور لکھنے والے کو اور پڑھنے والے کو مومن اور مسلمان کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

(نوٹ) اس کی تحسین وتعریف کرنے والے کو شرعاً کیا کہا جائے گا۔

الجواب:۔ قرآن کریم نام ہے اور عَلَم ہے خاص اس کلام الٰہی کا جو عربی

زبان میں بذریعہ جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر منجانب خدا نازل کیا گیا ہے اور تلاوت کیا گیا ہے، اور اس کے تمام کلمات وحروف وزیر، زیر، مدولین، جزم وتشدید وغیرہ سب ہی چیزیں متعین ومعلوم ہیں، اس کا رسم الخط بھی علیحدہ ومتعین ہے، ایک خاص انداز سے مکتوب ہے، اس کا نطق وتکلم بھی نرالی شان رکھتا ہے، اور ان تمام کیفیات وخصوصیات کے ساتھ لوح محفوظ میں موجود ومحفوظ ہے، اور اس کے تمام احکام الگ اور ممتاز ہیں، اس کو کسی شخص کا بغیر طہارت چھونا بھی جائز نہیں ہے، چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ربانی ہے۔

الٓر تلک اٰیات الکتٰب المبین ○ انا انزلناہ قرءانا عربیا لعلکم تعقلون ○ (پ۱۲، سورہ یوسف)

یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی، ہم نے اس کو اتارا ہے عربی زبان کا قرآن (بناکر) تاکہ تم لوگ اچھی طرح سمجھو۔ (بیان القرآن)

اور ایک مقام پر اس طرح مذکور ہے۔

انہ لقرءان کریم فی کتاب مکنون لا یمسہ الا المطھرون ○ تنزیل من رب العالمین۔ (سورۂ واقعہ پ۲۷)

یہ ایک مکرم قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب یعنی لوح محفوظ میں درج ہے کہ اس کو بجز پاک فرشتوں کے کوئی ہاتھ نہیں لگانے پاتا۔ (بیان القرآن)

اور ایک جگہ اس طرح ارشاد ہے۔

بل ھو قرءان مجید فی لوح محفوظ (سورہ بروج پ۳۰)

بلکہ وہ ایک باعظمت قرآن ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ (بیان القرآن)

(اور تفسیر روح المعانی ص۱۷ ج۱) میں قرآن کریم کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں۔

والقرءان کلام اللہ تعالیٰ المنزل

قرآن پاک (نام ہے) اللہ تعالیٰ کے اس

بهذا المعنى فهو كلمات غيبية	کلام کا جو اپنے معنی کے ساتھ نازل کیا گیا ہے
مجردة عن المواد مترتبة	پس وہ (مجموعہ ہے) ان کلمات غیبیہ کا جو مادہ
في علم الله تعالى ازلا	سے مجرد ہیں (اور) اللہ تعالیٰ کے علم میں مترتب
غير متعاقبة تحقيقا	ہیں ازلی ہیں اور حقیقت کے اعتبار سے
بل تقديرا عند تلاوته	ترتیب وار نہیں ہیں بلکہ زبانوں پر تلاوت کے
على الالسنة الكونية	وقت تقدیری ترتیب سے مترتب ہیں جو ترتیب
الزمانية (الى قوله) ومن	زمانی وجود کی متقاضی ہے، اور یہیں سے
هنا قال السنيون	اہل السنت والجماعت نے فرمایا ہے کہ
القرآن كلام الله تعالى غير مخلوق	قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام غیر مخلوق ہے۔
مكتوب في المصاحف محفوظ	مصاحف میں مکتوب ہے، لوگوں کے سینوں
في الصدور مقروء بالالسن	میں محفوظ ہے، زبانوں پر پڑھا جاتا ہے۔
مسموع بالآذان غير حال في شئ	کانوں سے سنا جاتا ہے، ان میں سے کسی میں
منها وهو في جميع هذه المراتب	حلول کردہ نہیں ہے۔ اور یہ قرآن پاک ان
قرآن حقيقة شرعية معلوم من الدين	تمام مراتب میں حقیقت شرعی کے اعتبار سے
بالضرورة هكذا في عامة	قرآن ہے، ضروریات دین میں شمار ہے اور
تفسير المحققين اه	اسی طرح عام محققین کی تفسیر میں مذکور ہے۔

ان آیات کریمہ وعبارات سے نیز دوسرے مفسرین محققین کے کلام وروایات اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں (قرآن پاک کے کلمات وحروف زیر وزبر وغیرہ) امور توقیفی ہیں، ان میں ایک زیر یا زبر بلکہ ایک نقطہ کی بھی کمی یا بیشی جائز نہیں ہے۔

اور ان قرأتوں کے علاوہ جو رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے منقول ہیں کسی نوع کا

تغیر و تبدل جائز نہیں ہے، اگرچہ عربی زبان اور عربی عبارت باقی رہے پھر ایسی تبدیل و تغیر جس میں عربی زبان یا عربی رسم الخط وغیرہ تک متغیر و متبدل ہو جائے، کب اور کیونکر درست و مباح ہو سکتا ہے۔

وفی الاتقان للسیوطی لم یجوز احد من الائمۃ الاربعۃ کتابۃ القرآن بغیر العربیۃ۔	سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی نے بھی غیر عربی میں قرآن پاک کی کتابت کو جائز نہیں قرار دیا ہے۔

پس سوال میں جو جو خرابیاں لکھی ہوئی ہیں ان کے ساتھ تو لکھنا یا پڑھنا یا اس کو قرآن کریم کہنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ سخت گناہ اور قطعی حرام ہے۔ اور بڑی خطرناک قسم کی جرأت ہے۔ اگر دیدہ و دانستہ کوئی شخص اس طرح لکھے یا پڑھے تو اس کے محرف قرآن و ماسخ قرآن کریم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اسی طرح اس کو جائز سمجھنا یا اس کی اعانت کرنا بھی شدید جرم و حرام ہے۔

مذکورہ طریقہ پر ہندی رسم الخط یا انگریزی یا بنگلہ یا برمی یا چینی غرض کسی بھی دوسری زبان کے رسم الخط میں قرآن کریم کو لکھنا جس میں قرآنی رسم الخط و تلفظ و ادا کی خصوصیات محفوظ نہ رہیں، اور پھر اس کو اس زبان کی طرف منسوب کر کے ہندی قرآن یا انگریزی قرآن یا بنگلہ یا برمی یا چینی قرآن کہنا قرآن کریم و کلام الٰہی کی توہین و تحقیر ہے اور تحریف کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔

مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس قسم کی خرابیوں کی روک تھام کریں اور اس کے اصلاح کرنے کی ہر مناسب تدبیر اختیار کریں اور پوری کوشش کریں۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ عربی رسم الخط سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ناظرہ بھی نہ پڑھ سکتے ہوں اور وہ تلاوت کلام الٰہی کرنا چاہتے ہوں، ان کی تعلیم و تلقین کے لئے مصحف پاک کی ترتیب کے مطابق داہنی طرف سے کتابت شروع کی جائے اور پہلے

قرآن کریم سرخوص دسر صفحہ نمایاں کرکے اس طرح لکھا جائے کہ اس کا اصل ہونا اور اس کی متبوعیت وعظمت اور اس کا پورا ادب واحترام محفوظ وملحوظ رہے اور اس کے نیچے تابع بنا کر کسی بھی زبان کے رسم الخط میں اتنی ہی عبارت قرآن کریم کی اس طرح پر لکھی جائے کہ قرآن کریم کے تمام خصوصی حروف مثلاً س۔ص۔ ث اور ز۔ذ۔ظ،ض اور ہمزہ ء وغیرہ اور اس کے تمام فروق وامتیازات، نیز تمام خصوصیاتِ کتابت واداء وغیرہ مثلاً حروف زوائد (الف لام)، اور مدوجزم، تشدید واسکان وغیرہ کی پوری پوری رعایت موجود وملحوظ رہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ یہ صورت اس وقت ممکن ہوگی جب پہلے ان تمام خصوصیات کے لئے جامع مانع اصطلاحات وضع کرکے اس زبان کو مکمل کرلیا جائے پھر لکھا جائے ورنہ بغیر اس کے کوئی صورت جواز واباحت کی نہ ہوگی۔

اور ان باتوں کے باوجود ایک بات اور پھر بھی ضروری اور لازمی رہے گی کہ اس عبارت کو قرآن کریم کا نام یا ہندی رسم الخط میں قرآن کا نام یا انگریزی یا بنگلہ وغیرہ کسی بھی رسم الخط میں قرآن کا نام ہرگز نہ دیا جائے۔

بلکہ اصل قرآن کریم سے امتیاز اور تعارف کی غرض سے اور خلط وتلبیس وتحریف سے حفاظت کی غرض سے سرخی میں فقط یہ لکھا اور کہا جائے مثلاً ہندی رسم الخط میں یا انگریزی یا بنگلہ وغیرہ رسم الخط میں قرآن کریم کی تعلیم کا ذریعہ یا مثلاً ہندی رسم الخط میں یا فلاں رسم الخط میں قرآن کریم کا تعارف۔

صرف قرآن کریم کا اس کو ہرگز نام نہ دیا جائے۔ اگر ذرا بھی کسی عمل یا فعل سے قرآن کریم سے التباس ہوگا تو پھر اباحت وجواز کی کوئی صورت نہ رہے گی۔ ان تمام بندشوں اور احتیاطوں کے ساتھ اس زیر متن عبارت کی حیثیت وہی ہو جاوے گی جو قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کی ہوتی ہے، جو عربی زبان یا غیر عربی زبان میں متن قرآن

کریم کے ساتھ تابع بنا کر لکھ دی جاتی ہیں، اور اس کو قرآن کا نام نہ دیتے ہوئے صرف ترجمہ قرآن کریم یا تفسیر قرآن کریم کے نام سے موسوم کرتے ہیں ھذا ما عندی فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ:۔ الاحقر نظام الدین عفی عنہ
مفتی دار العلوم دیوبند ۱۰/۷/۹۰ھ

الجواب صحیح محمود غفرلہ الجواب صحیح سید احمد علی سعید

مغربی ممالک میں رمضان واوقات نماز کا مسئلہ

سوال (۱۳) مغربی ممالک خصوصاً برطانیہ میں بڑھتی ہوئی مسلم آبادی کی بدولت اوقات نماز کا مسئلہ علماء کرام اور مفتیان عظام کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مفتیان عظام اس مسئلہ پر غور وخوض کے بعد یہاں بسنے والوں کے لئے دین فطرت کے صحیح وآسان اسلامی حل کے ذریعہ مسلمانوں کے لئے موقعہ عمل فراہم فرما کر عنداللہ ماجور ہوں گے۔

محکمۂ موسمیات اور ہیئت دانوں نے اپنی تحقیق کے مطابق شفق کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) سول شفق ۶ درجہ والی شفق

(۲) بحری شفق ۱۲ درجہ والی شفق

(۳) شفق سیت ۱۸ درجہ والی شفق

تفصیل:۔ سول شفق کو شفق احمر سے تعبیر کر سکتے ہیں، اس وقت آسمان صاف ہوتا ہے، رات کے آثار کم ہوتے ہیں، چند موٹے موٹے تارے دکھائی دیتے ہیں۔

شفق بحری، اس شفق کو شفق ابیض سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

شفق سیت، یہ وہ شفق ہے جس کے بعد آسمان پر مکمل تاریکی چھا جاتی ہے،

اور چھوٹے چھوٹے تارے بھی دکھائی دیتے ہیں، ماہرین فلکیات اس شفق کے بعد اپنے فنی تجربوں میں لگ جاتے ہیں ۔

شفق کی تفصیل کے بعد اسلامی ممالک نیز ہندو پاک کرۂ ارض پر "اندروں" ۴۸ عرض البلد پر واقع ہونے کی بنا پر وہاں شفق کے غروب میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹہ ہوتا ہے، اس لیئے ان ممالک میں عموماً نماز عشاء بعد غروب ڈیڑھ گھنٹہ کے سال بھر ہوتی ہے، مگر برطانیہ اور وہ ممالک جو ۴۵ عرض البلد سے اوپر واقع ہیں وہاں جوں جوں اوپر جانا ہوگا غروب شفق دیر سے ہوگی اور صبح صادق جلدی، اسی طرح موسم گرما کے بعض مہینوں اور دنوں میں تو غروب شفق اور ابتداء صبح صادق میں بالکل فصل نہیں ہوتا، اور بعض دنوں میں بہت ہی کم فاصلہ رہتا ہے جو امید ہے کہ حسب ذیل مثال سے واضح ہو جائے گا ۔

۵۴ عرض البلد (انگلستان کے جس علاقہ) میں ہم رہتے ہیں ۔ ۲۰ جون کو طلوع آفتاب اور غروب حسب ذیل ہے ۔

	منٹ	گھنٹہ		منٹ	گھنٹہ
طلوع آفتاب	۳۵	۴	غروب شفق بحری	۱۹	۱۲
غروب آفتاب	۴۱	۹	صبح صادق	۵۸	۱
دن کی مقدار	۶	۱۷	درمیانی فاصلہ	۳۸	۱

۵۶ عرض البلد (گلاسگو اور اطراف) پر ۲۰ جون سے ۱۲ جولائی تک شفق بحری غائب ہی نہیں ہوتی ۔

۵۸ - ۶۰ } عرض البلد (بالائی اسکاٹ لینڈ اور اسٹورناوے) ۲۱ مئی سے ۲۵ جولائی تک شفق مذکور غائب نہیں ہوتی ۔ ان دنوں ساری رات افق پر اجالا رہتا ہے مذکورہ حساب کی بناء پر جن مقامات پر یعنی ۵۴ عرض البلد پر جہاں ۱۲ بجکر ۱۹ منٹ

کو شفق غائب ہوتی ہے اور ۴ بجکر ۳ منٹ کو طلوع ہوتا۔ ہم بارہ بجکر ۳۰ منٹ سے قبل نماز عشاء نہیں پڑھ سکتے اور دوسری طرف فجر کی نماز ۴ بجے، درمیانی فاصلہ صرف ساڑھے تین گھنٹہ رہتا ہے نماز عشاء کا یوں مؤخر کر کے ادا کرنا ناممکن نہ سہی مگر مشکل ضرور ہے نیز بعض ائمہ کے نزدیک جمع بین الصلوتین سفر اور اعذار کی بناء پر جائز ہے اور اس پر عرب ممالک کے باشندوں کا انگلستان میں عمل بھی ہے۔

الف:۔ تو کیا حنفی المسلک کے لئے اس میں آسانی کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی جو سارے عوام کے لئے قابل عمل ہو۔ تحقیق اوقات کا یہ مسئلہ صرف نمازوں کی حد تک نہیں، آئندہ چند سالوں کے بعد رمضان المبارک بھی انہی مہینوں میں آئے گا تو اس وقت اس مسئلہ کی اور بھی زیادہ نازک اور سنگین صورت ہوگی، مذکورہ حساب کی بناء پر روزہ تو لمبا ہو ہی جائے گا۔ بعض جگہوں پر تو ۱۸ بجکر ۱۱ منٹ پر طلوع و غروب آفتاب کا حساب ہوگا، اور جن جگہوں پر ۱ بجکر ۳۸ منٹ کا فاصلہ نماز عشاء اور فجر صادق کے درمیان رہتا ہے، ان کے لئے اس مختصر سے وقت میں نماز عشاء، تراویح، سحری وغیرہ کی ادائیگی ناممکن نہ سہی تو مشکل ترین ضرور ہو جاتی ہے۔ جس کا ادنیٰ احساس ہر ایک کر سکتا ہے۔

نیز جو علاقہ "۶۵" عرض البلد پر واقع ہیں، جہاں ۲۲ دن اور جو علاقہ ۵۸ اور ۶۰ عرض البلد پر واقع ہیں، جہاں ۶۵ دن (دو ماہ) تک شفق اور صبح صادق کے درمیان فاصلہ نہیں رہتا۔

ب:۔ روزہ کی ابتداء کب سے ہو۔ نیز نماز عشاء اور تراویح کا اختتام کب ہو، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یاد رہے مذکورہ ساری گذارشات عمل کے لئے پوچھی جا رہی ہیں، یہ وہ علاقہ ہے جہاں مسلمان کافی تعداد میں آباد ہیں۔ اور ان کی اچھی خاصی تعداد اس مسئلہ سے دوچار ہے۔ اس لئے ہم امید کرتے ہیں مفتیان عظام اس اہم مسئلہ پر

سنجیدگی سے غور فرما کر اس کے قابل عمل حل سے دور افتادہ کو نوازیں گے۔

سوال ۲:- برطانیہ میں مختلف مسلک کے لوگ آباد ہیں، کوئی شافعی ہیں تو کوئی حنفی تو کوئی اور مسلک کا، حنفی حضرات نماز عصر مثلین کے بعد پڑھتے ہیں، مثلین اور غروب آفتاب میں سردیوں کے موسم میں صرف گھنٹہ بھر کا فاصلہ رہتا ہے، اور گرمیوں میں ظہر اور عصر کے درمیان کافی فاصلہ رہتا ہے، جن شہروں غیر حنفی عوام ہوتے ہیں اور امام حنفی ہوتا ہے تو وہاں یہ مسئلہ اور بھی زیادہ قابل بحث بن جاتا ہے، امام کا اصرار مثلین پر ہوتا ہے اور عوام کا مثل اول پر، ان کے اصرار کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ یہاں کی اکثریت کارخانوں میں کام کرتی ہے۔ اور موسم گرما میں مثل اول پر نماز ادا کر کے کارخانہ کو جا سکتے ہیں، اور مثلین کے انتظار تک ان کا کارخانے کا وقت شروع ہو جاتا ہے، اور بعض کارخانوں میں نماز کی ادائیگی بہت مشکل ہوتی ہے۔

نیز کتب فقہ اصفرار شمس کے بعد نماز عصر کو مکروہ لکھا ہے۔ اب یہاں کے موسم میں مثلین کے تو کیا اس سے پہلے سورج میں زردی آجاتی ہے اور تمازت تو سارے دن نہیں ہوتی۔

(الف) تو کیا ان صورتوں میں نماز عصر کو حنفی المسلک بھی مثل اول میں ادا کرے تو نماز صحیح ہوگی یا نہیں۔ بینوا توجروا

سوال ۳:- برطانیہ کا موسم اتنا غبار آلود ہے کہ یہاں سارے سال میں شاذ و نادر ہی چاند کی رویت ہوتی ہے۔ جس میں ملک میں کئی کئی دنوں تک آفتاب غبار کی وجہ سے نظر نہ آتا ہو وہاں چاند کی رویت کا سوال کم ہی پیدا ہوتا ہے، جب رویت ہلال کا مسئلہ یوں ہے تو رمضان وعیدین کے تعیین کا مسئلہ بھی ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ سے کئی بار مراسلات کے بعد جناب والا کے آخری استفتاء کے مطابق آج تقریباً تین سال

سے عمل ہو رہا ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ رمضان کے تعیین کے بارے میں تو قریبی ممالک مراکش سے بذریعہ فون بات چیت ہونے پر ان کی خبر کے مطابق کیا جاتا ہے اور عید و رمضان کے لئے ملک میں ۲۹ ر رمضان کو چاند ثابت نہ ہو تو ۳۰ روزے مکمل کر کے عید منائی جاتی ہے اور عید الاضحیٰ کے لئے عموماً یہاں کے علماء یوں کرتے ہیں کہ ہند و پاک کے خطوط پر یکم ذی الحجہ متعین کر کے اسی حساب سے عید الاضحیٰ کا تعین بھی ہوتا ہے، مگر بادی النظر میں یہ کوئی مستقل حل نہیں معلوم ہوتا، اس لئے کہ جو صاحب فون کرتے ہیں اگر وہ لوگ ملک میں موجود نہ ہوں یا جن کے ساتھ مراکش فون سے بات کی جاتی ہے وہ نہ ہوں، ان دونوں صورتوں میں یہ بات پھر وہی پریشانی کا باعث ہوگی، نیز خطوط والا مسئلہ بھی کسی حد تک صحیح ہو تب بھی مستقل حل نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ خاص کر عرب ممالک کے طلبہ اس کو قبول نہیں کرتے ہوئے محکمہ موسمیات کے اعتبار سے تعیین رمضان و عیدین کرتے ہیں۔ تو کیا ان مجبوریوں کی صورت میں علامہ سبکیؒ کی تحقیق کے محکمہ موسمیات والوں کے حساب کے مطابق زمین سے قابل رویت نہ ہونے پر عیدین و رمضان کا تعین کیا جائے تو کیا اس کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

خدا کے فضل سے برطانیہ میں مسلمان ایک ڈیڑھ لاکھ آباد ہیں اور بڑی تعداد میں ان کے بچے بھی یہاں آباد ہیں، ملک بھر میں تقریباً ۶۰ سے ۷۰ تک مساجد قائم ہو گئی ہیں جن میں باقاعدہ نماز پنجگانہ، تراویح وغیرہ ہوتی ہے، اس لئے اس قسم کے مسائل لائق توجہ اور قابل غور ہیں۔ ہم حضرت والا سے صحیح شرعی آسان رہبری کے متوقع ہیں۔ فقط

الجواب:۔ یہ صحیح ہے کہ دین اسلام دین فطرت ہے، اور ایک کامل

دمکمل عالمگیر دبین الاقوامی مذہب ہے جو ہر انسان کو اپنے خالق و مالک سے صحیح طور پر رشتۂ عبودیت جوڑنے اور اس کو جاننے اور پہچاننے کے صحیح وسادہ فطری اصول وضوابط تعلیم کرتا ہے تاکہ ہر انسان خواہ کسی خطہ و ملک کا باشندہ ہو، خواہ دشت وصحرا کا ہو یا پہاڑ یا جنگل کا، یا سمندری علاقہ یا جزائر کا، خواہ قطبین پر بسنے والا ہو یا خط استوار پر، ان پڑھ ہو یا پڑھا لکھا، غریب ہو یا امیر، آقا و بادشاہ ہو یا غلام و مملوک مرد ہو یا عورت، خواہ کوئی بھی ہو، قید صرف یہ ہے کہ عاقل و بالغ ہو، عقل و ہوش رکھتا ہو، دیوانہ و پاگل نہ ہو، بچہ و ناسمجھ نہ ہو، اور ساتھ ساتھ بادیانت و منصف مزاج ہو، معاند و کینہ پرور نہ ہو۔ جو بھی اپنے معبود حقیقی کو پہچاننا چاہے اس سے اپنا صحیح رشتہ قائم کرنا چاہے تو نہایت آسانی سے ان سادہ اور فطری اصول کے ذریعہ قائم کر کے اس کے فیض قرب سے اپنے ظرف و ہمت کے مطابق مستفیض و منتفع ہو سکے اور یہی مقصد تخلیق آدم ہے اور اسی مقصد کی تحصیل و تکمیل کے لئے سلسلۂ بعثت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی۔ چنانچہ معبود حقیقی نے اپنے برحق کلام (قرآن پاک) میں مختلف عنوان و انداز سے متعدد جگہ اس طرف اشارہ بھی فرمایا ہے۔ مثلاً

(۱) الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا الآیۃ (پ ۶)	آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے (ہر طرح) کامل کر دیا اور اس سے میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر دیا۔
(۲) الدین عند اللہ الاسلام الآیۃ (پ ۱)	بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔
(۳) من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ الآیۃ (پ ۳)	جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا وہ اس سے قبول نہ ہوگا۔

(۴) قل هذه سبیلی ادعوا الی اللہ۔ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی وسبحن اللہ وما انا من المشرکین ۔ الآیۃ (پ۱۳ ع ۶)	آپ فرما دیجئے کہ یہ میرا طریق ہے۔ میں خدا کی طرف اس طرح بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھی بھی ۔ اور اللہ پاک ہے اور مشرکین میں سے نہیں ہوں ۔
(۵) وما ارسلنٰک الا کافۃ للناس بشیراً و نذیراً الآیۃ (پ۲ ع ۷)	اور ہم نے تو آپ کو تمام لوگوں کے واسطے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے ۔
(۶) یرید اللہ بکم الیسر و یرید بکم العسر الآیۃ (پ۲ ع ۷)	اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں ۔
(۷) لا یکلف اللہ نفساً الا وسعها الآیۃ (پ۳ ع ۸)	اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت میں ہو ۔
(۸) فاستقم کما امرت و من تاب معک ولا تطغوا انہ بما تعملون بصیر ۔ الآیۃ (پ۱۲ ع ۱۰)	تو آپ جس طرح کہ حکم ہوا ہے مستقیم رہیئے اور وہ لوگ بھی جو کفر سے توبہ کر کے آپ کے ہمراہی میں ہیں اور دائرہ (دین) سے ذرا مت نکلو، وہ ہم سب کے اعمال کو خوب دیکھتا ہے ۔
(۹) ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر الآیۃ (پ۲۷ ع ۸)	اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے، سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے ۔
(۱۰) یسئلونک عن الاھلۃ	آپ سے چاندوں کی حالت کی تحقیقات

قل ھی مواقیت للناس والحج الآیۃ (پ۲ ع ۱۸) — کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند اوٗ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے ۔

حالانکہ سائلین کا مقصد اس کے چھوٹے بڑے ہونے کی وجہ معلوم کرنا تھا جس کا تعلق علم ہیئت سے تھا، اور علم ہیئت جاننے والے عرب میں موجود بھی تھے جواب تحقیقی سمجھ بھی سکتے تھے مگر اس کے باوجود ان کا رخ اس سادگی کی طرف پھیر کر جواب دیا گیا، اسی طرح اگلے نمبر کی آیت کریمہ کا بھی حال ہے ۔

(۱۱) یسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا الآیۃ (پ۱۵ ع ۱۰) — یہ لوگ آپ سے روح کو پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے ۔

احادیث شریف میں بھی اس طرف جا بجا کہیں اشارہ کہیں تصریح موجود ہے، کسی موقع پر ارشاد ہے الدین الفطرۃ یعنی دین تو عین فطرت سلیمہ ہے یا مثلاً ۔

کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ اوکما قال ۔ — ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ (مربی) اس کو یہودی بنا دیتے ہیں، یا نصرانی بنا دیتے ہیں، یا مجوسی بنا دیتے ہیں ۔

کسی موقعہ پر فرمایا گیا ۔

نحن امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب اوکما قال — ہم امت امیہ ہیں، حساب کتاب پر مدار نہیں رکھتے ۔

حالانکہ اس وقت بھی اور خود عرب میں بھی حساب و کتاب جاننے والے بلکہ علم نجوم و ہیئت جاننے والے موجود تھے جیسا کہ تاریخ شاہد ہے پھر کسی موقعہ پر ارشاد ہے

صوموا الرویتہ وافطروا لرویتہ اوکما قال ع وغیر ذلک۔ — چاند دیکھ کر روزے رکھو، چاند دیکھ کر روزے ختم کردو، یعنی کسی قواعد ہندسیہ وریاضیہ وغیرہ کا احتیاج نہیں ۱۲

آیات کریمہ واحادیث نبویہ سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہ دین سادہ وفطری ہے، فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہے اس کا لقب ہی دین فطرت ہے، اس کے احکام واصول بھی سادہ وفطری ہوں گے۔ اس دین کی تحصیل یا اس کے احکام کی تعمیل فلسفیانہ موشگافیوں پر یا علم ہیئت یا اصول ریاضی کے جاننے وماننے پر موقوف نہ ہوگی۔

جناب نے بھی شروع استفتاء میں تھوڑا سا اشارہ فرمایا ہے۔ احقر بھی ان ہی سادے اور فطری اصول کے مطابق فقہ حنفی کی مدد سے کچھ عرض کرے گا، امید کہ باعث تسکین خاطر۔ نیز برائے عمل قابل قبول ہوگا۔

اب نمبروار ہر سوال کے جوابات مختصراً اگر اس طرح پر عرض ہیں کہ ہر سمجھ دار و منصف مزاج جو حق کا طالب ہو، اور اپنا عمل محض اللہ کی خوشنودی کے لئے مذہب کے مطابق رکھنا چاہتا ہو رکھ سکے۔

سوال ۱ کے جزو اول (الف) کا جواب

مذکورہ بالا گذارشات سے معلوم ہو چکا ہے کہ اس دین فطرت میں کسی حکم کا مدار ماہر موسمیات یا ماہر فلکیات کی تحقیقات وتدقیقات وغیرہ پر نہ ہوگا بلکہ سیدھے سادے اصول فطرت پر ہوگا۔ پس شفق کی اپنی طرف سے تین قسمیں کرنا یا اس کی تلاش وجستجو میں پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھنا یا ہوائی جہاز پر پرواز کرنا، یا سمندر کی سطح پر جاکر حقیقت معلوم کرنا مطلوب شرعی نہ ہوگا اور نہ اس پر مدار حکم ہوگا بلکہ اپنی سطح آبادی پر (جہاں کا بھی باشندہ ہو) رہتے ہوئے سادہ طور پر آلات رصدیہ وغیرہ

کا استعمال کئے بغیر صرف قرآن وحدیث وفقہ کی روشنی میں امتیاز شفق وتعیین اوقات کرلینا کافی ہوگا۔

قرآن پاک میں وقت عشاء کے لئے غسق اللیل (رات کی تاریکی) یا زلفا من اللیل (کچھ حصہ رات کا گذرکر) وارد ہے۔ مثلاً:-

(۱) اقم الصلوٰة لدلوک الشمس الی غسق اللیل الآیۃ (پ ۱۵ ع ۹) — آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کا اندھیرا ہونے تک نمازیں ادا کیا کیجئے

اور مثلاً

(۲) واقم الصلوٰة طرفی النہار وزلفا من اللیل الآیۃ (پ ۱۲ ع ۱۰) — اور آپ نماز کی پابندی رکھئے دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں۔

اسی طرح احادیث پاک میں بھی حدیث اوقات صلوٰة وارد ہے، مثلاً:-

ثم امرہ فاقام المغرب حین غابت الشمس ثم امرہ فاقام العشاء حین غاب الشفق۔ (مسلم شریف) — جس وقت آفتاب غروب ہوا آپ نے حکم دیا اور نماز مغرب ادا کی گئی پھر جس وقت شفق غائب ہوئی تو حکم فرمایا اور نماز عشاء ادا کی گئی۔ (مسلم شریف از حدیث طویل)

اسی طرح اور بہت سی روایات میں بھی شفق احمر وابیض کی تفصیل کے بغیر مطلقاً صرف لفظ شفق کا ذکر ہے، پھر شفق کی یہ دو قسمیں (احمر وابیض) یا اس کا یہ اختلاف کوئی اصولی وبنیادی اختلاف نہیں ہے بلکہ عرف اور زمانہ کے اعتبار سے محض محاورہ کی ترجمانی کا اختلاف ہے جو محض فروعی اور ضمنی ہے۔ نیز شفق احمر بھی مثل شفق ابیض کے حضرت امام ابو حنیفہؒ ہی کا (فی روایۃ) قول ہے، مگر شفق احمر

صاحبین کی جانب منسوب ہوکر مشہور ہوگیا اور بعض صرف امام ابو حنیفہؒ کیطرف منسوب رہا، صاحبین کی جانب منسوب ہوکر مشہور نہ ہوا۔ بلکہ بعض روایات فقہیہ میں احمریت کی جانب امام صاحبؒ کا رجوع بھی منقول ہے۔ کمافی الدر

وقت المغرب منه الى غروب الشفق وهو الحمرة عندهما وبه قالت الثلاثة واليه رجع الامام كما فى شروح المجمع وغيرها فكان هو المذهب۔ ۱۲ منه

مغرب کا وقت صاحبین کے نزدیک غروب شمس سے غروب شفق تک رہتا ہے اور یہی قول ائمہ ثلاثہ (امام مالک، شافعی احمد بن حنبل رحمہم اللہ) کا بھی ہے اور اسی جانب امام ابو حنیفہؒ نے بھی رجوع فرمالیا ہے جب کہ مجمع کی شروح وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے، پس یہی متفق علیہ مذہب ہوگیا (درمختار)۔

عند المحققین اگرچہ یہ رجوع ثابت و محقق نہیں، لیکن اتنا تو سب کو تسلیم ہے کہ تعامل تمام بلاد میں صاحبین کے ہی قول پر ہے، نیز یہ کہ صاحبین کا قول اوسع اور امام کا قول احوط ہے۔ کمافی الشامی ص ۳۳۵ ج ۱

ولكن تعامل الناس اليوم فى عامة البلاد على قولهما فقد ايده فى النهر تبعا للكفاية (الى قوله) وفى السراج قولهما اوسع وقوله احوط۔ ۱۲

آج کل تمام لوگوں کا تعامل عام شہروں میں صاحبین ہی کے قول پر ہے اسی تحقیق کی تائید کفایہ کی اتباع کرتے ہوئے النہر الفائق میں بھی منقول ہے (الی قولہ) اور سراج وہاج میں صاحبین کے قول کو اوسع اور امام کے قول کو احوط لکھا ہے۔

(شامی ص ۳۳۵ ج ۱)

چونکہ امام کا قول احوط ہے۔ نیز آیت کریمہ۔

ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابًا موقوتًا الآیۃ (پ۵ ع۱۲)	یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے۔

میں موقوتًا کی تفسیر مؤقتًا بھی ہے، اس کا بھی تقاضا یہ ہے کہ احتیاط کی جائے اور احتیاط یہی ہے کہ نماز عشاء شفق ابیض غائب ہونے کے بعد ادا کی جائے۔ تاکہ بہرطور اور بلا اختلاف نماز اپنے وقت متعین کے اندر ادا ہو، لیکن اس کے باوجود فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کسی مسجد کا امام عشاء کی نماز شفق ابیض غائب ہونے سے قبل ہی پڑھے تو جماعت کو چھوڑ کر غروب شفق ابیض کے بعد پڑھنا واجب نہیں ہے بلکہ صرف افضل ہے۔ کمافی الشامی ص ۳۳۳ ج ۱۔

وفی شرح المنیۃ انہ لوکان امام محلہ یصلی العشاء قبل غیاب الشفق الابیض فالافضل ان یصلی وحدہ بعد الغیاب۔ ۱۲	شرح منیہ میں منقول ہے کہ اگر اپنی مسجد محلہ کا امام عشاء کی نماز شفق ابیض کے غائب ہونے سے قبل ہی پڑھ لے تو ایسی صورت میں بہتر یہ ہے کہ اپنی نماز تنہا شفق ابیض کے غائب ہونے کے بعد پڑھے۔ (شامی ص ۳۳۳ ج ۱)

اس کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شفق ابیض کے غروب سے قبل ہی اس جماعت میں شریک ہو کر پڑھ لے تو بلا کراہت نماز ادا ہو جائے گی اور محل طعن و تشنیع نہ بنے گا۔

پس جب بغیر کسی مجبوری و عارض کے اس کی گنجائش ہے اور محل طعن نہیں ہے تو مذکورہ عوارض و مجبوری کی صورت میں بدرجہ اولیٰ مورد طعن یا مستوجب کراہت نہ ہوگا بلکہ ائمہ مساجد کو خود اس کا لحاظ کرنا انسب ہوگا تاکہ امت تنگی میں واقع نہ ہو، بخلاف حضر کے اندر جمع بین الصلوٰتین کے، کہ حقیقتًا جمع بین الصلوٰتین عرفات و مزدلفہ

کے سوا کسی اور جگہ و موقع میں نہیں ہے، حضر کے اندر جمہور امت کے نزدیک صحیح نہیں ہے کما بحثہ وحققہ صاحب بذل المجہود ص۲۳۳ ج۲ وصاحب اوجز المسالک حتی قال فی الاوجز ص۵۶ ج۲ -

قال الترمذی فی کتابہ اجمعت الامۃ علی ترک العمل بہ - ۱۲

امام ترمذی نے اپنی کتاب میں فیصلہ فرما دیا ہے کہ تمام امت نے جمع بین الصلوٰتین فی الحضر والی روایت کو عملاً متروک قرار دیدیا ہے ۱۲ (اوجز ص۵۶ ج۲)

اس لئے جمع بین الصلوٰتین کے پیش نظر کوئی عمل نہ کریں گے، بلکہ اگر غروب شفق وطلوع فجر کے درمیان کچھ وقت نہ ملے جب بھی تینوں نمازیں (مغرب عشاء فجر) بلا لحاظ جمع بین الصلوٰتین کے مستقلاً الگ الگ پڑھیں گے گو مسلسل ہی پڑھنا پڑے جیساکہ ہم خود بھی ذرا تفصیل سے اسکو بیان کر رہے ہیں تاکہ ہر صورت مسئلہ اچھی طرح واضح اور ذہن نشین ہو جائے اور اسی خیال سے ہر صورت بعنوان مستقل الگ الگ بیان کریں گے۔

مسئلہ ۱ :- جب تک شفق ابیض غروب ہونے کے بعد کھانے پینے سونے وغیرہ حوائج بشریہ ضروریہ پوری کرنے کے ساتھ ساتھ آسانی سے فرض عشاء و وتر اور رمضان میں تراویح بھی بیس رکعت خواہ الم ترکیف سے ہی پڑھ سکیں یا فقط بارہ رکعت یا فقط آٹھ رکعات ہی پڑھ سکیں تو شفق ابیض کے غروب کے بعد ہی پڑھیں گے۔

ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا پ۵ ع ۱۲- اور حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ الآیۃ پ۲ ع ۱۵

یعنی تمام نمازیں مسلمانوں پر موقت طریقہ سے فرض کی گئی ہیں۔ اور تمام نمازوں کی اور خاص کر وسطیٰ (عصر) کی محافظت کیا کرو یعنی ان کو ان کے اوقات میں (جب تک

ای ادوا الصلوٰۃ فی اوقاتہا۔ وقت مل سکے، ادا کیا کرو۔

کے پیش نظر شفق ابیض کے غروب ہونے کے بعد ہی ادا کیا جائے۔

مسئلہ ۲:- جن مقامات میں اتنا وقت نہ ملتا ہو جو ابھی مذکور ہوا ہے، خواہ شفق ابیض باقی رہتے ہوئے ہی طلوع فجر ہو جاتی ہو جیسا کہ گلاسکو، بالائی اسکاٹ لینڈ وغیرہ اور اس کے اطراف میں بعض دنوں میں ہوتا ہے یا اتنا وقت تو ملتا ہو لیکن رات چھوٹی ہوتی ہو اور شفق ابیض دیر میں ختم ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ساری رات شب بیداری کرنی پڑتی ہو جو عادتاً وعموماً تحمل بشری سے خارج ہے جیسا کہ ان ہی مقامات کے اندر دوسرے دنوں میں ہوتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں شفق احمر ہی کے بعد نماز عشاء کی ادائیگی کر لینی عملاً علیٰ روایۃ صحیح و درست ہوگی اور صبح صادق کے طلوع ہونے سے قبل فرض عشاء و وتر سب ختم کر لینا ضروری ہوگا

مسئلہ ۳:- جن مقامات میں اتنا بھی وقت نہ ملتا ہو بلکہ شفق احمر غروب ہوتے ہی یا اس سے بھی قبل فجر کی سفیدی شروع ہو جاتی ہو جیسے ۶۰ عرض البلد کے بعد کے بعض مقامات میں ہو سکتا ہے، تو وہاں بھی اگرچہ وقت عشاء کسی قول پر نہ ملتا ہو لیکن تینوں نمازیں (مغرب، عشاء، فجر) یکے بعد دیگرے بغیر لحاظ جمع بین الصلوتین ادا کرتے رہیں گے اور جہاں تک ہو سکے گا صبح صادق کے طلوع سے قبل قبل فرض عشاء و وتر سے فراغت کی کوشش کرتے رہیں گے۔

کما حققہ الامام الہمام ابن الہمام فی فتح القدیر ج ۱ ص ۱۵۶۔

(فی باب مواقیت الصلوٰۃ بقولہ) ومن لا یوجد عندھم وقت العشاء کما قیل یطلع الفجر قبل غیبوبۃ الشفق

(باب مواقیت الصلوٰۃ) جن لوگوں کے وہاں نماز عشاء کا وقت نہیں ملتا مثلاً ان کے وہاں شفق غائب ہونے سے قبل ہی فجر طلوع ہو جاتی ہے (سلسلۂ تحقیق جاری رکھتے ہوئے فرمایا) اور امام

عندھم (الی قولہ) وافتی الامام البرھان الکبیر بوجوبھا ولا یرتاب متامل فی ثبوت الفرق بین عدم محل الفرض وبین سببہ الجعلی الذی جعل علامۃ علی الوجوب الخفی الثابت فی نفس الامر وجواز تعدد المعرفات للشئ فانتفاء الوقت انتفاء المعرف وانتفاء المعرف علی شئ لا یستلزم انتفاء ذلک الشئ لجواز وجود دلیل اٰخر وقد وجد وھو ما تواطأت اخبار الاسراء من فرض اللہ تعالیٰ الصلوٰۃ خمسا بعد ما امر اولا خمسین ثم استقر الامر علی الخمس شرعا

ربانی الکبیر نے ان لوگوں پر نماز عشاء کے وجوب کا فتویٰ دیا ہے (اور اس قول کو ترجیح دیتے ہوئے فرمایا کہ) اور کوئی حقیقت بیں شخص عدم محلیت فرض (جیساکہ مقطوع الیدین میں ہوتا ہے) اور عدم سببیت جعلیہ (جیسا فاقد وقت عشاء میں ہوتا ہے) کے درمیان فرق سمجھنے میں شبہ نہ کرے گا۔ اور وجوب خفی جو نفس الامر میں ثابت شدہ ہوتا ہے اس پر یہ سبب جعلی (وقت صلوٰۃ) محض جوف وعلامت ہوتا (جس کا درجہ ذریعہ شناخت وقت سے زیادہ نہیں ہوسکتا) اور ذرائع شناخت ومعرفات و علامات کے تعدد (وتغیر وتبدل) کے امکان وجواز میں بھی کوئی شخص شبہ نہیں کرسکتا پس ظاہر ہوگیا کہ وقت ظاہری جو محض معرف وعلامہ کے درجہ میں تھا اس کا انتفاء محض معرف وعلامت کا انتفاء ہے، اور معرف شئی کا انتفاء بعینہٖ اس شئی کے انتفاء کو مستلزم نہیں، کسی دوسری دلیل یا معرف کے وجود کے ممکن ہونے کی وجہ سے اور (بالخصوص جب حال یہ ہو کہ) دوسری دلیل ومعرف کا وجود موجود ملتا بھی ہو اور وہ حدیث معراج واسراء کا تواتر وتواطأ ہے کہ اللہ جل شانہ نے اولاً پچاس نمازیں فرض فرمائی تھیں پھر امت پر آسانی کے لئے معرف

عاماً لاهل الآفاق
لا تفصيل فيه من
اهل قطر وقطر (ثم
الى قوله) فاستفدنا
ان الواجب فى نفس الامر
خمس على العموم غير
ان توزيعها على تلك
الاوقات عند
وجودها ولا تسقط
بعدها الوجوب
وكذا قال
صلى الله عليه وسلم
خمس صلوات كتبهن
الله على العباد - ثم
هل ينوى القضاء
الصحيح انه لا ينوى
القضاء لفقد وقت
الاداء ومن افتى
بوجوب العشاء يجب على
قوله الوتر -

پانچ نمازیں برقرار رکھیں اور پھر ان پانچ نمازوں کا استقرار زمین کے ہر خط والوں کے لئے یکساں شروع ہوا۔ اس مشروعیت عامہ میں کوئی تفصیل نہیں کہ یہ فرضیت صرف فلاں خط والوں کے لئے ہے اور فلاں خط والوں کے لئے نہیں ہے (پھر سلسلۂ تحقیق جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ) اس مشروعیت عامہ سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ نفس الامر اور حقیقت میں پانچ نمازیں عمومی طور پر ہیں ان کی یہ تقسیم ان پانچ ظاہری اوقات پر محض ان کے موجود ہونے کی حالت میں ہوگی (پس ظاہر ہے کہ) ان ظاہری اوقات کے معدوم ہونے کی صورت میں نفس وجوب ساقط نہ ہوگا، بلکہ علیٰ حالہ باقی رہے گا - اور جناب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام (خمس صلوٰت کتبهن الله الخ) میں اس کا اشارہ بھی ملتا ہے (پھر یہ بحث کہ) وقت مقررہ معدوم ہونے کے وقت قضاء کی نیت کریں یا اداء کی تو صحیح یہ ہے کہ وقت ادا معلوم نہ ہونے کی وجہ سے قضاء کی نیت نہ کریں گے (بلکہ ادا ہی کی نیت کریں گے) اور جو شخص وجوب عشاء کا فتویٰ دیگا وہ وجوب وتر کا بھی فتویٰ دے گا - (فتح ص١٥٦ ج١)

اور زمانہ رمضان المبارک میں اگر تراویح پڑھنے کا موقعہ نہ ملے، نہ بیس رکعات

نہ بارہ رکعات نہ آٹھ رکعات تو تراویح نہ پڑھیں، اسی طرح اگر سنن رواتب کا موقعہ نہ ملے، نہ پڑھیں، مگر فرض عشاء و وتر ضرور پڑھیں اور دن کی نمازیں ظہر و عصر، اپنے اوقات منصوصہ میں پڑھیں۔

مسئلہ ۱۵ :- جن مقامات میں اتنا بھی وقت نہ ملتا ہو جس میں ان تینوں نمازوں (مغرب، عشاء، فجر) کے محض فرض فرض بھی مختصر طریقہ پر اور خواہ مسلسل کیوں نہ ہو نہ ادا کئے جا سکتے ہوں، لیکن وہاں آفتاب کا روزانہ طلوع و غروب ہونا صادق آتا ہو جیسا کہ عرض تسعین کے قریب بعض مہینوں میں ایسا ہو سکتا ہے تو ان مقامات میں غروب شمس سے غروب شمس تک کا وقت لیل و نہار کا ایک مجموعہ شمار کر کے نصف اول (غروب شمس سے بارہ گھنٹہ تک) رات کا حصہ شمار کیا جائے اور رات کا حصہ شروع ہوتے ہی نماز مغرب پڑھ لی جایا کرے، پھر تقریباً ۱½ گھنٹہ کے بعد سے عشاء کا وقت شمار کیا جائے اور جہاں تک جلد ہو سکے نماز عشاء کی ادائیگی کر لی جایا کرے۔

پھر نصف اول (جو رات کا حصہ شمار ہے) ختم ہونے سے ۱½ گھنٹہ قبل سے نماز فجر کا وقت شمار کیا جائے اور نصف اول کے ختم ہونے سے آدھ گھنٹہ بیس منٹ قبل نماز فجر سے فراغت کر لی جائے۔

پھر نصف ثانی (جو دن کا حصہ شمار ہے) کا نصف اول گذرتے ہی یعنی لیل و نہار کے پورے مجموعے (۲۴ گھنٹہ) کا ربع ثالث شروع ہونے کے بعد سے نماز ظہر کا وقت قرار دیا جائے اور جہاں تک جلد ہو سکے نماز ظہر سے فراغت کر لی جائے، پھر اس مجموعہ لیل و نہار مکمل ہونے یعنی غروب شمس ہونے سے تقریباً ۱½ گھنٹہ قبل سے بلکہ اصفرار شمس شروع ہونے سے آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ قبل سے نماز عصر کا وقت شمار کر لیا جائے اور اصفرار شمس سے قبل قبل نماز عصر ادا کر لی جائے کما سیاتی

تفصیلہ فی جواب نمبر ۲۔

پھر غروب شمس سے دوسرا مجموعہ لیل و نہار شمار کر کے دوسرے دن کی مغرب شمس کے غروب ہوتے ہی پڑھ لی جائے اور پھر عشاء و فجر وغیرہ ساری نمازیں اول یوم یعنی لیل و نہار کے اول مجموعہ کے حساب سے ادا کر لی جائے۔ پھر اسی طرح ہر روز کی نمازوں کا معمول رکھا جائے۔ ھذہ کلھا مستنبطۃ من الفتح ص۱۵۶ ج۱ و من در المختار و من رد المختار ص۳۳۱ ج۱ و ص۳۷۱ ج۱۔

مسئلہ ۵ :- جن مقامات میں شمس کا غروب و طلوع روزانہ نہ ہوتا ہو بلکہ کئی کئی دن یا کئی کئی ماہ مسلسل آفتاب طلوع یا غروب رہتا ہو جیسے ارض تسعین اور اس کے قرب و جوار کے مقامات تو وہاں پر بھی چونکہ آفتاب ہر چوبیس گھنٹے میں اپنا ایک چکر پورا کر لیتا ہے، یعنی جس وقت جس نقطہ سے چلتا ہے پورے ۲۴ گھنٹے پر اسی نقطہ پر تقریباً پہنچ جاتا ہے اور یہ پورا ایک چکر (دورہ) شمار ہو سکتا ہے۔ جو لیل و نہار کا مجموعہ اور ایک دن رات کے برابر کہا جا سکتا ہے۔ پس اس ہر ایک دن رات میں (جو ۲۴ گھنٹے کی مقدار کے برابر ہوگا) پانچوں نمازوں کے وقت کا تعین اندازہ سے کر کے برابر ان کو ادا کریں گے۔ اور اس لیل و نہار کے مجموعہ کی ابتداء اس قریبی مقام کے غروب شمس کے وقت سے کر لیا کریں، جہاں پر آفتاب غروب ہوتے ہی طلوع ہو جاتا ہے تاکہ اس قسم کے مقامات میں اوقات نماز میں یگانگت و یک جہتی اور وحدت دین کی ایک شان نمایاں رہے اور حافظوا علی الصلوٰت کا بھی حتی المقدور امتثال و ظہور ہوتا رہے۔

اور اگر یہ سب صورتیں دشوار ہوں تو ایسا کرنا تو بہر حال آسان ہے کہ جس دن آفتاب غروب ہو کر طلوع نہ ہونا شروع ہو جائے اور مسلسل غروب رہے، اس دن کے غروب سے ۲۴ گھنٹے کی مقدار پورے ایک دن و رات کی مقدار شمار کر کے اس

ہیں حسب تصریح و تفصیل مذکور پانچ نمازیں ادا کرتے جائیں اور پھر اس ۲۴ گھنٹہ ختم ہونے پر دوسرا ۲۴ گھنٹہ پھر تیسرا ۲۴ گھنٹہ بناتے اور اس میں دن و رات کی نمازیں پڑھتے چلے جائیں، اور دن بڑا ہونے میں جس دن آفتاب طلوع ہوکر مسلسل طلوع رہے غروب نہ ہو تو پہلے دورہ کے لئے طلوع سے صرف بارہ گھنٹہ کی مقدار پر ایک دورہ شمس ۲۴ گھنٹہ کا ختم کرکے اس میں ظہر و عصر کی نماز پڑھ لیں اور پھر اس کے بعد ۲۴ گھنٹہ کا ایک دورہ شمس شمار کرکے نصف اول کو دن قرار دے کر اس میں دن کی نمازیں پڑھا کریں اور نصف ثانی کو رات قرار دے کر اس میں رات کی نمازیں پڑھا کریں۔ اور یہ طریقہ احقر کے نزدیک سب سے اشبہ بالفقہ ہے۔

اس مسئلہ میں حدیث نبوی سے کافی روشنی ملتی ہے جس میں واقعہ دجال کا ذکر فرماتے ہوئے اس ایک دن کے اندر جو ایک سال کا ہوگا۔ ہر چوبیس گھنٹہ کی پانچوں نمازوں کو اندازہ کرکے پڑھنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے کما رواہ مسلم فی صحیحۃ اور ابن ہمام نے اس طرح فرمایا ہے۔

وما روی عنہ علیہ الصلوٰۃ والسلام انہ ذکر الدجال فقلنا مالبثہ فی الارض قال اربعون یوما یوم کسنۃ ویوم کشہر ویوم کجمعۃ وسائر ایامہ کایامکم فقیل یارسول اللہ فذلک

اور وہ حدیث جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مروی ہے کہ آپ نے دجال کا ذکر فرمایا تو ہم نے (صحابہ نے) عرض کیا یا رسول اللہ وہ دنیا میں کتنے دن ٹھہرے گا، جواب دیا کہ صرف چالیس دن، لیکن اس کا ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا اور ایک دن ایک ماہ کے برابر ہوگا اور ایک دن ایک ہفتہ کے برابر ہوگا۔ اور باقی دن تمہارے ان عام دنوں کے برابر ہوں گے۔ پھر عرض کیا گیا کہ وہ دن جو ایک

الیوم الذی کسنة
ایکفینا صلوٰة یوم
قال لا- اقدروا له
(رواه مسلم)
فقد اوجب اکثر
من ثلاثة مائة
عصر قبل صیرورة
الظل مثلا او مثلین
وقس علیه فاستفدنا
ان الواجب فی
نفس الامر خمس
علی العموم غیران
توزیعها علی تلک
الاوقات عند وجودها
ولا یسقط بعدمها الوجوب
انتهی بلفظه-

سال کے برابر ہوگا، کیا اس میں صرف ایک دن کی نمازیں پڑھ لینی کافی ہوں گی، فرمایا نہیں بلکہ اس میں اپنے ان دنوں کے اعتبار سے اندازہ کرکے نماز پڑھنی ہوگی (مسلم شریف) خلاصہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس دن میں) تین سو سے زیادہ عصر کی نمازیں ہر شئی کا سایہ اصلی ایک مثل اور دو مثل ہونے سے قبل قبل واجب فرمادیں- اور اسی پر بقیہ نمازوں کو بھی قیاس کرلو- اسی حدیث سے ہم کو یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اصل اور نفس الامر میں پانچ نمازیں علی العموم واجب ہیں- ہاں اتنی بات ہے کہ ان پانچ نمازوں کی تقسیم ان پانچ وقتوں میں ان پانچ وقتوں کے پائے جانے کی صورت میں واجب ہے (اور یہ بھی معلوم ہوا کہ) ان نمازوں کا وجوب ان کے اوقات کے موجود نہ ملنے سے ساقط نہ ہوگا- (فتح القدیر ص۱۵۶ ج۱)

اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنویؒ نے بھی اسی حدیث کو معمول بہ قرار دے کر اسی کے مطابق اندازہ سے نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے والیہ مال فی امداد الفتاوی ایضاً وصرح بہ فی فتاوی دار العلوم ص۱۳ ج۲-

مسئلہ ۱۶:- اگر قریبی مقام کے غروب سے مجموعۂ لیل و نہار کی ابتداء کا

انطباق مشکل ہو، اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق (کہ ۲۰ / مارچ اور ۲۲ / ستمبر کا دن تمام روئے زمین پر برابر یعنی ۱۲ گھنٹہ کا ہوتا ہے) اگر صحیح ہو اور ان تاریخوں میں سے کسی ایک میں بھی وقت غروب آسانی سے متعین ہوسکتا ہو تو تمام سال کے مجموعۂ لیل و نہار کی ابتدا اس سے متعین کرلیا کریں، غرض جس میں سہولت ہو اختیار کریں۔

مسئلہ نمبر ۷:- جب تک رات چھوٹی ہو اور دن بڑا ہو، اور آفتاب روزانہ طلوع و غروب ہوتا ہو اس وقت تک زوال شمس اور وقت ظہر و عصر الگ الگ متحقق و متمیز ہوں گے۔ اور ہر وقت کی نماز اس کے اصل وقت میں پڑھنی ضروری ہوگی۔ البتہ عصر کی نماز اصفرار شمس سے قبل ادا کرلینا ضروری ہوگا۔ ورنہ نماز مکروہ ہوگی۔

مسئلہ نمبر ۸:- جب رات بڑی ہو اور دن چھوٹا ہو تو جب تک زوال شمس اور مثل و مثلین متمیز و معلوم ہوسکے اس وقت تک ظہر کی نماز ایک مثل کے اندر اور عصر کی نماز مثلین کے بعد ضروری ہوگا۔ ہاں اگر مثلین آتے آتے اصفرار شمس ہوجائے تو نماز عصر مثلین سے قبل اور ایک مثل کے بعد ہی پڑھ لینا چاہئے کما سیاتی تحقیقہ فی جواب ۲۔

مسئلہ نمبر ۹:- جب دن اتنا چھوٹا ہونے لگے کہ مثل اور مثلین کا تعین و تمیز نہ ہوسکے تو زوال شمس کے بعد جہاں تک جلد ہوسکے نماز ظہر پڑھ لی جائے اور اصفرار شمس سے کچھ پہلے نماز عصر سے فراغت کرلی جایا کرے۔

مسئلہ نمبر ۱۰:- جب دن اتنا چھوٹا ہونے لگے کہ زوال شمس بھی متمیز و متحقق نہ ہوسکے تو اندازہ سے دن کی نصف مقدار گزرنے کے بعد نماز ظہر پڑھ لی جائے۔ اور اصفرار شمس سے قبل نماز عصر پڑھ لی جائے۔ گو دونوں نمازوں کے درمیان فصل بہت تھوڑا رہے یا بالکل نہ رہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کما مر فی التحقیق الذی نقلتہ فی المسئلۃ الثالثۃ۔

مسئلہ ۱۱: - جب دن اتنا چھوٹا ہو جائے کہ دن کی نصف مقدار گذرنے کے بعد فرض ظہر و عصر بغیر سنن رواتب کے بھی ادا نہ کر سکیں تو طلوع سے غروب تک کی پوری مقدار میں پہلے صرف ظہر کا فرض پھر عصر کا فرض پڑھ لیا جایا کرے۔

مسئلہ ۱۲: - جب طلوع شمس کے بعد سے غروب شمس کے قبل قبل ظہر و عصر کا محض فرض بھی ادا کرنے کا وقت نہ ملے لیکن آفتاب کا طلوع ہونا روزانہ صادق آتا ہو تو طلوع آفتاب سے طلوع آفتاب تک کا ۲۴ گھنٹہ کا مجموعہ ایک لیل و نہار کا مجموعہ شمار کر کے نصف اول دن کا حصہ شمار کیا جائے اور نصف اول کے نصف اخیر یعنی پورے مجموعہ کا ربع ثانی شروع ہونے سے وقت ظہر شمار کیا جائے اور جہاں تک جلد ہو سکے نماز ظہر ادا کرلی جائے اور اس ربع ثانی کے ختم ہونے سے دو گھنٹہ قبل سے نماز عصر کا وقت شمار کیا جائے اور جہاں تک جلد ہو سکے نماز عصر ادا کرلی جائے۔

پھر ربع ثانی کے ختم ہونے سے یعنی پورے مجموعۂ نہار و لیل کے نصف اول کے ختم ہونے کے بعد سے وقت مغرب شمار کر کے جہاں تک جلد ہو سکے نماز مغرب پڑھ لی جائے۔ پھر دو ڈھائی گھنٹہ گذارنے کے بعد نماز عشاء و وتر وغیرہ پڑھ لیجائے پھر طلوع آفتاب سے $1\frac{1}{2}$ گھنٹہ قبل سے نماز فجر کا وقت شمار کیا جائے اور طلوع آفتاب سے آدھ گھنٹہ ۲۰ منٹ قبل نماز فجر پڑھ لی جائے۔

مسئلہ ۱۳: - جب روزانہ طلوع آفتاب نہ ہو بلکہ کئی کئی دن یا کئی کئی ماہ مسلسل آفتاب طلوع نہ ہوتا ہو، غروب ہی رہتا ہو جیسا کہ اسی ارض تسعین اور اس کے مضافات میں ہو سکتا ہے تو اس زمانہ کا ہر ۲۴ گھنٹہ نہار و لیل کا مجموعہ ایک دن و رات کے برابر قرار دیا جائے اور نصف اول کو دن کا حصہ شمار کیا جائے اور نصف آخر کو رات کا حصہ شمار کیا جائے اور دونوں حصوں میں مسئلہ ۱۲ کی طرح

عمل کیا جائے یہاں تک کہ غروب مسلسل کا یہ دور ختم ہو کر روزانہ آفتاب طلوع ہونا شروع ہو جائے۔ پھر ان مسائل مذکورہ نمبروار میں سے جس مسئلہ کا مصداق صادق آئے اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

تنبیہ :- سال کا ایک پورا دور مکمل ہو گیا اور اس کے ہر موڑ کے مطابق نماز کا حکم منقح کر دیا گیا تاکہ عمل میں سہولت رہے اور آسانی سے فریضۂ صلوٰۃ ہر دور کے مناسب ادا کیا جا سکے فالحمد للہ علیٰ ذلک۔ اب آگے سوال ۱ کے جز ثانی کا جواب جو روزہ سے متعلق ہے عرض کیا جائے گا۔

<u>سوال ۱ کے جزو ثانی (ب) کا جواب۔</u>

وجوب نماز کی طرح روزوں کا وجوب بھی ساقط نہ ہوگا بلکہ علیٰ حالہ باقی رہے گا۔

لورود النص عاما مطلقا شاملا لجميع الناس في جميع الأزمنة والأمكنة من غير فرق بين أهل قطر وقطر كما قال الله تعالى يا ايها الذين آمنوا كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون اياما معدودات - (الآية)

(آیت کریمہ) اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ۔ تھوڑے دنوں روزے رکھ لیا کرو۔ (بیان القرآن)

وكما قال الله تعالى شهر رمضان الذي انزل فيه القرآن هدى للناس وبينات من الهدى والفرقان

ماہ رمضان ہے جس میں قرآن بھیجا گیا ہے جس کا وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور واضح الدلالۃ ہے۔ منجملہ ان کتب کے جو ہدایت ہیں اور فیصلہ کرنے والی ہیں

فمن شهد منكم الشهر فليصمه (الآیۃ)

سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے۔ (بیان القرآن)

اس مضمون کی تائید علامہ ابن عابدینؒ کی تحقیق سے بھی ہوتی ہے۔ جس کو موصوف نے رد المحتار ص۳۹۲ ج۱ میں زیر عنوان "تتمہ" تفصیل سے بیان کیا ہے۔ البتہ صورت ادا میں کچھ تفصیل ہوگی جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ اور بغرض تسہیل فہم ہر صورت الگ الگ بعنوان مسئلہ بیان کی جاتی ہے۔

مسئلہ ۱:۔ جن مقامات میں شمس کی عام گردش یومیہ کے اعتبار سے روزانہ طلوع و غروب نہ پایا جاتا ہو بلکہ کئی کئی دن یا کئی کئی ماہ تک مسلسل آفتاب طلوع ہی رہتا ہو یا غروب ہو کر زمین کے اوٹ میں غائب ہی رہتا ہو جیسا کہ ارض تسعین اور اس کے اطراف میں ایسا ہو سکتا ہے تو ان مقامات میں جواب نمبر ۱ کے جزو اول کے مسئلہ نمبر ۵ کے مطابق آفتاب کا ایک پورا دورہ (۲۴ گھنٹہ کا) جو ایک لیل و نہار کا مجموعہ شمار ہوتا ہے اور اس کے نصف آخر کو دن کا حصہ شمار کیا جاتا ہے اس میں روزہ رکھیں اور اس نصف کے شروع ہونے سے ۱½ گھنٹہ پہلے ہی سحری کھانا بند کر کے روزہ کی نیت کر کے روزہ رکھ لیا کریں اور نصف اول جو رات کا حصہ شمار ہوتا ہے اس میں مغرب، عشاء، وتر، تراویح فجر سب نمازیں پڑھ لیا کریں، اور پھر جب یہ مجموعہ لیل و نہار پورا ہو کر دوسرے دور کا آغاز ہو فوراً نماز مغرب پڑھنے کی طرح افطار بھی کر لیا کریں۔ اور پھر اس دوسرے دور کے نصف اول میں جو رات کا حصہ شمار ہوتا ہے اس میں کھانا پینا وغیرہ اور رات کی سب نمازوں (عشاء، وتر، تراویح و فجر وغیرہ) سے فراغت کر لیا کریں۔ اور نصف ثانی میں جو دن کا حصہ شمار ہوتا ہے اس کے شروع

ہونے سے ۱½ گھنٹہ قبل سحری کھالیا کریں اور روزہ کی نیت کرلیا کریں، پھر اسی طرح ہمیشہ کیا کریں تاآنکہ یہ طلوع وغروب روزانہ ہونے لگے۔ ذلک الدلیل الذی بینہ فی رد المحتار ص۳۹۹ ج ۱ تحت التتمہ۔

مسئلہ ۲:۔ جن مقامات میں طلوع وغروب شمس تو روزانہ پورے سال پایا جاتا ہو لیکن ہر موسم میں غروب شمس کے بعد سے فجر صادق طلوع ہونے کے قبل قبل تک اتنا موقعہ نہ ملتا ہو کہ بایماء آیت کریمہ:۔

کلوا واشربوا حتی یتبین	کھاؤ اور پیو اس وقت تک کہ تم کو
لکم الخیط الابیض من الخیط	سفید خط صبح کا متمیز ہو جائے سیاہ خط
الاسود من الفجر ثم اتموا	سے، پھر رات تک روزہ کو پورا کرلیا
الصیام الی اللیل (الآیۃ)	کرو۔ (بیان القرآن)

کھایا پیا جاسکے اور پھر اس کے بعد غروب تک روزہ پورا کیا جاسکے تو ان مقامات میں روزہ کی مقدار ساعات سے (یعنی گھنٹوں سے یا نصف گردش شمس وغیرہ سے) متعین نہ کریں گے بلکہ اس ماہ (رمضان) کے بعینہ یہی دن روزوں کے لئے متعین رہیں گے۔ لیکن چونکہ اس طرح بغیر آسودگی سے کھائے پیئے پورے ماہ میں صوم پر عادتاً وعموماً قدرت نہیں ہو سکتی، اس لئے ناغہ دے کر حسب قدرت واستطاعت روزہ رکھا کریں گے اور جن دنوں میں افطار کریں گے ان دنوں کے صوم کے عوض میں دوسرے مہینوں کے دنوں میں حسب قدرت ناغہ دیدے کر ادا کرتے رہیں، لیکن اگر جسمانی کمزوری کی وجہ سے اس پر قدرت نہ ہو تو ان روزوں کا فدیہ فی صوم ایک صدقہ فطر کے برابر ہمیشہ ادا کرتے رہیں گے۔

اور اگر بوجہ غربت فدیہ نہ دے سکتے ہوں گے تو استغفار کرتے رہیں گے

اور وہاں سے جلد سے جلد ترک سکونت کر لینے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

کما یوخذ من هذه العبارة وكذا لو نذر صوم الابد فضعف عن الصوم لاشتغاله بالمعيشة له ان يفطر ويطعم لانه استيقن ان لا يقدر على قضائه فان لم يقدر على الاطعام لعسرته يستغفر الله و يستقيله وان لم يقدر لشدة الحر كان له ان يفطر ويقضيه في الشتاء ان لم يكن نذر الابد (فتح القدير ص ۸۳/ج ۲)

اگر کسی نے ہمیشہ ہمیشہ روزہ رکھنے کی منت مان لی پھر اپنے روزگار و معاش میں مشغولی کی وجہ سے ایفار نذر پر قادر نہیں رہا تو اس کے لئے درست ہے کہ وہ افطار کر لیا کرے، اور روزوں کا فدیہ دیدیا کرے، یہ حکم اس وقت ہے جب وہ شخص غریب ہو اور اس کے لئے معاش میں مشغولی شرعًا واجب ہو، اس لئے کہ اس کو یقین حاصل ہو چکا ہے کہ وہ اس نذر کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہے پس اگر بوجہ غربت کے فدیہ کی ادائیگی پر پھر بھی قادر نہ ہو تو افطار کرتا رہے اور ساتھ ساتھ استغفار بھی کرتا رہے اور جلد سے جلد اس جگہ سے (جہاں پر وہ کر روزے نہیں رکھ سکتا اور ایفائے نذر نہیں کر سکتا) دوسری جگہ منتقل ہو جائے۔ اسی طرح اگر کسی کو شدت حر سے روزہ پر قدرت نہ رہے تو افطار کر لے اور جاڑے میں قضا کر لیا کرے جب کہ نذر ابد نہ ہو۔ ۱۲

مسئلہ نمبر ۳:- جن مقامات میں غروب وطلوع شمس تو روزانہ پایا جاتا ہے لیکن سال کے صرف بعض مہینوں میں غروب شمس سے صبح صادق کے درمیان

میں نماز ہائے مفروضہ واجبہ ادا کرنے کے بعد اطمینان سے کھاپی کر حسب ہدایت آیت کریمہ کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض الآیۃ روزہ رکھنے کا وقت ملتا ہو اور بعض مہینوں میں نہ ملتا ہو، تو جس وقت ماہ رمضان ان مہینوں میں واقع ہو جائے جس میں یہ موقع نہ ملتا ہو تو ناغہ دیدے کر حسب استطاعت روزہ رکھیں اور جن دنوں میں روزہ نہ رکھ سکیں ان دنوں کی قضا اسی سال کے دوسرے دنوں میں رکھ لیا کریں، اور استغفار کرتے رہا کریں اور جلد سے جلد وہاں سے ترک سکونت کی کوشش کرتے رہا کریں۔ کما مر فی المسئلۃ التی قبل ھذہ المسئلۃ۔

مسئلہ ۴۲ :- جن مقامات میں طلوع وغروب شمس روزانہ پایا جاتا ہو، اور غروب کے بعد سے فجر صادق کے طلوع ہونے کے پیشتر تک پورے سال اتنا کافی وقت ملتا ہے جس میں صلوٰتہائے مفروضہ وواجبہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اطمینان سے کھانے پینے اور کچھ آرام وسکون لینے کا وقت بھی مل جاتا ہو تو ان مقامات کے لوگوں پر ماہ رمضان میں ہی ہمیشہ ادائیگی صوم واجب وضروری ہو گی اور فجر صادق طلوع ہونے سے ہی روزہ شروع کر دینا لازم ہو گا اور وقت فجر کی مقدار طویل ہونے کی وجہ سے صوم کی مقدار اگرچہ طویل ہو جائے لیکن سرد ملک ہونے کی وجہ سے قدرت علی الصوم رہے گی۔ اور وجوب صوم متوجہ رہے گا، ساقط نہ ہو گا ہاں اگر کسی کو کوئی وقتی وعارضی مجبوری یا کوئی عذر شرعی پیش آجائے جیسے حاملہ حائضہ، مرضعہ یا مریض ومسافر وغیرہ تو ایام معتدلہ والوں کی طرح ان کو بھی رخصتیں ملیں گی۔

کما دلت علیہ ھذہ العبارۃ	حاملہ ومرضعہ جب اپنے اوپر یا اپنے بچہ
والحامل والمرضع اذا خافتا	پر روزہ رکھنے سے، جان جانے کا خوف

علیٰ انفسھما او ولدیھما افطرتا وقضتا دفعا للحرج ولا کفارۃ علیھما لانہ افطار بعذر ولا فدیۃ علیھما۔ (ھدایہ)

کرنے لگیں تو اس حرج کو دفع کرنے کے لئے افطار کرلیں اور بعد میں قضاء رکھ لیں اور اس عمل کی وجہ سے ان پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہے اور نہ ان پر کوئی فدیہ ہے اس لئے کہ یہ افطار عذر شرعی کی وجہ سے ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شیخ فانی ہو یا ایسا دائم المریض ہوچکا ہو کہ بظاہر حال قدرت علی الصوم مستبعد ہوچکی ہو تو افطار کرتا رہے اور فدیہ صوم کا ادا کرتا رہے

وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین۔

اور جو لوگ روزے کی طاقت نہ رکھتے ہوں ان کے ذمہ فدیہ ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا ہے۔ (بیان القرآن)

وھکذا ایضاً فی الشامی ص۱۲۶/ج۲ - وھکذا فی ص۱۲۷/ج۲ ایضاً ناقلا عن الرملی۔

مسئلہ ۵ :۔ ان مسائل سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ گلاسکو اور اس کے مضافات میں ۲۰ر جون سے اور بالائی اسکاٹ لینڈ و نادوے اور اس کے مضافات میں ۲۴ر مئی سے شفق ابیض غروب ہونے سے قبل ہی صبح صادق طلوع ہوجاتی ہے جب تک غروب شمس کے بعد سے صبح صادق طلوع ہونے کے قبل قبل فرض مغرب و فرض عشاء و وتر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ افطار کرنے اور کھانے پینے اور سحری کھانے کا موقع ملتا رہے گا۔ روزہ رکھنا فرض رہے گا، کیونکہ صوم کی مقدار اگرچہ ۲۰ر گھنٹے کے لگ بھگ ہوجائے گی مگر سرد ملک ہونے کی وجہ سے قدرت علی الصوم رہے گی جیسا کہ مؤرخ مغربی ابن بطوطہ کے سیاحت نامہ سے جو ایسے ہی ممالک کے سفر سے متعلق ہے معلوم ہوتا ہے۔ ۱۲

مسئلہ ۶ :۔ جن مقامات میں چاند ایام معتدلہ کی طرح ہر ماہ دو دن کے علاوہ بقیہ تمام ماہ روزانہ طلوع وغروب ہو کر اپنا ماہانہ دورہ پورا کر لیتا ہو (خواہ تھوڑی ہی دیر کے لئے طلوع ہو کر پھر غروب ہو جاتا ہے) ان مقامات میں ماہ رمضان المبارک اور اس کی پہلی تاریخ کا تعین اسی جگہ کے مطابق کر کے مسائل مذکورہ بالا کے مطابق روزے رکھا کریں۔

مسئلہ ۷ :۔ جن مقامات میں چاند روزانہ طلوع وغروب نہ ہوتا ہو بلکہ کئی کئی دن یا کئی کئی ماہ مسلسل چاند طلوع رہتا ہو یا غروب ہی رہتا ہو، جیسے ارض تسعین اور اس کے مضافات کے بعض مقامات ہیں۔ تو ان مقامات میں کسی قریبی مقام کو (جہاں چاند دو دن کے علاوہ پورے ماہ میں روزانہ طلوع وغروب ہو کر اپنا ماہانہ دورہ پورا کر لیتا ہو، اور آسانی سے اس کا علم و مشاہدہ ہو سکتا ہو) بنیاد بنا کر ماہ رمضان المبارک کا اور اس کی پہلی تاریخ کا تعین کر کے گردش لیل ونہار کے مجموعہ کے ساتھ منطبق کر لیں، پھر ایک مجموعہ کو پوری ایک رات اور دن (۲۴ گھنٹہ) قرار دیں، اور اس کے نصف اول کو رات کا حصہ قرار دے کر اس کے ختم ہونے سے تقریباً دو گھنٹہ قبل سحری کھا کر روزہ کی نیت کر لیا کریں اور نصف ثانی (جو دن کا حصہ شمار ہوگا) پورا ہوتے ہی روزہ افطار کر لیا کریں۔ اور مغرب وغیرہ کی نمازیں ادا کر لیا کریں جیسا کہ ہم سوال اول کے جزو (الف) کے جواب میں بضمن مسائل تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

تنبیہ :۔ شروع جواب میں لکھا گیا ہے کہ اسلام دین الٰہی اور دین فطرت ہے، اور ایک بین الاقوامی مذہب ہے۔ اس کے احکام و مدار احکام فطری اور فطری اصول کے مطابق ہوتے ہیں۔ فلسفیانہ موشگافیوں سے مبرا و محفوظ ہوتے ہیں اور مسائل کی یہ تشقیقات و تفصیلات تو بالکل فلسفیانہ موشگافی یا اس کے ہم پلہ ہیں،

کوئی یہ شبہ نہ کرے اس لئے کہ ان غیر معتدل ایام کے رہنے والے نفسیاتی اور فطری طور پر کئی کئی دن تک آفتاب طلوع رہنے کے زمانہ میں مسلسل نہ کام کر سکتے ہیں اور نہ مسلسل بیدار ہی رہ سکتے ہیں، اور نہ اس طرح کی مسلسل کئی کئی دن تک مسلسل رات میں مسلسل سو ہی سکتے ہیں۔ بلکہ وہ بتقاضائے فطرت مجبور ہیں کہ اپنے سونے جاگنے کھانے پینے، کام کرنے، آرام کرنے وغیرہ وغیرہ، تمام کاروبار و معاملات میں گھنٹوں ہی سے کوئی نظم کریں۔ گویا یہ وہاں کے لوگوں کی ایک فطری و نفسیاتی چیز ہو جائیگی کما اشار الیہ۔ الشاہ عبد العزیز المحدث الدھلوی فی فتاوی ص ۱۴۳ ج ۱۔

پس شرعی احکام بھی انہی اصول کے ماتحت بعد آیات کریمہ و احادیث شریفہ فقہ کی روشنی میں مرتب ہوں گے اور یہ احکام معروضہ اسی انداز پر مرتب ہیں لہذا یہ بھی عین فطرت کے مطابق ہی کہلائیں گے۔ منافی نہ کہے جائیں گے۔ مزید تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ تطویل کے علاوہ خروج عن المبحث بھی ہو جائے گا، اس لئے اسی پر اکتفاء ہے اور امید ہے کہ اتنی گذارشات سے اس اطراف کے ہر خطہ میں اور ہر موسم میں نماز و روزہ کے عمل و امتثال میں شرعی رہنمائی حاصل ہو جائے گی اور اس کی روشنی میں جو شخص عمل کرنا چاہے گا اس کو عمل کرنے میں کوئی دقت یا الجھن نہ ہوگی، بلکہ نہایت آسانی سے عمل کر کے اپنے مربی حقیقی سے اپنا صحیح رشتہ عبودیت جو اصل مقصد زندگی ہے قائم و استوار رکھ سکے گا۔

سوال ۲ کا جواب۔

وفی الدر وقت الظهر من زواله الی بلوغ الظل مثلیه وعنه مثله وهو

درمختار میں ہے کہ ظہر کا وقت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر شئی کا سایہ دو مثل ہونے تک ہے اور امام صاحب سے ایک مثل کی بھی

قولهما وقول زفر والائمة الثلاثة (الى قوله) وفي الفيض وعليه (اى على قول صاحبين) عمل الناس اليوم وبه يفتى (وتحته في الشامية ص۳۷۱ ج۱) والاحسن ما في السراج عن شيخ الاسلام ان الاحتياط ان لا يؤخر الظهر عن المثل وان لا يصلي العصر حتى يبلغ المثلين ليكون مؤديا للصلوتين في وقتهما بالاجماع (وايضا فيه ص۳۷۲ ج۱) قد قال في البحر لا يعدل عن قول الامام الى قولهما الا لضرورة من ضعف دليل او تعامل - ۱۲

ایک روایت منقول ہے اور یہ ایک مثل کا قول صاحبین کا نیز امام زفرؒ و ائمہ ثلثہ کا بھی ہے (الی قولہ)، اور فیض میں منقول ہے کہ آج کل تمام لوگوں کا عمل صاحبین ہی کے قول پر ہے اور اسی کے ساتھ فتوی بھی دیا جاسکتا ہے۔ اور اسی متن کے نیچے شامی ص۳۷۱ ج۱ میں ہے کہ ان تمام اقوال میں بہتر وہ قول ہے جو سراج وہاج میں شیخ الاسلام سے مروی ہے کہ احتیاط یہ ہے کہ نماز ظہر کو ایک مثل سے مؤخر نہ کیا جائے اور نماز عصر مثلین سے قبل نہ پڑھی جائے تاکہ دونوں نمازیں (ظہر وعصر) بالاجماع اپنے اپنے وقتوں میں ادا ہوں۔ نیز اسی شامی ص۳۷۲ ج۱ میں بحوالہ البحر منقول ہے کہ امام کے قول سے صاحبین کیجانب بھی ضعف دلیل یا تعامل ناس وغیرہ وجوہ شرعی کے بغیر عدول نہ کیا جائے۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ شفق احمر وابیض کی طرح مثل اور مثلین میں بھی امام صاحبؒ کا ایک قول مثل کا ہے۔ نیز تعامل ناس بھی صاحبین کے ہی قول پر ہے عدول عن قول الامام کی وجہ بن سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود حتی الوسع

نماز عصر بعد مثلین اس لئے پڑھتے ہیں تاکہ بالاجماع اور بلا اختلاف نماز عصر اپنے وقت میں ادا ہو۔

انہی عبارتوں سے نماز عصر کے اندر مثلین سے اس کی تقدیم کی گنجائش عند الضرورت نکل آئی۔ اس کے علاوہ اصفرار شمس کے بعد نماز عصر ادا کرنا عند الاحناف بالاتفاق مکروہ ہے جس سے اجتناب واجب ہے، پس حسب تحریر سوال اگر وہاں (کلاسکو وغیرہ میں) مثلین سے ہی اصفرار شمس شروع ہو جاتا ہے تو اس سے اجتناب حتی الوسع ضروری ہوگا۔ اور مثلین سے قبل ہی نماز عصر ادا کر لینے کی اصول احناف کے مطابق جیسا کہ ابھی مذکور ہوا بدرجہ اولیٰ گنجائش ہوگی اور ادا کر لینا بلا شبہ و بلا نکیر درست ہوگا اور نماز ادا ہو جائے گی۔ اور ایسی صورت میں کہ جب بعد مثلین پڑھنے میں اصفرار شمس قطعی طور پر ہو جاتا ہے تو ائمہ مساجد کا اصرار بجا نہ ہوگا۔

سوال ۳ کا جواب :-

ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ اسلام دین الٰہی اور دین فطرت ہے، اس کے اصول فطری اور سادے ہیں، اس کے احکام اور مدار احکام بھی فطری و سادے ہوں گے، محکمۂ موسمیات یا ماہرین فلکیات کی تحقیقات پر اس کے احکام کی بناء نہ ہوگی، اور اسی وجہ سے اختلاف مطالع کا اعتبار جمہور محققین کے نزدیک نہیں ہے خواہ شافعی ہوں یا حنفی یا مالکی ہوں یا حنبلی۔ غرض جمہور امت کے نزدیک غیر معتبر ہے۔ کمافی الشامی ص $\frac{147}{2}$ ۔

قد صرحت ائمة المذاهب الاربعة بان الصحيح انه لا عبرة برؤية الهلال نهارا (الى قوله) وانه لا عبرة بقول المنجمين۔

تمام ائمہ مذاہب نے تصریح فرمائی ہے کہ دن میں رویت ہلال کا اعتبار نہیں۔ (الی قولہ) اسی طرح منجمین کے قول کا بھی اعتبار نہیں۔

اور چونکہ امام تاج الدین سبکی شافعی کے قول کی بنا، انہی حسابات پر ہے اور وہ مزاج اسلام کے خلاف ہے اور اسی وجہ سے خود تمام محققین شوافع نے اس کو رد کر دیا ہے ماقالہ السبکی رد ہ متاخروا اھل مذھبہ (شامی ۱۴۱/۲ج) -

غرض جمہور امت محمدیہ کے نزدیک امام تاج الدین سبکیؒ کے قول پر مدار مذہب نہیں رکھ سکتے۔ بالخصوص اس زمانے میں جب کہ ریڈیو کی اس قدر کثرت ہو گئی ہے کہ ہندوستان جیسے پسماندہ ملک میں بھی گھر گھر نہیں تو گاؤں گاؤں، یا قصبہ قصبہ تو ضرور ہی اس کی بہتات ہو چکی ہے جس کے ذریعہ سے دور و نزدیک ہر جگہ کی اطلاعات بے تکلف و بغیر کسی کاوش و دقت کے پہنچتی رہتی ہیں۔ تو پھر اقوام متمدنہ کے ملکوں میں اس کی کس قدر کثرت و بہتات و فراوانی ہوگی اور اس کے ذریعہ آمدہ اطلاعات و اعلانات کا شرعی حکم یہ ہے کہ اگر یہ اعلانات و اطلاعات شرعی اصول کے مطابق آجائیں خواہ کسی خطہ و ملک سے آجائیں۔ ثبوت کے لئے شرعاً کافی ہوں گی۔ جس کو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی اپنے رسالہ "آلات جدیدہ کے شرعی احکام"، میں خوب واضح طور سے بیان فرمایا ہے اور شرعی اصول و ضوابط کے مطابق اس قسم کے اعلان و اطلاع حاصل کرنے کا نظم بالخصوص متمدن ممالک میں کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں۔ مثلاً کسی مرکزی شہر میں جہاں کا مطلع صاف رہتا ہو، غبار آلود نہ رہتا ہو، اور وہاں ریڈیو اسٹیشن بھی ہو، منجانب حکومت یہ انتظام کرا لیا جائے کہ کوئی مسلمان حاکم شہادت شرعیہ کے ذریعہ رویت کا ثبوت حاصل کر کے بایں الفاظ یہ اعلان کر دیا کرے کہ رویت کا ثبوت شرعی حاصل کر کے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کل یوم فلاں سے مثلاً یکم رمضان ہے یا یکم شوال ہے تو یہ اعلان معتبر ہوگا اور اس پر عمل کرنا اصول مذہب کے مطابق صحیح و درست ہوگا۔ صرف

ایک بات ملحوظ رکھنی ہوگی کہ اس اعلان پر عمل کرنے سے مہینہ بجائے ۲۹ و ۳۰ دن کا ہونے کے ۲۸ دن یا ۳۱ دن کا نہ ہو رہا ہو۔

اور اگر منجانب حکومت ایسا باقاعدہ نظم نہ ہو سکے تو آپسی انتظام سے ایک شرعی ہلال کمیٹی بنائی جائے جس کے سب افراد باشرع مسلمان ہوں اور اس میں ایک سمجھدار عالم کو بھی جو مسائل متعلقہ سے بخوبی واقف ہو، شریک کر لیا جائے تاکہ تمام شرعی کارروائی باوثوق طریقہ سے مکمل ہو سکے، وہ شرعی ہلال کمیٹی رویت ہلال کا شرعی ثبوت فراہم کر کے ریڈیو اسٹیشن سے اپنی نگرانی میں اعلان نشر کرادے کہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کر کے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کل صبح عید ہے مثلاً یا اس وقت سے ماہ رمضان کی شب ہو گئی، صبح سے روزے رکھے جائیں۔

اس ثانی صورت میں حکومت سے صرف اتنا کام لینا ہے کہ حکومت اور پروگراموں کے ساتھ اس پروگرام کے نشر کرنے کو منظور کرے اور ہلال کمیٹی کا کوئی مسلم وکیل یا مسلم نمائندہ وہاں پہنچ کر اعلان کر دیا کرے۔ ریڈیو اسٹیشن عموماً اس قسم کی خبریں اور اعلانات خود نشر کرتے رہتے ہیں ان کو اس کے منظور کرنے میں کچھ دقت نہ ہوگی، صرف اتنا لحاظ کرنا ہوگا کہ اس نشریہ کے الفاظ شرعی ہوں گے جس کو ہلال کمیٹی خود مرتب کر دے گی۔

پہلی صورت کے انتظام میں بھی حکومت کو کوئی خاص دقت یا پریشانی نہ ہوگی بلکہ ممکن ہے کہ اس سلسلہ انتظام میں حکومت کا کچھ مالی یا اقتصادی فائدہ ہی ہو جائے۔ اس لئے اگر حکومت تنگ دل یا متعصب نہ ہوگی تو آپ کا نظم بآسانی وبسہولت ہو جائے گا۔ نیز اگر حکومت غیر مسلم سے بھی یہ انتظام کرا لیا جائے جب بھی شرعاً نافذ وصحیح ہوگا۔ یہ انتظام مملکت برطانیہ یا اس کے گرد ونواح کے یا نزدیک کے کسی بھی مملکت مسلمہ یا غیر مسلمہ سے کرا لیا جائے تو بھی صحیح ونافذ

ہو جائے گا اور سارے مسلمان اس کے مطابق آسانی سے عمل کر سکیں گے۔ اگر یہ انتظام کر لیا گیا تو یہ ایک مستقل حل نکل آئے گا اور خط و ٹیلیفون سب سے زیادہ قوی اور اطمینان بخش ہو گا اور ہر طرح شرعی اصول و ضابطہ کے مطابق ہو گا۔

الحاصل جب ان سہولتوں کے موجود نہ ہونے کی حالت میں بھی تاج الدین سبکیؒ کا قول معمول بہ و مدار مذہب نہ بن سکا بلکہ فقہاء نے صاف تصریح فرمادی کہ اس حساب کے جاننے والے اور بتلانے والے اگرچہ عادل و ثقہ مسلمان ہوں گے جب بھی اس کا اعتبار نہ ہو گا۔ کما فی الشامی ص ۱۴۱/۲۔

ولا عبرۃ بقول الموقتین ولو عدولا علی المذہب۔	اہل ہندسہ و قول منجمین کا اعتبار نہ کریں گے اگرچہ وہ عادل ہی کیوں نہ ہوں۔ ۱۲

تو ان سہولتوں کے موجود ہوتے ہوئے یا ممکن ہوتے ہوئے کس طرح اس کو معمول بہ یا مدار مذہب قرار دیا جا سکتا ہے۔ پس ان سب باتوں کے باوجود اگر کسی جگہ کے لوگ تاج الدین سبکیؒ شافعی کی تحقیق کے مطابق عمل کریں گے تو ان کا یہ عمل صحیح نہ ہو گا اور ان کا یہ طریقہ نکالنا احکام مذہب کے مطابق صحیح تعمیل و صحیح ترجمانی نہ ہو گی بلکہ اگر وہ لوگ حکومت میں با اثر و بارسوخ ہوں، اور اسی طرح اور لوگ جو با اثر و بارسوخ ہوں اور حکومت کی جانب سے یا شرعی کمیٹی کے ذریعہ سے اعلان کا انتظام بسہولت متوقع ہو تو ان سب پر خطاب باری عز اسمہ خصوصی طور سے متوجہ ہو گا کہ وہ لوگ اس کے انتظام میں اپنی پوری قوت صرف کر کے امت مسلمہ کے انتشار و پریشانی کو رفع کریں، نہ کہ اصول مذہب کو چھوڑ دیں اور اجماع سلف کا توڑ کریں۔ اور اگر وہ اس کوشش میں بظاہر کامیاب نہ ہوں گے جب بھی حقیقت میں کامیاب شمار ہوں گے۔ ثمرات آخرت سے ضرور بہرور ہوں گے۔

ھذا ما عندی من الشرع الشریف فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ الاحقر محمد نظام الدین عفی عنہ

دارالعلوم دیوبند ۳ ۳/۸۹ھ

آیات، احادیث، روایات، فقہ کی روشنی میں استنباط کر کے جو حکم تحریر کیا گیا ہے وہ اقرب واشبہ ہے۔ اس پر عمل کرنے سے انشاء اللہ تعالیٰ ذمہ بری ہو جائے گا۔ احقر محمود عفی عنہ دارالعلوم

الجواب صحیح ۴ ۳/۸۹ھ

سید احمد علی سعید دارالعلوم دیوبند

۵ ۳/۸۹ھ

کھانے کی بعض مشتبہ اشیاء کے متعلق شرعی تحقیق

سوال (۱۴۰) ۔ ۱۔ جس طرح اس ملک میں اکثر کھانے پینے کی چیزیں غیر مسلم عیسائی اور یہودیوں کی فیکٹریوں میں بنتی ہیں، اور مسلمان خرید کر کھاتے پیتے ہیں۔ اسی طرح پنیر جس کو انگریزی زبان میں "چیز" (CHEESE) کہتے ہیں اپنے تمام تر اقسام کے ساتھ انھیں غیر مسلموں کی فیکٹریوں میں بنتا ہے اور مسلمان انھیں خرید کر کھاتے ہیں۔ اب کچھ دنوں سے سوال پیدا ہوا ہے کہ پنیر کے بنانے میں رینٹ (انفحہ) استعمال کیا جاتا ہے۔ جو نوزائیدہ گائے کے بچے کے شکم سے جمے ہوئے دودھ کی شکل میں نکالا جاتا ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بچھڑے کو دودھ پلا کر اس کو ذبح کیا جاتا ہے اس کے بعد پیٹ چاک کر کے وہ دودھ جو دہی کی شکل میں جم جاتا ہے نکال لیا جاتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ غیر مسلم کے ذبیحہ سے کشیدہ پنیر مایہ سے بنایا ہوا پنیر مسلمانوں کے لئے حلال ہے یا نہیں۔؟

۲۔ مسلمان کے ذبیحہ سے کشیدہ پنیر مایہ سے بنایا ہوا پنیر حلال ہے یا نہیں؟

۳ - (الف) ایک مسلمان کے سوال پر محکمۂ زراعت و اقتصادیات کے ایک ذمہ دار شخص نے ایک اخبار میں یہ بیان دیا ہے کہ پنیر بناتے وقت دودھ کو منجمد کرنے کے لئے رینٹ یعنی انفحہ استعمال ہوتا ہے مگر چونکہ بچھڑے کثیر تعداد میں ذبح نہیں کئے جاتے - اس لئے سور کے پیٹ سے بھی کوئی مادہ اس غرض کے لئے کشید کیا جاتا ہے اور بڑی تحقیقات کے بعد سائنسداں سبزہ جات سے بھی ایک مادہ کشید کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو دودھ کو جمانے میں استعمال کیا جاتا ہے اور حیوانی رینٹ کے قائم مقام ہو گیا ہے - اس بیان کے بعد مسلمانوں میں مزید تشویش پیدا ہو گئی -

(ب) ڈیری انڈسٹری کنٹرول بورڈ کے مینجر جمعیۃ العلماء ٹرانسوال کے سوال کے جواب کے ضمن میں فرمایا - یہ معلوم ہے کہ بیرونی ممالک میں بعض رینٹ میں سور کے پیٹ سے کشیدہ کوئی سیال مادہ (پیپسن) شامل ہوتا ہے - مگر جہاں تک اس آفس کا علم ہے اس ملک میں یہ آخر الذکر رینٹ مستعمل نہیں ہے -

(ج) جمعیۃ العلماء نٹال کے سوال پر اور بندہ کی اس سے ذاتی گفت وشنید اور تحقیق پر نیشنل کوپریٹو ڈیریز لمیٹیڈ پروڈکٹ کنٹرولر اور معاون مینجر نے زبانی اور تحریراً یہ بیان دیا ہے کہ اب ان کی جملہ برانچوں میں جو ساری ری پبلک میں پھیلی ہوئی ہے صرف سبزی کے مصنوعی رینٹ کا استعمال ہوتا ہے -

(د) کیپ ٹاؤن کی جمعیۃ العلماء کے شیخ ابو بکر نجار کی تحقیق وسوال کی بناء پر کیپ ٹائمس نامی اخبار میں ڈاکٹر جے، ایف لاگیر نے جو بایو کیمیکل منفکچرنگ فرم کے جوائنٹ مینجنگ ڈائرکٹر ہیں - یہ بیان دیا ہے کہ ہماری کمپنی ساری ساؤتھ افریقہ میں واحد رینٹ ساز کمپنی ہے جو صرف گائے کے بچے کے پیٹ سے کشیدہ مادہ سے رینٹ بناتی ہے جس میں (پیپسن) یعنی سور کے پیٹ کا کوئی جزو نہیں ہوتا ہے -

اسی اخبار میں مسٹر ڈبلیو، ایف، ڈی جونگ نے یہ بیان دیا ہے جو ایک بڑی قومی ڈیری پروڈکس منفگچرنگ کمپنی کے بڑے اگزیکسٹو ممبر ہیں کہ (پیپسن) بہت خبیص طور پر بنا ہوا ایک مادہ ہے جو بیرونی ممالک میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے مگر اس ملک میں مذہبی اختلافات (ورجحانات) کی طرف اشارہ ہے۔

تو اب کلام کا ملخص اور سوال یہ ہے کہ محکمۂ زراعت و اقتصادیات کے ذمہ دار شخص نے یہ بتلادیا کہ پنیر بناتے وقت دودھ کو منجمد کرنے کے لئے (پیپسن) یعنی سور کے پیٹ سے کشیدہ کوئی سیال مادہ بھی مستعمل ہوتا ہے، مگر یہ نہیں بتایا کہ اس ملک میں بھی اس کا استعمال ہے یا نہیں، اور دیگر سب بیان دینے والوں نے یہ بتلایا کہ اس ملک میں صرف بچھڑے کے پیٹ سے کشیدہ رینٹ یا مصنوعی نباتی رینٹ یعنی بچھڑے کا بھی رینٹ استعمال نہیں کرتے، وہ اپنی تمام فیکٹریوں میں صرف نباتی رینٹ استعمال کرتے ہیں۔ تو ایسی صورت حال میں کیا پنیر کو مشکوک ٹھہرا کر اس کو حرام سمجھا جائے یا ان ذمہ دار شخصوں کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے اس کو حلال ٹھہرایا جائے۔ امید کہ مدلل جواب عنایت فرمائیں گے۔

الجواب:- (۱) غنیۃ المستملی الکبیر ص۱۴۸ میں ہے۔

البیضۃ اذا وقعت من الدجاجۃ فی الماء او فی المرقۃ لا یفسدہ و کذا السخلۃ و کذا الانفحۃ بکسر الھمزۃ و فتح الفاء وقد تکسر وھی مایکون	انڈا اگر مرغی کے شکم سے نکل کر پانی میں یا شوربے میں گر جائے تو اس کو ناپاک نہ کرے گا (بشرطیکہ اور کوئی ناپاکی اس پر مثل غلاظت وغیرہ کے لگی ہوئی نہ ہو) اسی طرح نوزائیدہ بچہ بھی۔ اور اسی طرح انفحہ بھی ناپاک نہ کرے گا انفحہ اس دودھ کا نام ہے جو دودھ پینے بچہ کے شکم

فی معدۃ الرضیع من اجزاء اللبن طاهرۃ عند ابی حنیفۃ لایفسد الماء ولاغیرہ اذا خرجت من شاۃ میتۃ سواء کانت جامدۃ اومائعۃً۔ وعندهما المائع نجسۃ والجامدۃ متنجسۃ تطهر بالغسل فیفسد ان الماء وغیرہ الا اذا غسلت الجامدۃ اما لوخرجت من مذکاۃ فلا خلاف فی طهارتهما وهکذا فی الطحطاوی ص۹۱ علی المراقی قبیل کتاب الصلوٰۃ والفتح وغیرهما۔

میں ہوتا ہے، یہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک پاک ہوتا ہے جب وہ بکری کے شکم سے نکلے اور پانی وغیرہ میں گرجائے، تو اس کو ناپاک نہ کرے گا چاہے منجمد ہو یا سیال دونوں پاک ہوتا ہے۔ اور صاحبین کے نزدیک سیال ورقیق ناپاک ہوتا ہے اور منجمد خود تو پاک ہوتا ہے مگر اوپر کی رطوبت لگنے سے ناپاک رہتا ہے یہاں تک کہ وہ منجمد دھونے سے پاک ہوسکتا ہے۔ لہذا سیال مطلقاً اور خشک ومنجمد دھونے سے قبل، پانی وغیرہ کو ناپاک کردے گا۔ ہاں اگر خشک شدہ کو دھو دیا جائے گا تو یہ ناپاک کرے گا۔ لیکن اگر شرعی قاعدہ سے ذبح کئے ہوئے ذبیحہ سے نکلے تو بالاتفاق طاہر رہے گا۔ اسی طرح طحطاوی ص۹۱ علی المراقی میں بھی کتاب الصلوٰۃ سے ذرا پہلے مذکور ہے (کبیری ص۱۴۸) نیز فتح القدیر میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ انفحہ جو گائے کے بچہ کے شکم سے یا بکری وغیرہ کسی بھی ایسے جانور سے نکالا جاتا ہے جس کا گوشت کھانا حلال ہے وہ انفحہ اس جانور کے شکم سے شرعی قاعدہ سے ذبح کرنے کے بعد نکالا جائے تو وہ بالاتفاق

حلال و پاک ہوتا ہے اس کا کھانا اور اس کا استعمال کرنا درست رہتا ہے اور جو انفحہ ماکول اللحم ہی جانور کے پیٹ سے نکالا جائے مگر بغیر ذبح کئے ہوئے جانور سے (مثلاً مردار یا جھٹکا وغیرہ کر کے) نکالا جائے تو وہ صاحبین کے نزدیک حلال تو ہوتا ہے مگر معدہ کی خارجی ناپاک رطوبت وغیرہ کی آمیزش کی وجہ سے ناپاک رہتا ہے اگر خشک و منجمد ہو تو دھو کر پاک و طاہر بھی کیا جا سکتا ہے اور بعد تطہیر استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر رقیق و سیال ہے تو ناپاکی سرایت کر جانے کی وجہ سے اس کے تطہیر کی کوئی شکل باقی نہیں رہتی، اور اس کا استعمال درست نہیں ہوتا۔ اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہر حال میں اس کا استعمال درست رہتا ہے اور رہے گا کیونکہ وہ رطوبت ان کے نزدیک ناپاک نہیں ہوتی اور اس اختلاف کا ثمرہ یہ نکلے گا کہ از روئے فتویٰ اس کا استعمال جائز اور درست رہے گا اور از روئے تقویٰ احتیاط کرنا افضل ہوگا۔ پس یہ رینٹ جو گائے کے بچہ سے شرعی ذبح کے بعد نکالا جاتا ہے یہ حلال و پاک ہے، اس کا استعمال بلا اختلاف جائز و درست ہے اور اس کے ذریعہ سے جو پنیر بنایا جائے گا اس کا استعمال بھی جائز و درست رہے گا

۲ــــ اس نمبر کا جواب ۱ کے ضمن میں آچکا ہے کہ جائز ہے۔

۳ــــ سور (خنزیر) مثل غلاظت کے ناپاک و حرام ہے، ذبح کے بعد بھی یہ پاک نہیں ہوتا، اس کے پیٹ سے کشید کیا ہوا کوئی مادہ سیال ہو یا منجمد پاک و حلال نہ ہوگا ناپاک و حرام ہی رہے گا۔ اور اس کا استعمال جس کھانے وغیرہ میں ہو جائے گا وہ بھی ناپاک و حرام ہو جائے گا اور اس کا کھانا اور استعمال کرنا بھی درست و جائز نہ رہے گا، البتہ جب تک اس ناپاک و حرام (پیپسن وغیرہ) کی آمیزش کا ثبوت و یقین نہ ہو جائے۔ حرمت کا قطعی حکم نہ دیا جائے گا۔ لیکن احتیاط اولیٰ اور بہتر اور تقویٰ رہے گی، مکروہ یا حرام نہ کہہ سکیں گے۔

(ب وج ود) ان کے اندر درج شدہ بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیپسن وغیرہ جو سور کے پیٹ سے کشید کیا جاتا ہے وہ ٹرانسوال و نٹال اور ساؤتھ افریقہ میں عام طور سے استعمال نہیں ہوتا بلکہ یا تو گائے کے بچے کے شکم سے نکلا ہوا رینٹ (انفحہ) استعمال ہوتا ہے یا نباتات سے نکلا ہوا مصنوعی رینٹ استعمال ہوتا ہے۔ اس مصنوعی رینٹ (نباتی رینٹ) کے بنانے میں یا اور کسی طرح پر اس میں اگر کسی ناپاک یا حرام چیز کی آمیزش نہیں ہوتی تو یہ نباتی رینٹ بھی بلاشبہ پاک و حلال ہے۔

غرض جب پنیر بناتے ہیں تو دونوں قسم کے (حرام و ناپاک و حلال) رینٹ استعمال ہوتے ہیں۔ اور اصل اشیاء میں حلت اور طہارت ہے تو جب تک کسی پنیر کے بارے میں یہ بات دلیل سے متحقق نہ ہو جائے کہ اس میں حرام یا ناپاک رینٹ استعمال ہوا ہے یا کوئی ناپاک اور حرام چیز ملی ہوئی ہے اس پر حرام یا ناپاک کا حکم نہ لگائیں گے۔ ہاں جب دلیل سے یہ یقین ہو جائے اور ثبوت مل جائے کہ اس میں کوئی ناپاک یا حرام چیز ملی ہوئی ہے جیسے یہ کہ پیکٹ و ڈبہ پر ہی لکھا ہوا ہو کہ یہ پنیر پیپسن یا کسی حرام یا ناپاک رینٹ سے تیار ہوئی ہے یا مثلاً معتبر شہادت مل جائے کہ اس میں حرام یا ناپاک چیز ملی ہوئی ہے تو اس کو ہرگز استعمال نہ کیا جائے مگر بلا وجہ شرعی کسی کو جھوٹا سمجھنا یا متہم کرنا بھی درست نہیں ہے۔ اور بالخصوص جب عام طور سے حلال و پاک ہی رینٹ کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ شرعی قاعدہ سے ذبح کیے ہوئے (گائے کے بچہ کے شکم کا رینٹ یا مصنوعی نباتی پاک و حلال رینٹ) کا استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر ہر پیکٹ و ڈبہ پر حرام یا حلال جیسے بھی رینٹ یا پیپسن سے تیار کیا گیا ہو وہ صاف صاف لکھا ہوا ہو تو جس پیکٹ یا ڈبہ پر حلال و جائز رینٹ لکھا ہوا اس کو بلاشبہ استعمال کر سکتے ہیں اور جس پیکٹ یا ڈبہ پر پیپسن یا کسی ناپاک چیز یا حرام رینٹ کی آمیزش لکھی ہوئی ہو اس کو قطعاً استعمال نہ کریں

تجارتی اصول کے ماتحت ذمہ دار اشخاص کے بیان پر اعتماد کیا جائے گا کیونکہ دنیوی اصول کے مطابق بھی تجارت کو سچائی اور دیانت سے ہی فروغ ہوتا ہے اس لئے بھی بغیر وجہ شرعی کے کسی کو جھوٹا، دغاباز سمجھنا یا کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ امید کہ اس تفصیل سے اطمینان ہو جائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

مفتی دار العلوم دیوبند $\frac{9}{91}$/۷ھ

الجواب صحیح

محمود غفرلہ

الجواب صحیح

سید احمد علی سعید۔ دار العلوم دیوبند

مدارس دینیہ کے مالی سرمایہ کے متعلق ایک فقیہانہ گفتگو

سوال (۱۵) مدارس عربیہ میں صدقاتِ واجبہ اور عطیات کی رقم جو جمع ہوتی ہے اس پر سال گذرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں، نیز یہ رقم معطی کی ملک سے خارج ہوتی ہے یا معطی کی ملک شمار ہوتی ہے، اس میں تین صورتیں متصور ہو سکتی ہیں:۔

(۱) اگر معطی کی ملک باقی ہو جیسا کہ امداد الفتاویٰ میں بھی لکھا ہے۔ لیکن اس پر مندرجہ ذیل اشکالات ہیں۔

(الف) حولانِ حول کے بعد عطیات کی رقوم پر زکوٰۃ فرض ہونی چاہیے، مگر اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟ جب کہ ان کے مالکوں کا کچھ علم نہیں، اس لئے کہ اولاً تو چندہ دینے والوں کی فہرست بہت طویل ہوتی ہے جن میں سے بیشتر کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ پھر چندہ کی رقم ایک جگہ جمع ہوتی ہے اور حسب موقع خرچ ہوتی رہتی ہے۔ اس صورت میں یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ اس میں سے کس شخص کی کتنی رقم ہے کسی شخص نے پچاس برس پہلے رقم دی تو اب تک اس کی بھی شرکت چلی آتی ہے اور آئندہ بھی یہ شرکت جاری رہے گی۔

(ب) چندہ دینے والوں میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو اس کے چندہ کی رقم اس کے ترکہ میں داخل ہوگی اس لئے ادار وصیت و قرض اور وارثوں کے حقوق اس سے متعلق ہوں گے، وارثوں میں مجنون اور نابالغ بھی ہو سکتے ہیں جو ابرار و تبرع کے اہل نہیں۔ پس اس رقم کو واپس کرنا فرض ہوگا۔ اور یہ نمبر الف کے وجوہ سے ناممکن ہے۔

۲۔ مہتمم طلبار کی طرف سے وکیل ہو اس میں مندرجہ ذیل قباحتیں ہیں۔

(۱) طلبہ ان رقوم کے مالک ہوں گے اس لئے جب وہ چاہیں مہتمم (وکیل) کو برطرف کر دیں۔ اور اپنی رقوم کا مطالبہ کر دیں۔

(۲) اگر کسی طالب علم کا انتقال ہو جائے تو اس کے ورثار اپنے حق کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

(۳) جب مدرسہ میں اتنی رقم جمع ہو جائے کہ ہر طالب علم کا حصہ بقدر نصاب پہنچ جائے تو مہتمم کے لئے اس سے مزید رقم وصول کرنا جائز نہ ہوگا بلکہ خود طالب علم پر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی۔

۳۔ رقوم چندہ کو بیت المال پر قیاس کر کے اگر یوں کہا جائے کہ یہ معطی کی ملک سے تو خارج ہوگئی مگر کسی کی ملک میں داخل نہیں ہوئی۔ لیکن بیت المال میں حاکم کی ولایت جبریہ عامہ ہوتی ہے، اور مہتمم کی وکالت اختیاریہ خاصہ ہے، اس لئے یہ قیاس مع الفارق معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح تسلیم کر لیا جائے تو مدز کوٰۃ میں تملیک ضروری نہ رہے گی۔

ازراہ کرم ان اشکالات کو رفع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب: ۔ پیش نظر مسئلہ کو احقر اس طرح سمجھے ہوئے ہے کہ مہتممین مدارس نہ تو محض معطین کے من کل الوجوہ وکیل ونائب ہوتے ہیں کہ نمبر ایک کی شق پر عائد شدہ اشکالات وارد ہوں اور نہ تو یہ مہتممین مدارس محض فی الحال داخل شدہ مستحق

طلباء کے وکیل و نائب ہوتے ہیں کہ نمبر دو میں درج شدہ اشکالات وارد ہوں۔

اور نہ تو یہ مہتممین مدارس من کل الوجوہ عمالِ بیت المال کے مثل ہوتے ہیں اور نہ مدارس میں داخل شدہ کل رقوم من کل الوجوہ رقوم بیت المال کے حکم میں ہوتی ہیں کہ ان پر نمبر تین میں درج شدہ اشکالات وارد ہوں۔

بلکہ صورت کچھ اور ہوتی ہے اور اس کے سمجھنے کے لئے پہلے ان داخل شدہ رقوم کی حیثیت و نوعیت معلوم و متعین کر لینا ضروری ہے۔ سو عرض ہے کہ مدارس میں عموماً تین قسم کی رقوم داخل ہوتی ہیں۔

رقوم نمبر (۱)۔ رقوم عطیات و ہدایا و صدقات نافلہ وغیرہ یعنی وہ رقوم جو واجب التملیک نہیں ہوتیں۔

رقوم نمبر (۲)۔ رقوم زکوٰۃ، فطرہ، نذر و کفارہ وغیرہ یعنی رقوم واجب التملیک

رقوم نمبر (۳)۔ وہ رقوم جس کو دینے والا کسی خاص کام کرنے کیلئے نامزد و متعین کر کے دیتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ اس رقم سے فلاں کمرہ بنوا لو، یا نل لگوا لو یا فلاں فرش بنوا لو وغیرہ وغیرہ

تفصیل حکم رقوم نمبر ۳۔

پس رقم نمبر تین یعنی وہ رقوم جس کو دینے والا کسی خاص کام کو کرنے کے لئے نامزد کر کے دیتا ہے مثلاً کوئی خاص کمرہ بنوانے کے لئے وغیرہ وغیرہ، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں مہتممین مدارس محض معطی کے وکیل و نائب ہوتے ہیں اور یہ رقم ملک معطی سے خارج نہیں ہوتی بلکہ جب تک یہ رقم موجود رہتی ہے بحکم امانت رہتی ہے اور معطی کو اختیار رہتا ہے کہ جب چاہے اس توکیل کو ختم کر دے اور اپنی رقم واپس لے لے اور جب حسب ہدایت معطی خرچ ہوتی ہے تو ملک معطی پر خرچ ہوتی ہے۔

غرض اس صورت میں محض معطی مالک رہتا ہے، پس مملوکیت کے تمام احکام مثلاً

حق تصرف للمعطی، اور بعد ممات معطی ترکہ و وراثت وغیرہ سب احکام) اس پر لاگو و نافذ ہوں گے۔ اور اسی وجہ سے اس قسم کی رقوم کو خلط و استہلاک سے بچانے کے لئے مدارس میں بالکل الگ الگ رکھنا اور ہدایت و منشاء معطی کے مطابق خرچ کرنا لازم رہتا ہے۔ اور اگر الگ الگ رکھنے میں دشواری ہو تو قرض کی صورت میں منتقل کرا لینا ضروری ہوتا ہے اور خلط و استہلاک کی صورت میں ضمان عائد ہوتا ہے وھذہ الاحکام کلھا ظاھرۃ وباھرۃ فی الفقہ۔

تفصیل حکم رقوم مد ۲۔

رقوم نمبر دو یعنی رقوم زکوٰۃ وغیرہ جو واجبۃ التملیک ہوتی ہیں، ان رقوم میں مہتممین مدارس اور (حسب ضابطۂ مدرسہ) ان کے نوّاب (مثلاً سفراء) معطی کے بھی من وجہٍ وکیل ہوتے ہیں، اس لئے قبضۂ مہتمم من کل الوجوہ قبضۂ مستحق نہیں ہوگا اور اسی وجہ سے تملیک طلباء یا تملیک مستحق زکوٰۃ ضروری رہتی ہے بغیر اس تملیک کے کسی دوسرے مصرف میں صرف کرنا جائز نہیں رہتا، اور خلط و استہلاک سے بچنے کے لئے ان رقوم کو غیر واجبۃ التملیک رقوم سے مستقل طور پر الگ رکھنا ضروری رہتا ہے

نیز ان رقوم میں یہ لوگ ان طلباء کے جو فی الحال مدرسہ میں موجود ہیں اور ان طلباء کے جو آئندہ داخل ہونے والے ہوں، یا ان مستحقین زکوٰۃ کے جو فی الحال مدرسہ میں موجود ہوں اور ان مستحقین زکوٰۃ کے جو آئندہ مدرسہ میں رہنے والے ہوں، اگرچہ یہ لوگ مجہول الذوات والکمیۃ ہوں، ان سب کے بھی وکیل و نائب ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ لوگ اگرچہ مجہول ہوں مگر ان کا نائب متعین و معلوم ہوتا ہے۔

اور اس جہت کے اعتبار سے چونکہ حق مستحق بھی متعلق ہو جاتا ہے، اس لئے ان رقوم کو دیدینے کے بعد معطین واپس بھی نہیں لے سکتے اور نہ ان رقوم پر حولان حول کے بعد پھر کبھی زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ مقدار کثیر ہونے پر مزید وصولی کو ناجائز کہہ سکیں گے

اور نہ کوئی مستحق زکوٰۃ غنی قرار پائے گا، اور نہ وہ اشکالات عائد ہوں گے جو سوال میں مذکور ہیں۔

اس جواب کی فی الجملہ تائید حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نوراللہ مرقدہ کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے جو فتاویٰ اشرفیہ موسوم بہ فتاوی امدادیہ ص۱۳۱ ج۲ قدیم مذکور ہے اور وہ یہ ہے۔

"عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں مگر اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال کے معطین اور آخذین ہر دو کی طرف سے وکلار ہیں، لہذا نہ اس میں زکوٰۃ ہوگی اور نہ معطین واپس لے سکتے ہیں" ۱۲ انتہی بلفظہ

ایک شبہہ کا ازالہ۔

مستحقین وطلبار میں یہ توسیع وتعمیم اس لئے ہوگی کہ مدارس دینیہ عربیہ محض سال چھ ماہ کے لئے قائم نہیں کئے جاتے بلکہ رہتی دنیا تک کے لئے بغرض احیار دین وتعلیم دین قائم ہوتے ہیں۔ کما ہو مقتضا جمیع الاوقاف کالمساجد والسباطات وغیرھا۔

اور مدارس میں ان رقوم کے دینے والے بھی اسی نیت وتصور سے دیتے ہیں لہذا رہتی دنیا تک کے مستحقین زکوٰۃ فی الجملہ ضمناً وتبعاً متصور ومنوی ہوجائیں گے اور یہ استحقاق ان کے مجہول الذوات والکمیۃ ہونے کے باوجود ان سے متعلق ہوجائے گا۔

پھر معطین بھی متعدد طرح کے ہوتے ہیں، بعض تو طلبہ پر خرچ کی تصریح کے ساتھ دیتے ہیں اور بعض بغیر اس تخصیص کے دیتے ہیں بلکہ بعض تو یہ کہکر دیتے ہیں کہ مثلاً، یہ زکوٰۃ کا روپیہ ہے ہم مدرسہ کے کام کے لئے دیتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے دیتے ہیں کہ اس مدرسہ میں فی الحال طلبار نادار کو کھانا کپڑا نہیں ملتا۔ پس اس جملہ کی تصحیح و

شرعی توجیہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ تملیک شرعی کے ذریعہ اس رقم سے مدرسہ کا کام کیا جائے اور جب مدرسہ میں طلباء نادار نہ ہوں تو لامحالہ کسی بھی مستحق زکوٰۃ سے تملیک کرا کر ہی مصرف مدرسہ میں یہ رقم صرف ہو سکے گی۔ اور عاقل بالغ کے کلام کا محمل حسن پر مہما امکن حمل کرنا بھی ضروری ہوتا ہی ہے۔ پس اگر معطی نے یہ کہکر دیا ہے کہ یہ رقم ضروریات طلباء پر خرچ کے لئے ہے تو اس پر تملیک طلباء ملحوظ رہنا ضروری ہوگا اور اگر مطلقاً بلا لحاظ تعیین طلباء دی ہے تو مدرسہ کے کسی بھی مستحق زکوٰۃ سے بلا تکلف تملیک کرا لینا کافی ہوگا بلکہ ایسی صورت میں اگر کسی ملازم مدرسہ کو جو مستحق زکوٰۃ و نادار ہو اور مصلحت شرعی بھی ہو تو اراکین مدرسہ کے مشورہ سے اجرت و تنخواہ قرار دیئے بغیر محض بطور صدقہ کے اس رقم سے اس کی کچھ مدد کر دینا بھی جائز رہے گا اس لئے مصرف کی ان دونوں شقوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی رقوم کو بھی الگ الگ رکھنا بہتر ہوگا تاکہ وہ رقوم بوجہ اتم معطی کی ہدایت و منشاء کے مطابق صرف ہو سکیں۔

تفصیل حکم رقوم ۱ -

رقوم نمبر ایک یعنی رقوم عطیات وغیرہ جو غیر واجب التملیک ہوتی ہیں، ان رقوم کے بارے میں بھی مہتممین مدرسہ اور ان کے نوآب (مثلاً سفراء) وکیل و نائب ہوتے ہیں۔ البتہ اس کی نوعیت و احکام میں کچھ فرق ہوتا ہے مثلاً رقوم نمبر دو (واجب التملیک رقوم) میں یہ شرط نہیں ہوتی۔ لیکن ارباب حل و عقد کے مشورہ سے خرچ کا جو ضابطہ حدود شرع میں رہتے ہوئے مقرر و متعین ہوتا ہے صرف اس ضابطہ کے ماتحت خرچ کرنا ضروری رہتا ہے۔ اور اگر ارباب حل و عقد نہ ہوں، یا ہوں مگر کسی خرچ کے بارے میں کوئی واضح ضابطہ نہ ملے تو ادارہ کے سابق اہل علم و دیانت ذمہ داروں کا معمول واجب الاتباع رہتا ہے، اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو تو دیگر ایسے

ہی مدارس اور اداروں کا معمول دیکھا جائے گا اور ان کی متابعت کی جائے گی مہتمم یا عملۂ مدرسہ خودرائی نہیں کر سکتے۔ کما ھو ظاہر وبا ھی من فتوی الاکابر اور مثلاً رقوم نمبر دو میں مہتممین مدارس اولاً صرف معطیین و آخذین کے وکیل ونائب ہوتے ہیں پھر بعد تملیک شرعی تمام مسلمانوں کے یا ارباب حل وعقد کے وکیل ونائب ہوتے ہیں اور رقوم نمبر ایک میں شروع سے ہی تمام مسلمانوں کے یا ارباب حل وعقد کے وکیل ونائب ہوتے ہیں، اس لئے کہ یہ مہتممین ارباب حل وعقد کے انتخاب سے یا اگر ارباب حل وعقد نہ ہوں تو جس خطہ کا یہ مدرسہ ہے اس خطہ کے باا ثر سمجھدار و ذمہ دار مسلمانوں کے انتخاب سے مسلمانوں کے امیر ونائب یا نمائندہ ہوتے ہیں اور سلطان کے ایک خاص وصف (انتظام امور شرعیہ عامۃ للمسلمین) میں سلطان کے قائم مقام ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ جب ارباب حل وعقد کے اتفاق یا تراضی مسلمین سے نصب سلطان وابستہ ہے کما ھو مبرھن فی مقامہ تو پھر اس کے قائم مقام کا نصب کیوں نہ ان سے وابستہ ہوگا ضرور ہوگا۔

ایک شبہہ کا ازالہ:-

اور قوت قہریہ کے فقدان سے اس نیابت کے اقامت وتحقق میں شبہ نہ کیا جائے، اس لئے کہ سلطان میں دو وصف ہوتے ہیں، ایک وصف (حکومت وسلطنت) جس کا ثمرہ سد ثغور وتنفیذ حدود وقصاص وغیرہ اعمال ہیں اور اس میں قوت قہریہ شرط ہے، اس میں تو کوئی بغیر اس قوت کے قائم مقام نہیں ہو سکتا ہے۔ دوسرا وصف سلطان کا وہ ہے جس میں انجام دہی امور عامہ کے لئے قوت قہریہ شرط نہیں ہوتی جیسے انتظام اقامت جمعہ واعیاد، اور جیسے مسلمانوں کے بہت سے مذہبی امور خواہ معاشی ہوں یا معیشتی ہوں یا معاشرتی ہوں، جن کو مسلمانوں میں بغیر قوت قہریہ کے بھی محض آپس کی مصالحت ورضامندی سے یا بطور ثالثی کے منظم ودرست

کیا جا سکتا ہو، مثلاً نکاح، طلاق، خلع، فسخ، وقف، وصیت، وراثت، شرکت وغیرہ وغیرہ ان سب امور کا انتظام۔

اسی وصف کو حضرت محدث سہارنپوری نے نظم حقوق عامہ سے تعبیر فرمایا ہے کمافی امداد الفتاوی ص ۲۱۹/۴۶۔ اس وصف میں نیابت ہو سکتی ہے اور یہ مالی انتظام مدارس اسی قبیل سے ہے، بغیر قوت قہریہ کے بھی محض آپس کی مصالحت و رضامندی سے بھی قائم و درست ہو سکتا ہے، لہٰذا قوت قہریہ کے فقدان سے اس نیابت (مالی انتظام مدارس) کے اقامت و تحقق میں فتور واقع نہ ہوگا، جیسا اقامت جمعہ و اعیاد کے انتظام میں یہ نیابت امیر تسلیم و رائج ہے اور اسی پر وجوب جمعہ و اعیاد وغیرہ ہمارے ملک میں دائر ہے۔

پھر جب یہ انتظام حقوق عامہ دنیوی امور سے بھی متعلق ہو سکتا ہے اور اس کے درست و منتظم رکھنے میں یہ نیابت سلطان جائز ہو سکتی ہے تو مالی امداد مدارس جو خالص امر دینی درست و منتظم کرنے کے لئے ہے (یعنی احیاء دین و احیاء علم دین اور اس کے ابقاء و تحفظ کے لئے ہے اور جو سب سے مقدم فریضہ ہے اور اہم الواجبات میں سے ہے) اس میں یہ نیابت کیوں جائز و درست نہ ہوگی، بدرجہ اولیٰ جائز و درست ہوگی بالخصوص جب کہ یہ مالی انتظام مدارس ملاک اور مستحقین کے رضاء و رغبت سے بھی ہو۔

اور جب مہتمم مدرسہ سلطان کے وصف ثانی (جس کا حاصل انتظام امور شرعیہ عامہ للمسلمین ہے) میں سلطان کا قائم مقام ہوگا تو عملہ مدرسہ، عمال بیت المال کے مثل ہوں گے، اور یہ رقوم قسم ثانی کی (رقوم غیر واجب التملیک) جب برضاء و رغبت من جانب ملاک داخل ہوں گی تو یہ رقوم بیت المال کے مثل ہو جائیں گی۔ اور اگرچہ یہ رقوم وقف شمار نہ ہوں گی مگر بحق مدرسہ محبوس ضرور ہو جائیں گی، اس لئے کہ بغیر

اس حبس کے یہ انتظام امر دینی کا فی زمانہ قائم و منتظم نہیں ہو سکتا، حالانکہ اس کا قائم و منتظم رکھنا سب پر حسب استطاعت واجب ہے اور واجب کا ذریعہ بھی واجب ہوتا ہے۔ اس لئے یہ حبس بھی واجب ہوگا۔

اور چونکہ رہتی دنیا تک کے لئے یہ نظم قائم و منتظم ہوتا ہے جیسا کہ ہم پہلے (نمبر دو کے جواب میں) کہہ آئے ہیں، اس لئے ان رقوم کو واپس لینے کا بھی حق کسی کو نہ ہوگا، خود معطیین کو بھی حق نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس سے حبس واجب میں جو مقصود اوّلی ہے فتور واقع ہو جانے کا خطرہ بدرجہ ظن غالب متصور ہے۔

اسی طرح ان رقوم کا فی الحال بمقدار کثیر جمع ہو جانے کے بعد مزید رقوم کا استحصال بھی ممنوع نہ ہوگا، اس لئے کہ جب یہ نظم رہتی دنیا تک کے لئے واجب ہے تو آئندہ ان رقوم کثیرہ کے مصرف کا وجود بدرجہ غالب مظنون ہے۔

اسی طرح حولانِ حول پر ان رقوم میں زکوٰۃ بھی واجب نہ ہوگی، اس لئے کہ بیت المال کی رقوم کا یہی حکم ہے۔ نیز اس لئے کہ اس حبس دائمی کی وجہ سے ملّاک کا تصرف مالکانہ منقطع ہو جاتا ہے اور وجوب زکوٰۃ کا حکم اسی قبیل سے ہے لہٰذا وہ بھی منقطع ہو جائیگا

اسی طرح ولایت عامہ جبریہ سے بھی اشکال نہ ہوگا کیونکہ ولایت عامہ جبریہ سلطان کے وصف اول یعنی حکومت (جس کا ثمرہ سد ثغور، قوت تنفیذ وغیرہ ہوتا ہے) سے متعلق ہے اور یہ نیابت (مالی انتظام مدارس) محض وصف ثانی (انتظام حقوق عامہ) سے متعلق ہے، اور یہ دونوں دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ کما مر آنفاً۔ فافترقا ولا منافاۃ ولا تضاد بینھما۔

ھذا ما عندی من الشرع الشریف فان کان خطاء فمن نفسی وان کان صوابا وحقا فمن اللہ وعلیہ التکلان وھو الموفق

للسداد والصواب۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ الاحقر نظام الدین عفی عنہ

مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۱/۹/۹۶ھ

قبرستان میں عورتوں کی آمد و رفت
اسلام میں غلاموں کی حیثیت

سوال (۱۶) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین۔ عرض خدمت ہے کہ یہاں وہلم گرس انگریزی اسکول میں ایک مسلمان ٹیچر تھیں جو ایک مسلمان برگیڈیر کی بیوی تھیں۔ ان کا انتقال مورخہ ۵ راکتوبر ۱۹۷۶ء کو ہوگیا۔ ان کی لڑکی امریکہ میں تھی اور کچھ دوست احباب بھی باہر تھے۔ کل مورخہ ۹ راکتوبر کو پرنسپل وہلم گرس اسکول میں شری وستوا، ان کی لڑکی اور کچھ انگریز عورتیں یعنی ہندو مسلم عیسائی کے اونچے خاندان کی عورتیں ان کی قبر پر پھول چڑھانے گئیں تو انھیں یہ کہکر قبرستان میں نہیں جانے دیا کہ عورتوں کا قبرستان میں جانا منع ہے۔ ان کی امریکہ سے آئی لڑکی کو بہت افسوس ہوا اور بڑی ناامیدی کی حالت میں سب کو جانا پڑا۔ اور بڑی عجیب قسم کی باتیں اسلام کے خلاف کہیں اور سوال کیا کہ ایسا حکم کس وجہ ہے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے لکھیں کہ عورتیں قبرستان میں کیوں نہیں جاسکتیں؟ خلاصہ اور سمجھا کر لکھیں۔

دوسرے یہ کہ شوہر و بیوی کا رشتہ زندگی میں بہت عزیز ہوتا ہے اور دنیا میں ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں، مگر جب بیوی مرجاتی ہے اور اسے دنیا کی آخری منزل پر بھی قبرستان لے جانے کی تیاری کرتے ہیں، قبرستان لے جاتے ہیں، قبر میں اتارتے ہیں مگر اس کے شوہر کو چھونے تک نہیں دیتے منھ نہیں دکھاتے، آخری منزل قبر تک لے جانے میں کندھا بھی نہیں لگانے دیتے، ایسا کیوں؟ پوری تفصیل سے لکھیں، مشکور رہوں گا۔

ہیں اور میری بیوی دو ہی ہیں، اگر میں مرجاتا ہوں تو میری قبر کی کون دیکھ بھال کرے گا۔ مرنے کے بعد میری قبر پر کوئی بھی آنے جانے والا نہ ہوگا، کچھ عجیب سا معاملہ ہے۔ مجھے سمجھا کر لکھیں۔

تیسرے قرآن مجید میں غلاموں کے حقوق ہیں اور غلاموں کو آزاد کرنے کے بارے میں بھی ہے، کسی بھی خوشی کے موقعہ پر یا کفارہ دینے کے موقعہ پر غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم ہے، غلام آزاد ہونے پر یا بیچے جانے پر دوسری جگہ جا سکتا ہے، ویسے کسی بھی حالت میں اپنے مالک کی بلا رضامندی کے نہیں جا سکتا۔

پچھلی دنیا سے ابھی تک بہت کم آقا ہوں گے جو غلام کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرتے ہوں گے، ورنہ عام طور سے غلام کی کوئی عزت نہیں ہوتی تھی، اور اسے بڑی مجبوری اور سختی کی زندگی گذارنا پڑتی تھی۔

انسان کے لئے یہ غلام اور لونڈی جس کے ساتھ ہمبستر بھی ہو سکتے تھے کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ اسلام میں انسان انسان کو لونڈی غلام بنا رکھے۔ ایسا غلام، لونڈی رکھنے کے بجائے اگر حکم ہوتا کہ کوئی غلام اور لونڈی نہیں ہوگا، سب کو آزاد کر دیا جائے تو بہت خوبصورت ہوتا، ویسے خدا کا حکم ہے شاید کوئی خاص بات ہو۔ آپ اس خاص بات سے میری جانکاری کرائیں، بے حد ممنون ہوں گا۔

خاص عرض یہ ہے کہ میرے خط کا جواب ضرور دیں، بڑی بے قراری سے جواب کا منتظر رہوں گا۔ مندرجہ بالا باتوں کی میرے دل پر بہت گہری چوٹ ہے، اگر آپ کا جواب نہ آیا تو یہ چوٹ ہمیشہ کے لئے ناسور بن جائے گی۔

الجواب:- (۱) عورتیں اگر قبرستان میں پردہ کے ساتھ جائیں اور وہاں جاکر کفر و شرک کی کوئی بات نہ کریں بلکہ کچھ آیات پڑھ کر ایصال ثواب کر دیں اور میت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعاء مغفرت کر دیں اور قبر کو بوسہ یا سجدہ یا پھول وغیرہ نہ چڑھائیں

تو اس صورت میں عورتوں کا بھی قبرستان میں جانا منع نہیں ہے، جو لوگ عورتوں کو قبرستان میں جانے سے روکتے ہیں وہ انھیں شرعی خرابیوں میں مبتلا ہو جانے کے خطرے سے روکتے ہیں، اور یہاں تو پھول چڑھانا ہی مقصد بتایا گیا ہے، ممکن ہے کہ اسی وجہ سے روک دیا ہو، کیونکہ یہ شرک کا فعل ہے۔

۲۔ شوہر بھی اپنی بیوی کا جنازہ قبرستان تک لے جا سکتا ہے قبر میں اتار سکتا ہے کفن کے اوپر سے چھو سکتا ہے، چہرہ بھی دیکھ سکتا ہے، البتہ تنہائی میں ایک جا نہ ہونے دیا جائے، خطرہ ہے کہ کہیں فرط محبت سے چمٹ جائے یا بوس وکنار وغیرہ کوئی فعل ناکردنی نہ کر بیٹھے۔ اور جہاں بھرے مجمع میں اس کا خطرہ ہو گا وہاں بھرے مجمع میں بھی روک سکتے ہیں۔ مگر یہ حکم محض ایک عارض کی وجہ سے ہے اور عارضی وقتی ہو گا نہ کہ عام حکم۔ ناواقفیت کی وجہ سے لوگوں نے اسی کو عام حکم سمجھ رکھا ہے اور مطلقاً روک دیا ہے۔ اس لکھنے سے آپ کا اشکال رفع ہو گیا ہو گا کہ عورتیں بھی اوپر لکھی ہوئی شرائط وقیود کے ساتھ جا سکتے ہیں کوئی ممانعت نہ ہوگی، حدیث شریف میں ہے:۔

انی نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا فانھا تذکر ھاذم اللذات الموت۔	میں نے تم لوگوں کو زیارت قبور سے منع کیا تھا، اب اجازت دیتا ہوں، اب تم لوگ زیارت قبور کیا کرو، اس لئے کہ یہ لذات و خواہشات دنیوی کو توڑنے والی چیز (موت) کو یاد دلاتی ہے۔

اس حدیث میں خطاب مردوں اور عورتوں دونوں کو ہے اور اجازت دونوں کو ہے۔ اور آداب زیارت وہی (دعائے مغفرت وایصال ثواب وحصول عبرت ویاد آخرت وغیرہ) بتائے گئے جس کا کچھ ذکر اوپر احقر نے بھی کر دیا ہے۔

۳۔ جناب کے سامنے غلاموں کے سلسلے میں صحیح حالات نہیں پیش کئے گئے

اس لئے جناب کے ذہن میں یہ اشکالات پیدا ہو گئے ورنہ جناب تو تعلیم یافتہ اور سمجھدار لوگوں میں سے ہیں اور اونچے طبقہ کے افراد میں سے ہیں، اگر صحیح تاریخ سامنے لائی گئی ہوتی اور جو حقوق و مراعات شریعت اسلامیہ نے غلاموں کو دی ہیں اور امت نے جو سلوک ان کے ساتھ کیا ہے وہ صحیح طور پر جناب کے سامنے لائے گئے ہوتے تو جناب کو ہرگز یہ اشکالات نہ ہوتے۔

صحیح حقیقت واضح ہونے کے لئے چند باتیں پہلے ذکر کر دینا ضروری ہیں۔

(الف) غلام کب بنائے جاتے تھے، اور کیوں بنائے جاتے تھے۔ اور اس سے مقصد کیا ہوتا تھا۔

(ب) شریعت اسلامیہ نے غلاموں کے بارے میں کیا احکام نافذ کئے اور ان کو کیا حقوق و مراعات دیں۔

(ج) امت محمدیہ نے ان کے ساتھ کیا سلوک کئے اور ان کے حقوق و مراعات کی کہاں تک رعایت کی۔ ان تینوں عنوانوں پر تفصیل سے لکھنے کے لئے تو کئی جلدوں کی ضخیم کتاب درکار ہے مگر چونکہ اتنی فرصت نہیں۔ نیز آنجناب تو ماشاء اللہ خود ذہین اور ذی علم ہیں، انشاء اللہ چند اشارات بھی کافی ہوں گے۔ اگر تفصیل کا شوق ہوگا تو سیر و تاریخ کی معتبر کتب سے ان اشارات کی خود تصدیق بھی ہو جائیگی اس سلسلے میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی کتاب "الرق فی الاسلام" اردو میں ہے اس کو بھی دیکھ لیں تو بہت کچھ معلومات حاصل ہو جائیں گی۔

(الف) جب خالق کائنات کا تعارف کرانے اور اس کا کلمہ (کلمۂ توحید) دنیا والوں تک پہنچانے کے لئے اللہ کے کچھ سچے بندے (جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بنفس نفیس یا آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کسی قوم یا کسی ملک تک پہنچتے اور خالق کائنات کے باغی ان سے ٹکر لیتے اور قتل و قتال پر آمادہ ہو جاتے تو حق تو یہ تھا کہ جو

گرفتار ہوتا ان کو بھی تہ تیغ کر دیا جاتا مگر رحمت خداوندی نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ چنانچہ اسلام کا حکم یہ ہے کہ صرف ان لوگوں کا قتل کر دینا درگذر کیا جائے گا جو میدان کارزار میں برسرپیکار ہو کر قتل ہو جائیں یا اسی قسم کے کسی اور جرم کے مرتکب ہو کر مستحق قتل ہو جائیں۔

عام قتل کو اسلام نے کبھی بھی روا نہیں رکھا اور نہ کبھی اس کی اجازت دی، لہذا جو لوگ میدان کارزار میں اپنے خالق و مالک سے بغاوت کرتے ہوئے پکڑے جاتے تھے۔ ان کو قتل نہیں کیا گیا۔

اب اگر ان سب کو جیل میں ڈال دیا جاتا تو اول تو ان کے اندر اور عناد و بغض کی آگ بھڑکتی، دوسرے بلاوجہ اس کا بار حکومت پر پڑتا اور وہ مقصد بھی حاصل نہ ہوتا جو اللہ کو منظور تھا اور جس کا امت مسلمہ کو حکم تھا کہ اللہ کے ناواقف بندوں کو ہمدردی و بہی خواہی کے انداز میں اللہ سے واقف کراؤ، تلقین ایمان کرو، تعلیمات اسلام پہنچاؤ، کیونکہ اس میں سب سے بڑا مانع بغض و عناد ہے جو محبوسیت اور جیل کی زندگی کے تصور ہی سے قریب قریب لازم ہو جاتا ہے اور اگر بغیر کسی سزا و تنبیہ کے بالکل چھوڑ دیا جاتا تو ان کی شرارت و بغاوت اور بڑھ جاتی اور ایسی بڑھتی کہ قابو سے بھی باہر ہو جاتی، اس لئے اسلام نے ایک تیسری صورت اختیار کی کہ ان قیدیوں کو مجاہدین پر تقسیم کر دیا جائے اور حکم یہ دیدیا کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرو، جو خود کھاؤ ان کو بھی کھلاؤ، جو خود پہنو ان کو بھی پہناؤ، بالکل اولاد اور بھائی جیسا معاملہ کرو، اور ہمدردی و بہی خواہی کے انداز میں تلقین ایمان کرو، اسلامی تعلیمات و اخلاق سے خوگر بناؤ، ان کے ہر دکھ درد میں شریک رہو، ان کی ہر راحت و آرام کا خیال رکھو، ان کی طاقت سے زیادہ ہرگز ان پر کسی چیز کا بار نہ ڈالو وغیرہ وغیرہ جیسا کہ ہم خود (ب) کے جواب میں بھی کچھ تفصیل سے عرض کریں گے، یہی وجوہ تھیں کہ

غلام بھی مثل اولاد و زیر تربیت لوگوں کے اپنے آقا و مربی کی اجازت کے بغیر کہیں جاتے آتے نہیں تھے اور خود رائی وغیرہ نہیں کرتے تھے۔ اسی چیز کو آپ کے سامنے اس قدر بھیانک انداز میں پیش کیا گیا جس سے آپ کو وحشت ہونے لگی، جیسا کہ سوال کی عبارت سے مفہوم ہوتا ہے۔ ورنہ غلاموں کا اپنے آقا کی اجازت و مرضی سے تجارت کرنا، کاروبار کرنا اور بڑے بڑے سفر کرنا سب کتابوں میں منقول ہیں۔

غرض اس طرح سے تبلیغ اسلام، جو اسلام کا اصل مقصد (اعلاء کلمۃ اللہ) تھا وہ بھی مکمل طور پر پورا ہوگا، اور پہلی دوسری صورت میں جو مضر اور بھیانک خطرہ تھا وہ بھی پیدا نہ ہوگا۔ چنانچہ جب یہ خطرات ختم ہو گئے تو بجائے غلام بنانے کے بڑی بڑی تعداد فوراً رہا کر دی گئی جیسا کہ غزوہ حنین میں چھ ہزار نفر جو قتال کرتے ہوئے گرفتار ہوئے تھے بہ یک قلم رہا کر دیئے گئے (دیکھو "الرق فی الاسلام" وغیرہ)

اسی طرح غزوہ تبوک و فتح مکہ وغیرہ کے اندر بھی ہوا، بلکہ فتح مکہ میں تو یہاں تک اعلان عام کر دیا گیا تھا کہ جو شخص فلاں کی پناہ میں آجائے گا وہ مامون و آزاد اور جو شخص فلاں کے گھر میں پناہ گزیں ہوگا وہ بھی آزاد و مامون وغیرہ وغیرہ، اور ایسا ہی کیا بھی گیا، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔

اتنے بیان سے یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کب غلام بناتا تھا اور کیوں بناتا تھا اور اس سے اصل مقصد کیا تھا۔

(ب) بیان بالا سے بھی اجمالاً معلوم ہو گیا کہ اسلام نے غلاموں کے بارے میں کیا کیا احکام نافذ کئے اور ان کو کیا کیا حقوق و مراعات دیں۔ لیکن مزید توضیح و توثیق کے لئے کچھ آیات و احادیث بھی پیش کر دی جاتی ہیں جن سے انشاء اللہ یہ بات اور بھی کھل کر سامنے آجائے گی۔

(۱) اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ۔ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت عملی اور

والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن (قرآن پاک)

اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ، اور اگر مجادلہ ہی کرنا پڑ جائے تو) ان سے نہایت خوبصورت انداز میں اور نہایت مستحسن طریقہ سے مجادلہ کرو۔

(۲) (انهم) اخوانکم جعلهم الله تحت ایدیکم فمن جعل الله اخاه تحت یدیه فلیطعمه مما یاکل ولیلبسه مما یلبس ولا یکلفه من العمل ما یغلبه (بخاری۔ مسلم)

وہ لوگ (یعنی غلام) تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ نے ان کو تمہارے قبضہ میں دے رکھا ہے پس جس کے قبضہ میں اللہ نے اس کے بھائی کو دے رکھا ہو، اس پر لازم ہے کہ جو خود کھائے وہی اس کو بھی کھلائے جو خود پہنے اس کو بھی پہنائے اور اس پر اس کی قوت سے زیادہ بار نہ ڈالے۔

(۳) عن عبد الله بن عمرو جاءه قهرمان له فقال له اعطیت الرقیق قوتهم قال لا قال انطلق فاعطهم فان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال کفی بالرجل اثما ان یحبس عمن یملک قوته (مشکوٰة ص۲۹۱)

حضرت عبداللہ بن عمرو کے پاس ان کا ایک کارپرداز آیا (آتے ہی) اس سے پوچھا کہ غلام کو اس کی ضروریات دیدی؟ انھوں نے جواب دیا ابھی نہیں، تو فرمایا جاؤ پہلے اس کو دے کر آؤ، اس لئے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک انسان کے گنہگار ہونے کیلئے اتنا بھی بہت ہے کہ جو لوگ اس کے قبضہ اور ملک میں ہوں ان کی ضروریات کو روک لے یا تنگی میں ڈال دے۔

(۴) ان رجلا مات و لم یدع وارثا الا غلاما

ایک شخص کا انتقال ہوا۔ اور اس نے اپنے پسماندگان میں سوائے ایک غلام کے

كان اعتقه فقال النبي صلى الله عليه وسلم هل له احد قالوا لا الا غلام له كان اعتقه فجعل ميراثه له

(ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجه)

(۵) من ضرب غلاما له حدا لم ياته او لطمه فان كفارته ان يعتقه (مسلم)

(۶) انه عليه السلام كان يقول في مرضه الصلوٰة وما ملكت ايمانكم

(ابوداؤد)

(۷) من ملك ذا رحم محرم فهو حر

(ترمذی۔ ابن ماجه)

(۸) من اعتق رقبة مسلمة اعتق الله بكل عضو منه عضوا من النار حتى فرجه بفرجه (بخاری۔ مسلم)

(۹) من اعتق شقصا في عبد اعتق

جس کو وہ آزاد کر چکا تھا۔ نہیں چھوڑا تھا، (اس کی وراثت و ترکہ کا تذکرہ ہوا) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ آیا کوئی اس کے پسماندگان میں ہے، جواب ملا کہ کوئی نہیں سوا ایک غلام کے جس کو وہ آزاد کر چکا ہے تو آپ نے اس شخص کی میراث اس غلام کو دلادی۔

جو شخص اپنے غلام کو بلا وجہ مارے اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کر دے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مرضِ وفات میں نماز کے اہتمام کا اور غلاموں کے حقوق کی رعایت کی تاکید کا زیادہ تذکرہ فرماتے تھے۔

جو شخص اپنے کسی محرم رشتہ دار کا مالک (کسی وجہ سے بھی) ہو جائے تو وہ اس پر (از خود) آزاد شمار ہو جائے گا۔

جو شخص ایک مسلمان غلام آزاد کر دے گا اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس غلام کے ہر ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے کے ہر ہر عضو کو جہنم کی آگ سے آزاد کردیں گے۔

جو شخص (مشترک غلام میں سے) اگرچہ صرف اپنا حصہ آزاد کر دے گا جب بھی بقیہ حصہ آزاد

کلہ ان کان لہ مال وان لم یکن لہ مال استسعی العبد غیر مشقوق علیہ۔ (بخاری۔مسلم)

ہو کر پورا غلام آزاد ہو جائے گا۔ اگر آزاد کرنے والا مالدار ہے ورنہ بقیہ حصہ کے بارے میں غلام کو مکاتب بنا کر اس سے مناسب تجارت وغیرہ کرا کر بقیہ کا معاوضہ اس کے غریب آقا کو دلا کر آزاد کر دیا جائے اور غلام پر اس کی قوت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔

(۱۰) من اعتق نفسا مسلمۃ کانت فدیتہ من جھنم (شرح السنۃ)

مسلمان غلام کا آزاد کر دینا عذاب جہنم کا فدیہ ہے اور عوض میں عذاب جہنم سے چھٹکارا ہے۔

(۱۱) اذا ولدت امۃ الرجل منہ فھی معتقۃ عن دبر او بعدہ (مشکوٰۃ ص۲۹۵)

جس باندی کو اس کے آقا سے بچہ پیدا ہو جائے تو وہ باندی آقا کے انتقال ہوتے ہی خود بخود آزاد شمار ہو گی (اور کبھی فروخت نہیں ہو سکتی)

(۱۲) ان امی ھلکت فھل ینفعھا ان اعتق فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعم (مالک)

ایک عورت نے دربار رسالت میں عرض کیا کہ میری ماں کا انتقال ہو گیا اگر میں اس کے ثواب کی نیت سے غلام آزاد کروں تو اس کا ثواب میری ماں کو ملے گا۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں ضرور ملے گا۔

ان احادیث پاک سے بھی آپ کو انشاء اللہ اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ اسلام نے غلاموں کے بارے میں کیا کیا احکام نافذ کئے اور ان کو کیا کیا حقوق و مراعات عطا کیں اور ان کو آزاد کرنے کی کتنی ترغیبیں دیں بلکہ ان کے خود بخود آزاد ہو جانے کے کتنے راستے کھول دیئے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام سے مذاقاً بھی

کہدے کہ تو آزاد ہے تو وہ شرعاً واقعی آزاد شمار ہو جاتا ہے اور غلامی سے نکل جاتا ہے۔ اور ان سب صورتوں میں کیا کیا حکمتیں تھیں اور ہوں گی، ان باتوں کی طرف بھی احادیث بالا میں اشارہ ہے۔

بلکہ حدیث ۶۲ سے تو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آقا و مملوک ہونے کا رشتہ تو مثل نسب کے رشتہ کے ہو جاتا ہے حتیٰ کہ حقوق وراثت میں بھی ایک درجہ ان کو (نسبی رشتہ کے بعد) دیدیا گیا ہے، جیسا کہ بعض روایات میں وارد ہے الولاء لحمۃ کلحمۃ النسب یعنی عتاقہ (آزاد کرنے کا) رشتہ مثل نسب کے رشتہ کے ہے، اور اس رشتہ کے ذریعہ حقوق وراثت کی تفصیل کتب فقہ میں بھری پڑی ہے۔

(ج) رہ گیا یہ سوال کہ امت محمدیہ نے غلاموں کے ساتھ کیا سلوک کئے ان کے حقوق و مراعات کی جو ان کو دربار رسالت سے ملے تھے کہاں تک رعایت کی۔

اس سلسلہ میں پہلے یہ عرض کرنا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جو غلام مسلمان ہو جاتا اس کی منھ مانگی قیمت دے کر بھی صحابہؓ خرید کر آزاد کر دیتے حالانکہ وہ دور مسلمانوں کے مالی فارغ البالی اور ثروت کا دور نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی دولت کا بڑا حصہ اس میں صرف کر دیا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے صحابہؓ کے باوجود عسرت کے متعدد کارنامے اس بارے میں منقول ہیں۔ پھر جب اللہ نے صحابہ کو مالی فروغ بخشا تو عام صحابہ کرامؓ میں یہ بھی وطیرہ عام ہو گیا تھا، یہاں تک کہ دور صحابہ ختم ہوتے ہوتے ایک لاکھ سے زائد غلام آزاد کئے گئے، تاریخ کامل وغیرہ کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے۔

پھر صحابہ ہی تک یہ طریقہ محدود نہیں رہا بلکہ دور تابعین و تبع تابعین میں

بھی یہ طریقہ ودستور عام تھا، بے شمار غلام طرح طرح کے بہانوں سے جیساکہ اوپر روایات میں مذکور ہے آزاد ہوئے۔ اور یہی نہیں بلکہ بسااوقات آزاد غلاموں کے ساتھ ایسا معاملہ وسلوک کرتے جو اپنے گھروخاندان کے ایک فرد کے ساتھ کرتے ہیں۔ چنانچہ ان سب زمانوں میں غلاموں کی بڑی تعداد عالم، محدّث، مفسر، فقیہ اور وقت کے مشائخ کبار میں سے اور قوم کے مقتدا بھی ہوئے اور حکومت کے ہر شعبہ کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔

چنانچہ حضرت عمار ابن یاسرؓ جو آزاد کردہ غلام تھے خود بہت بڑے عالم وفقیہ تھے اور کوفہ کے امام نماز اور کپتان تھے، اور حضرت ابوحذیفہؓ کے حضرت سالمؓ بھی بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے اور امامت کے لئے آگے بڑھائے جاتے تھے، اور بڑے بڑے صحابہؓ (مہاجرین اولین وخلفاء راشدین بھی) ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے۔ اور عطاء ابن ابی رباح مکہ کے حاکم اعلیٰ اور گورنر تھے۔ طاؤس ابن کیسان یمن کے سردار اور حاکم اعلیٰ تھے۔ یزید ابن حبیب مصر کے حاکم اعلیٰ اور گورنر تھے۔ مکحول دمشقی شام کے سردار وحکمران اعلیٰ تھے۔ میمون ابن مہران اہل جزائر کے حاکم اعلیٰ وسردار تھے۔ ضحاک ابن مزاحم اہل حرم کے سردار وحاکم اعلیٰ تھے۔ حسن ابن ابی الحسن بصرہ کے سردار وحاکم اعلیٰ تھے۔ ابراہیم نخعی کوفہ کے سردار اور حاکم اعلیٰ تھے، اور یہ سب لوگ بڑے درجہ کے عالم، محدّث وفقیہ بھی تھے۔

اسی طرح اور بھی بہت سے غلاموں کو حکومت میں ان کی صلاحیت کے مطابق بڑی بڑی ذمہ داری کے عہدے دیئے گئے تھے۔ یہاں تک کہ بعض غلاموں کی حکومت ہوگئی تھی اور پشتہا پشت تک چلتی رہی اور پہلا غلام جو حکمراں ہوا ہے تاریخ شاہد ہے کہ اس نے ظلم یا قہر وتغلب سے تخت حکومت نہیں لیا ہے، بلکہ اس کے آقا نے خود اس کی صلاحیت دیکھ کر اپنی خوشی سے تخت شاہی سونپ دیا پس

اگر کسی نے اپنے غلام پر ظلم و زیادتی کردی ہو تو اسلام نے اس کو اجازت نہیں دی تھی بلکہ اس کو ظالم و گنہگار قرار دیا، اور ایسے لوگ لاکھ میں ایک ہی دو ہوں گے جن کا اعتبار نہیں۔ اعتبار اکثریت کا ہوتا ہے۔

پھر کسی کا جناب کو یہ بتلانا کہ اسلام میں غلام کی کوئی عزت نہیں ہوتی تھی اور اسے بڑی مجبوری کی اور سختی کی زندگی گذارنی پڑتی تھی بالکل فریب دہی ہوگی اور قطعی مبنی بر حقیقت بات نہ ہوگی۔

اسی طرح اور شبہات جو اسلام یا اسلامی تعلیم کے خلاف جناب کے ذہن میں ڈالے گئے ہیں، وہ سب فریب دہی اور تاریخ کو مسخ کرنا ہے۔ امید کہ اتنے اشارات سے جناب کی تشفی ہوجائے گی۔ اور اگر مزید تحقیق کا شوق ہوگا تو تاریخ کی معتبر کتابوں کا مطالعہ فرمائیں گے۔ دشمنانِ اسلام کی مسخ کردہ تاریخ پر قناعت نہ فرمائیں گے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ الاحقر نظام الدین عفی عنہ

دارالعلوم دیوبند ۲۷/۱۰/۹۶ھ

رکعات تراویح کا صحیح عدد
ایک قدیم حدیثی مسئلہ کی تنقیح و تشریح

سوال (۱۷) (۱) بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں صرف آٹھ رکعات تراویح پڑھتے تھے۔ جب کہ دوسروں کا کہنا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں سے بیس رکعات تراویح پڑھنے کو فرمایا صحیح واقعات کو لکھے ہیں؟۔

(۲) جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعات تراویح پڑھیں اور باجماعت تراویح ادا کرنے سے روکا۔ ان کا یہ نظریہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہماری رہنمائی کو موجود رہنے کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم منسوخ

ہوجانا چاہیئے۔ مہربانی فرماکر مندرجہ بالا بیانات پر اپنی رائے اور اپنا نظریہ اور حکم بتائیں۔

(۳) کیا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی فاتحہ یا دعا کو تراویح کی ہر چار رکعت کے بعد پڑھا تھا؟ ساؤتھ افریقہ میں مسلمانوں کی اکثریت کو تراویح کی ہر چار رکعت بعد فاتحہ پڑھنے پر اصرار ہے کیا اس کو آپ بدعت نہیں کہیں گے؟ مسلمان فقہاء اس طریقہ کار کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ فاتحہ کی اس صورت کو آپ عبادت کے طریقہ کا ایک جزو کہیں گے۔

(۴) سمجھا جاتا ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی تین راتوں میں تراویح مسجد میں پڑھی یہ تراویح کی نمازیں علیحدہ علیحدہ پڑھی گیئں یا باجماعت؟

(۵) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد کو اپنے گھر میں تراویح پڑھی۔ انھوں نے رکعات کس تعداد میں پڑھیں۔ اس بارے میں رائیں مختلف ہیں۔ براہ کرم اس پوزیشن کی توضیح کیجیے، اور ماخذ کا حوالہ بھی دیں۔

(۶) ساؤتھ افریقہ میں عام طریقہ رائج ہے کہ جماعت نماز کی تکمیل کے بعد امام جماعت سے فاتحہ پڑھا کرتا ہے۔ اس سوال پر فقہاء، چاروں اماموں اور علماء کا کیا فیصلہ ہے؟ کیا یہ ہونا چاہیئے کہ فقہاء اس طرح باجماعت فاتحہ پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں اور اگر جماعت کی اکثریت اس طرح کے پڑھنے کی خواہش رکھتی ہے تو کیا فقہی قانون پڑھنے کو روا رکھے گا، اکثریت کی رائے کو قائم رکھتے ہوئے؟

(۷) مسلمانوں کا ایک طبقہ اس اصول میں یقین رکھتا ہے کہ جو چیز بھی اسلام میں ممنوع نہیں ہے وہ جائز ہے۔ دوسرے طبقہ کا عقیدہ ہے کہ جو چیز بھی قرآن پاک اور سنت کے احکام سے ثابت نہیں ہے وہ بدعت ہے۔ یہ طبقہ یہ بھی عقیدہ رکھتا ہے کہ ہم لوگوں کو عبادت کے صرف ان طریقوں اور ذریعوں پر بھروسہ کرنا چاہیئے

جو کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سکھائے ہیں۔ ہم کو ان کے اندر قطع وبرید کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہم ان میں کوئی اضافہ کر سکتے ہیں، کیونکہ ہم اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے علاوہ کوئی اور ذریعہ ہی نہیں رکھتے، جس سے ہم اللہ کی معرفت حاصل کریں اور اللہ سے تعلق حاصل کریں اس معاملہ میں جو بھی تبدیلی کی جائے گی وہ بدعت ہوگی۔ اور ہر ایک بدعت ضلالت ہوگی۔ اس طبقہ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے کہ جو بھی بات ممنوع نہیں ہے اس کو لے لیا جائے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کے نئے طریقے اختیار یا ایجاد کیے جائیں۔

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں کیا آپ براہ کرم فقہی نقطہ نظر سے پوزیشن کی توضیح فرمائیں گے۔

(۸) قرآن پاک ایسی شہادتوں سے بھرا پڑا ہے جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کے بارے میں ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے "مکمل اور مثالی نمونے" کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور عقیدہ رکھو" جو رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے"۔ "جو بھی رسول تمہیں دیتے ہیں اسے منظور کر لو، اور جو کچھ وہ منع کرتے ہیں اس سے رکے رہو" (۷-۵۹) اور بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے بہت سی شہادتیں آئی ہیں۔

ان واضح شہادتوں کی روشنی میں یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ چیز بڑھائی جا سکتی ہے جو ہم مسلمانوں کی سمجھ میں اللہ کی نظر میں پسندیدہ ہوگی۔ جہاں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اہم معاملات میں سکوت فرمایا ہے، خصوصاً عبادت کے میدان میں؟

(۹) آخری عرض آنکہ اگر ہمیں اجازت ہے کہ ہم ان معاملات میں بڑھا لیں

جہاں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا ہے تو کیا ممکن نہیں ہے کہ ہم بڑھاتے ہی چلے جائیں، یہاں تک ہم اس طرح پر اسلام کی روح کو برباد کر بیٹھیں کیونکہ ہم بہر حال انسان ہی ہیں اور غلطی کر سکتے ہیں۔ اور یہ تمیز کرنے کی طاقت نہیں رکھتے کہ ہمارے لئے اچھا کیا ہے؟ اور گناہ آلود کیا ہے؟ کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی آتی تھی اور ہمیں نہیں آتی؟۔

مہربانی کر کے مندرجہ بالا نکتوں کی وضاحت بالتفصیل فرمادیجئے اور اس میں جس قدر بھی ماخذ ممکن ہوں ان سب کے حوالجات درج فرمادیجئے۔

اس طرح سے جناب اسلام کی ایک عظیم خدمت فرمارہے ہوں گے اور اپنے جواب کے ذریعہ مسلم سماج میں ایکتا اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں معاونت فرمارہے ہوں گے۔ کیونکہ اوپر لکھے ہوئے معارض بحث نے ہمارے سماج میں ایک دراڑ ڈال دی ہے۔

اللہ آپ کو تبلیغ کے میدان میں آپ کی قابل قدر خدمات کا اچھا بدلہ دے اور آپ پر رحمت فرمائے۔

الجواب:- (۱، ۲) یہ خیال صحیح نہیں، متفق علیہ بات صرف اتنی ہے کہ ایک سال جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان مبارک میں صرف تین شب میں نافلہ کے ساتھ ایک نئی نماز جماعت کے ساتھ ادا فرمائی اور اس کو قیام رمضان سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ پہلی شب میں ثلث رات تک، دوسری شب میں نصف رات تک، تیسری رات میں صبح صادق کے قریب تک، چوتھی شب میں بھی تمام صحابہ رضی مسجد میں ساری رات انتظار میں جمع رہے اور آپ تشریف نہیں لائے۔ صبح کو ارشاد فرمایا کہ مجھ کو تم لوگوں کا انتظار میں جمع رہنا معلوم ہے۔ مگر ڈرا کہ مبادا یہ نماز امت پر فرض ہو جائے اور امت اس پر قابو نہ پائے

بارگذرے اس لئے میں نہیں آیا پھر اس کے بعد علماء میں اختلاف ہوا کہ وہ نماز کتنی رکعتیں تھیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نئی نماز بیس رکعت تھی، چنانچہ جمہور علماء کا یہی خیال ہے اور اسی بناء پر آپ کے بعد جب فرضیت کا خطرہ ختم ہو گیا صحابہ کرام نے اپنے اپنے طور پر پورے رمضان میں بیس رکعت بلکہ بعض صحابہؓ اس سے زائد بھی پڑھتے رہے۔ اور بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ وہ نماز صرف آٹھ رکعت تھی اگرچہ یہ روایت صحاح کی ہے مگر یہ خیال کمزور ہے کہ اس کا منشاء حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی وہ روایت ہے جس میں فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان وغیر رمضان میں کبھی آٹھ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھیں مگر اس روایت میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پورے سال بھر کا تہجد کی نماز کا معمول بتلا رہی ہیں نہ کہ وہ نئی نماز جس کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تین شب پڑھ کر بند فرما دیا اور جس کو قیام رمضان سے تعبیر فرمایا گیا۔

اور اگر آٹھ رکعت والی روایت کو اسی کے لئے تسلیم کر لیا جائے جب بھی جب کہ جمہور صحابہؓ کا معمول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہمیشہ آٹھ رکعت سے زائد پڑھنے کا تھا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ روایت منسوخ ہے، جن صحابہؓ کو اس کے نسخ کا علم نہ ہوا وہ آٹھ رکعت پڑھتے رہے۔ اگر وہ منسوخ نہ ہوتی تو جمہور امت کا یہ معمول نہ بنتا، چنانچہ ائمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک تراویح بیس رکعت سے کم نہیں ہے بلکہ حضرت امام مالکؒ سے چھتیس رکعت تک منقول ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تو صرف تمام صحابہؓ کو جو متفرق جماعتوں میں الگ الگ جماعتیں کرتے تھے، ایک جگہ مجتمع فرما کر ایک جماعت میں منسلک فرما دیا ہے۔ اس نئی نماز کی یا اس کی رکعت کی تعداد کی ایجاد نہیں کی ہے۔ ھکذا فی موطا امام مالک والشامی والفتح والبحر وغیر ذلک۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم کو منسوخ کہنا صحیح نہیں ہے، منسوخ ناسخ سے مقدم ہوتا ہے نہ کہ موخر۔ حضرت عمرؓ کا یہ طریق عمل یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے موخر ہے بلکہ اس پر منسوخ کا لفظ بولنا علماء کی اصطلاح سے ناواقفیت کی دلیل ہے، اسی طرح اس نظریہ رکھنے والوں کی یہ بھی کم علمی اور ناواقفیت کی دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح باجماعت پڑھنے سے روکا ہے بلکہ حقیقت وہ ہے جو شروع جواب میں مذکور ہوئی اور وہ عنوان تو پڑھنے کی ترغیب کا ہے اور خود نہ پڑھنے کے دلیل کے بیان کرنے کا ہے۔

(نوٹ) اگر مزید تحقیق اور سیر حاصل بحث دیکھنی مقصود ہو تو اردو رسالہ (بیس رکعات تراویح) مصنفہ حضرت مولانا ابوالمآثر محمد حبیب الرحمٰن اعظمی کا مطالعہ فرمائیں، اور اگر کوئی اس کا ردیا جواب پیش کردہ از جانب مولانا سلیمان اعظمی پیش کرے تو پھر مولانا کا جواب الجواب بھی ضرور دیکھئے۔ انشاء اللہ قاطع نزاع اور کافی وافی ہوگا۔

(۳) جی نہیں۔ اس کا ثبوت نہیں۔ اس پر اصرار کرنا بے شبہ بدعت ہے۔ اور اس کا بند کرنا ضروری ہے۔

(۴) باجماعت پڑھی گئی۔

(۵) ہوسکتا ہے آپ نے اپنے دولت خانہ پر تراویح کی نماز تنہا پڑھی ہو جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری کے علاوہ ہو، مگر اس کی یا اس کی رکعت کی تعداد متعین ہوکر منقول نہیں۔

(۶) اگر جماعت فاتحہ سے فاتحہ مروجہ مراد ہے تو بدعت ہے اور اگر نفس اجتماعی دعا رثانی مراد ہے۔ تو اس میں مضائقہ نہیں، لیکن اس کو لازم و ضروری قرار دینا اس کا رواج دینا، اہتمام کرنا کہ جو شریک نہ ہو اس پر نکیر کرنا، طعن و تشنیع کرنا ناجائز ہے،

اگر ایسا ہے تو یہ طریقہ و التزام واجب الترک ہوگا، اور بدعت شمار ہوگا۔

(۷) دین میں اور بالخصوص عبادات میں یہ اصول کہ (جو چیز بھی اسلام میں ممنوع نہیں وہ جائز ہے) صحیح نہیں، یہ ایک مغالطہ ہے، صریح اور صحیح حدیث من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد و فی روایة فهو مردود۔ او کما قال کے تحت بدعت ہے اور خود یہ اصول بھی مستحدث ہے اور دوسرے طبقہ کا عقیدہ صحیح اور مطابق فرمان رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہے۔

(۸) ہاں قرآن پاک ایسی شہادتوں سے بھرا پڑا ہے، اور ان کی روشنی میں یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ دین میں اور عبادات کے میدان میں محض اپنی سمجھ سے کوئی ایسی چیز بڑھا دی جائے جس کے بارے میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا ہو۔ یہ طریقہ زیادتی فی الدین اور ناپسندیدہ باری تعالیٰ ہوگی اور بارگاہ شریعت اور بارگاہ عز اسمہٗ میں خطرناک قسم کی گستاخی ہوگی۔

(۹) بے شک آپ کے یہ خیالات صحیح ہیں اور ان مفاسد کا امکان ہے جن کا اظہار آپ نے فرمایا ہے بلکہ ان کا ظہور بھی ہوتا جا رہا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ الاحقر نظام الدین احمد

دار العلوم دیوبند۔ ۲۲/۹/۱۲ھ

الجواب صحیح

سید احمد علی سعید۔ دار العلوم دیوبند

ذبیحہ کے متعلق ایک مضمون کے بارے میں اشکال

سوال (۱۸) علماء دین اس بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ ذبیحہ کے متعلق ایک مضمون (دی اسلامک ریویو) جو انگریزی زبان میں شائع ہوتا ہے، اس کے شمارہ مئی ۱۹۶۶ء میں پڑھا۔ اس کے مصنف رشید احمد جالندھری تمام حدود کو پار کر گئے ہیں۔ مختصراً ان کے لئے ہر قسم کا

گوشت جائز ہے چاہے وہ چھپکلی کا ہو چاہے ہندو یا سکھ کا حلال کیا ہوا ہو، ان کے لئے صرف یہ شرط ہے کہ وہ خدا کے نام پر چاہے ذبح ہو یا نہ ہو لیکن کسی غیر خدا کے نام پر ذبح نہ ہو، اس سلسلہ میں انھوں نے قرآن مجید کی آیات شریفہ ۱۱۹ و ۱۲۲ سورۃ ۶ میں اور آیت ۴ سورۃ ۵ کے حوالے دیئے ہیں۔

اس مسئلہ میں دو چیزیں ہیں ایک تو تسمیہ یعنی خدا کا نام لینا، دوسرے طریقۂ ذبح، تسمیہ میں تو جتنی گنجائش تھی وہ اباجی مرحوم کے فتویٰ سے ظاہر ہے کہ عیسائی اور یہودیوں کے ذبح کو قابل قبول مانا جا سکتا ہے، طریقہ ذبح کے سلسلہ میں قرآن مجید کی کوئی آیت کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے جس کی بنیاد وہی مضمون ہے۔ اور اس سلسلہ میں احادیث میں ایک خاص طریقہ کا حکم ہے جو مصنف مذکور کے حساب سے اس بنیاد پر قائم ہے کہ جانور کو کم سے کم تکلیف ہو، چونکہ موجودہ طریقہ جسے (ہیُومَن کلَر) HUMANKILLER کہتے ہیں بظاہر جانور کے لئے کم تکلیف دہ ہے اگر ہمارے طریقۂ ذبح سے اس کا موازنہ کیا جائے۔ اس لئے مصنف کہتا ہے کہ موجودہ طریقہ ہومن کلر ہی عین اسلامی طریقہ ہے اس کو مفتی اردن وغیرہ نے بھی (ENDORSE) انڈورس کیا ہے۔ حتیٰ کہ مصنف کے بیان کے مطابق اس کی حمایت سعید احمد اکبرآبادی نے بھی ۱۹۶۱ء کے برہان میں کی ہے، اسی طرح کا یہاں پر عام طور پر گوشت ملتا ہے وہ بھی جائز ہو جاتا ہے؟۔

الجواب:- سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ قرآن کریم انسانی مقالہ، یا انسانی تصنیف یا اس کے مثل نہیں ہے بلکہ یہ کلام ہے اور کلام الٰہی ہے انسانی کلام میں بھی بہت سے ایسے اشارے اور گوشے ہوتے ہیں جن کو کما حقہ مخاطب ہی سمجھتا ہے، کوئی دوسرا نہیں سمجھ پاتا۔ صرف دو سطر کا لکھا ہوا ایک پوسٹ کارڈ بسا اوقات بہت سے اشارات و گوشے اپنے اندر رکھتا ہے جن

کو صرف مخاطب ہی سمجھتا ہے۔ دوسرا کوئی خواہ کتنا ہی بڑا زبان داں، فصیح و بلیغ، محاورات و لغات پر حاوی ہی کیوں نہ ہو، اچھی طرح نہیں سمجھ پاتا اور یہ چیز روزمرہ کے تجربہ میں ہے۔ پھر کلام الٰہی کو جو تبیانا لکل شئ یحتاج الیہ الانسان فی معادہ (یعنی یہ قرآن ہر اس چیز کا پورا بیان ہے جس کی جانب انسان کسی وقت بھی اپنے معاد کے معاملہ میں محتاج ہو) کے درجہ میں ایجاز کے اعلیٰ اسلوب پر قیامت تک کے لئے ایک مکمل ضابطہ و قانون ہے۔ بغیر اس کے مخاطب اول کی اعانت کے کیونکر اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

قرآن کریم کے مخاطب اول چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لئے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مستغنی و بے نیاز ہو کر سمجھنا معتبر و قابل اعتماد نہیں ہو سکتا، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم محض مخاطب اول ہی نہیں ہیں بلکہ آپ قرآن حکیم کے معلم بنا کر بھیجے گئے اور آپ کی تعلیم کے اتباع کا حکم بھی دیا گیا اور آپ کی تعلیمات کو امت پر اللہ نے خود اپنا احسان بتلایا اور موقع امتنان و احسان میں ارشاد فرمایا لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم ایٰتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ الآیۃ پھر آپ سے یا آپ کی تعلیمات سے بے نیازی کس طرح روا ہو سکتی ہے۔

اسی طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام بھی کلام ہے اور مثل قرآن کریم وحی ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ قرآن کریم وحی متلو ہے اور احادیث رسول اللہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) وحی غیر متلو ہے۔ مگر نفس وحی و مصدق من اللہ ہونے میں دونوں یکساں ہیں۔ اسی کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے۔ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ الآیۃ اور اس کلام رسول علیہ السلام کے مخاطب اول صحابہ کرام ہیں۔ صحابہ کرام رضؓ کے سلامتی فہم، بصیرت کی تائید قرآن پاک

میں متعدد جگہ فرمائی گئی ہے بلکہ بعض مقام پر تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ بالاعلان امت کو اس سے آگاہ فرما دیجئے کہ یہ (دین) میرا راستہ ہے میں اس کے ذریعہ تمام لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود اور میرے تمام صحابی بصیرت پر ہیں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔ قل هذه سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرة انا ومن اتبعنی الآیۃ پ۱۳ س یوسف۔

اور ان ہی اصحاب رسول ؐ کے بارے میں ارشاد رسول علیہ السلام اس طرح ہے۔ اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اھتدیتم اوکما قال (الحدیث) اس سے معلوم ہوا کہ ان کے ارشادات وتشریحات کا حکم بھی وہی ہوگا جو ابھی اوپر مذکور ہوا۔

پھر اسی طرح کلام صحابہ بھی کلام ہے اور اس کے مخاطب اول حضرات تابعین ہیں بالخصوص وہ حضرات جنہوں نے صحابہ کرام رضؓ سے براہ راست اخذ علم رسول کیا ہے اور صحابہ کرام رضؓ نے ان پر اعتماد کیا ہے۔ اور کلام صحابہ رضؓ اگرچہ وحی نہیں ہے مگر صاحب وحی سے براہ راست اخذ کیا ہوا ہے، اور صاحب وحی نے ان پر اعتماد کیا ہے، اور یہ حضرات تابعین ان معتمدین کے معتمد ہیں۔ لہٰذا ان کی فہم وبصیرت بھی واجب اللحاظ اور دوسروں کی فہم وبصیرت پر فائق ہوگی۔

ہماری اس بات پر بہت سی آیات وروایات شاہد ہیں۔ ان سب کے پیش کرنے کا یہ موقع نہیں ہے صرف ایک مشہور حدیث پیش کر دی جاتی ہے، اس میں بھی اس طرف کافی اشارہ موجود ہے۔ ارشاد رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہے۔ خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم (اوکما قال) الحدیث۔

اتنی گفتگو سے معلوم ہوا کہ ان تینوں سے بے نیاز و مستغنی ہو کر محض زبان دانی کے

بھروسہ پر آیات قرآنی کا کوئی مفہوم متعین کر لینا حجت شرعی نہیں ہو سکتا، بلکہ ایک خطرناک قسم کی جرأت اور ناقابل تلافی غلطی ہوگی، اور اسی قسم کی غلطیوں سے تمام فرق ضالہ و باطلہ پیدا ہوئے۔

غرض یہ ہے کہ اگرچہ تسمیہ و طریق ذبح کی ساری قیود و شرائط اور سارے احکام ہم کو براہ راست قرآن پاک میں نہ ملیں مگر جب احادیث رسول و آثار صحابہ رضی میں یہ تفصیل موجود ہیں تو ان کا اتباع و لحاظ ضروری ہوگا۔ یہ بات بطور اصول موضوعہ ہر وقت پیش نظر رہی ضروری ہے۔ انہی اصول کے پیش نظر نہ رہنے کی وجہ سے جالندھری صاحب نے وہ مضمون لکھ مارا ہے، ورنہ ہرگز ایسی جرأت نہ فرماتے اور ہرگز ایسی باتیں نہ فرماتے جو انھیں کبھی نہ کہنی چاہئے تھیں۔

بہرحال تسمیہ کے بارے میں جب آپ کو تشفی حاصل ہے تو اس پر کلام کی حاجت نہیں۔ البتہ طریق ذبح کے بارے میں آنجناب کی بصیرت و تشفی کے لئے تھوڑا سا عرض ہے کہ ذبح کا جو طریقہ کتاب و سنت سے ثابت و متعین ہے، یعنی یہ کہ جانور کو بائیں پہلو پر قبلہ رخ لٹا کر کوئی مسلمان یا اہل کتاب (یہودی یا نصرانی) ذبح کرتے وقت کسی غیر اللہ کا نام لئے بغیر محض اللہ کا نام لے کر حلقوم کی جانب سے کسی دھار دار چیز سے ذبیحہ کا حلقوم (غذا کی نلکی) اور قصبۃ الریہ (سانس کی رگ) اور ودجین (قصبۃ الریہ کے دونوں جانب کی خون کی دو رگیں) کاٹ کر ناپاک خون (دم مسفوح) خارج کر دے۔ یہی طریقہ ذبح کا مسنون ہوگا اور شریعت مطہرہ کے عین منشاء کے موافق کہلائے گا۔

خط میں موجودہ طریقہ ذبح کی تفصیل مذکور نہیں ہے کہ اس پر کلام کیا جائے بہرحال اس جدید طریقہ ذبح میں یہ مذکورہ بالا باتیں اگرچہ موجود نہ ہوں جن سے ذبیحہ سنت کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن گوشت کے حلال و طاہر ہونے کی صرف

دو شرطیں منصوص ہیں۔ اگر پائی جائیں گی تو ذبیحہ حلال وطاہر کہا جائے گا۔

(۱) پہلی شرط بحکم آیت کریمہ:۔ یسئلونک ماذا احل لھم قل احل لھم الطیبات (الی قولہ تعالیٰ) واذکروا اسم اللہ علیہ واتقوا اللہ ان اللہ سریع الحساب۔ الآیہ (سورہ مائدہ) یہ ہے کہ ذبح کرنے والا مسلمان ہو یا بحکم آیت کریمہ وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم الآیہ کوئی اہل کتاب (یہودی یا نصرانی) ہو بوقت ذبح بلاشرکت غیرے محض اللہ کا نام لے کر ذبح کرے۔

(۲) دوسری شرط بحکم آیت کریمہ: حرمت علیکم المیتۃ والدم (الی قولہ تعالیٰ) الا ماذکیتم الآیہ یہ ہے کہ کوئی مسلمان یا بحکم آیت متلوہ کوئی اہل کتاب گردن کی مذکورہ چاروں رگوں میں سے کم سے کم تین رگیں تسمیہ کے ساتھ کاٹ کر ناپاک خون (دم مسفوح) نکال دے۔

اب اگر ان رگوں کے کاٹنے میں گردن کا زائد حصہ کٹ جائے یا بالکل سر قلم ہو جائے یا پچھلے حصہ سے کاٹ دیا جائے یا بغل سے کاٹ دیا جائے یا جانور پر کھڑے کھڑے یہ دونوں عمل (تسمیہ وتذکیہ) کر دیا جائے اگرچہ ان افعال کو غیر مشروع یا خلاف سنت ہونے کی وجہ سے مکروہ کہا جائے۔ مگر چونکہ دونوں شرطیں پوری ہو گئیں اور تسمیہ معہودہ کے ساتھ دم مسفوح نکل کر طہارت وحلت آ گئی ہے اس لئے ان افعال غیر مشروعہ غیر مسنونہ کا اثر گوشت کی حلت وطہارت پر نہ پڑے گا اور کھانا جائز رہے گا۔

اور اگرچہ بحیثیت مسلمان ہونے کے اس بات کی سعی بھی حتی المقدور کرتے رہنا ضروری رہے گا کہ یہ عمل ذبح مطابق سنت کیا جائے تاکہ ہر طرح عند الشرع والشارع محمود و پسندیدہ رہے۔ اور یہ کہنا کہ احادیث میں ذبح کا ایک خاص طریقہ محض

اس بنیاد پر ذکر کیا گیا ہے کہ جانور کو کم سے کم تکلیف ہو، اور پھر اسی کو علت اصلی قرار دے کر اس پر یہ حکم متفرع کر دینا کہ یہ مشینی طریقہ بھی عین اسلامی طریقہ ہے صحیح نہ ہوگا، یہ حصر درست نہیں بلکہ اخراق دم مسفوح میں نجس خون کا اچھی طرح اخراج بھی ضروری ہے اور شرط کے درجہ میں لازم ہے۔ پس اگر ذبیحہ کے جسم پر بجلی کا کرنٹ دوڑانے سے یا کسی اور طریقہ سے مثلاً انجکشن وغیرہ دے کر جانور کو بے حس وحرکت یا بیہوش کرنے سے رگیں سکڑ کر دوران خون بند ہو جاتا ہو یا کمزور ہو جاتا ہو۔ یا طبیعت کمزور ہو جاتی ہو جس سے اخراج خون میں کمی ہو جاتی ہو، اور دم نجس سے اچھی طرح صفائی نہ ہوتی ہو تو یہ طریقہ عند الشرع پسندیدہ ومحمود نہ ہوگا۔ چہ جائیکہ اس کو عین طریقہ اسلامی کہا جائے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو نفس ذبح میں ایک جاندار کی جان ضائع کرنا ہوتا ہے، خون بہانا ہوتا ہے جو بظاہر قتل کے مشابہ ہے اور عقل کے نزدیک بظاہر یہ فعل قساوۃ قلبی سے ناشی معلوم ہوتا ہے عقل کے نزدیک تو یہ فعل سرے سے ہی جائز نہ ہونا چاہیے۔ لہذا یہ مسئلہ عقلی نہ رہا بلکہ بایں طور تعبدی ہو گیا کہ اللہ رب العزت نے اپنے قول برحق لقد کرمنا بنی آدم الآیہ اور ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا الآیہ کے پیش نظر تکریم بنی آدم اور بنی نوع انسان کا اعزاز واکرام ظاہر کرنے کے لئے اس فعل کا حق واختیار بنی نوع انسان کو عطا فرمایا ہے اور اس لئے عطا فرمایا ہے کہ انسان اس سے یہ سمجھے کہ ہم ان مذبوحات کے خالق ومالک نہیں تھے مگر اللہ نے ہماری حیثیت ومرتبہ سے بڑھ کر ہم کو یہ انعام واکرام فرمایا ہے اعزاز بخشا ہے لہذا اس کی طرف رجوع کریں اور ممکن ہے کہ بوقت ذبح اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے میں یہ بھی نکتہ ہو۔

نیز ممکن ہے کہ اس فعل کو اللہ نے اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر عبادت بنا دیا،

جیساکہ فصل لربك وانحر الآیہ میں بیان فرمایا اور یہ حق واختیار دیا ہے لہذا یہ فعل امر تعبدی کے قبیل سے ہو گیا، اور امر تعبدی کی علتیں محض شارع حقیقی کے علم و حکمت میں مخفی رہتی ہیں اور بظاہر جو وجوہ واسباب نظر آتے ہیں وہ محض حکمت کے درجہ میں ہوتی ہیں، علت نہیں ہوتیں۔ مدار حکم اگر ہو سکتا ہے تو محض علت نہ کہ حکمت حکمت کبھی مدار حکم نہیں ہوتی۔

یہی فرق پیش نظر نہ ہونے سے یہ کہدیا گیا ہے کہ یہی عین اسلامی طریقہ ہے یا یہ خاص طریقہ ذبح کا احادیث میں محض اس بنیاد پر ہے کہ جانور کو کم سے کم تکلیف ہو۔ مفتی اردن یا اور تائید کرنے والوں کے ذہن سے یہی فرق ذہول کر گیا ہے ورنہ وہ لوگ بھی کبھی اس کی تصویب یا تائید نہ کرتے۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ کہنا کہ قرآن کریم کی کوئی آیت کوئی روشنی نہیں ڈالتی بھی صحیح نہیں ہے۔ اگر واقعی اس کا کوئی حکم قرآن کریم میں ہم کو نہ ملتا جب بھی یہ تعبیر (کہ قرآن کریم کی کوئی آیت اس پر کوئی روشنی الخ) قرآن کریم کی شان میں گستاخی و بے ادبی ہے۔ اللہ رب العالمین نے قرآن کریم کو تبیانا لکل شئ الآیہ اور ھدی للناس وبینات من الھدی والفرقان الآیہ فرمایا ہے، پھر ایسے اہم اور خالص مذہبی معاملہ میں اس کی کوئی ہدایت یا رہبری کیوں نہ ہو گی۔ یہ تعبیر اسی قسم کے ذہنوں کی پیداوار ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا درپردہ انکار کر کے آپ کی تنقیص واستہزار کے لئے لفظ راعنا استعمال کیا تھا اور اس پر خدائے ذوالجلال نے نکیر و تنبیہ فرمائی، چنانچہ لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا الآیہ نازل فرمایا اور اس موقعہ کے تعبیری عنوان کی تعلیم ہم کو دربار نبوت علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم سے حدیث معاذ بن جبل میں اس طرح ملی ہے کہ بجائے مذکور تعبیر کے یوں کہنا چاہئے کہ قرآن پاک میں اس کے بارے میں ہم کو کوئی حکم نہیں ملتا۔ فی المشکوٰۃ صہ ۳۲۴

عن معاذ بن جبلؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما بعثہ الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لک قضاءٌ قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجدہ فی کتاب اللہ قال فبسنۃ رسول اللہ قال فان لم تجدہ فی سنۃ رسول اللہ قال اجتھد برائی ولا آلو قال فضرب رسول اللہ علی صدرہ وقال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی بہ رسول اللہ (رواہ الترمذی وابو داؤد والدارمی) اس تعبیر میں لاعلمی وجہل یا نقص کی نسبت محض اپنی طرف ہوگی، اس لئے قرآن کریم کی تنقیص یا بے ادبی وغیرہ کا ایہام بھی نہ ہوگا۔ پھر قرآن کریم اللہ کا کلام ہے۔ ہر کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے اور خود متکلم موصوف شمار ہوتا ہے۔ اور متکلم ہی کی حیثیت و مرتبہ سے اس کے کلام کا مرتبہ و مقام متعین ہوتا ہے۔ کلام الملوک ملوک الکلام۔

نیز متکلم کے کسی وصف کی تنقیص خود متکلم کی تنقیص بسا اوقات شمار ہوتی ہے، بلکہ اکثر کسی موصوف کی تنقیص واستہزاء اس کے وصف ہی کے استہزاء سے کرتے ہیں، بالخصوص جب موصوف کی براہ راست ذات کی تنقیص سے خطرات ومصائب میں ابتلاء کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم کی اس بے ادبی وگستاخی کی سرحد براہ راست اللہ رب العالمین کی بے ادبی وگستاخی تک پہنچتی ہے۔ اس لئے یہ گستاخی وبے ادبی انتہائی خطرناک بھی ہوتی ہے مسلمانوں کو اس سے احتیاط لازم ہے۔

امید کہ اتنی گفتگو سے آپ کو جس مسئلہ کی تحقیق مطلوب تھی اس کی توضیح بقدر ضرورت ہوگئی ہوگی۔ البتہ آپ کا غیر مسنون طریقہ سے ذبح کئے ہوئے گوشت کو نہ کھانا یا اس سے طبیعت کا رکنا یہ جذبۂ محمود اور سلامتی طبع کی دلیل اور تقویٰ کی

علامت ہے۔ اب اس مذکورہ بالا ضابطہ کے مطابق دیکھ لیا کریں، اگر حلت واباحت کی شرطیں پائی جائیں تو مباح سمجھیں ورنہ ناپاک وحرام سمجھیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفی عنہ

دارالعلوم دیوبند۔ ۲۰/۱۲/۸۹ھ

قربانی کے متعلق ایک ضروری مسئلہ

سوال (۱۹) غیر واجب قربانی میں حضورؐ کے ایصال وثواب کے لئے دو یا چار آدمی مل کر مشترکہ قربانی کرنے کو دارالعلوم کیجانب سے درست ہونے کا فتویٰ ۱۳۸۸ھ میں موصول ہوا تھا، تو اس وقت اس فتویٰ کو پمفلٹ کی شکل میں شائع کر کے پورے برطانیہ میں تقسیم کیا تھا، جس سے الحمدللہ کم وبیش آج تک سیکڑوں قربانی ہو چکی۔ لیکن امسال ۱۳۹۱ھ میں ماہ فروری ۱۹۷۱ء میں گجراتی ماہنامہ التبلیغ میں جامعہ ڈابھیل سے اسی قسم کے فتویٰ کا جواب اس کے برعکس شائع ہوا ہے۔ جس کے سوال وجواب حسب ذیل ہیں۔

سوال:۔ ہمارے یہاں برطانیہ میں دوٗ تین آدمی مل کر (مشترکہ) حضورؐ کے نام پر ایک بکرا کی قربانی کرتے ہیں۔ یہ صحیح ودرست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایک بکرا کی قربانی ایک ہی آدمی کر سکتا ہے۔ اس میں دوٗ یا تین حصہ دار بن کر بکرا کی قربانی کریں گے تو قربانی صحیح ادا کی ہوئی سمجھی جائے گی نہیں۔ جس کی وجہ سے قربانی کا ثواب بھی ملے گا نہیں۔ حضورؐ کے لئے قربانی کرنا یا ایصال وثواب کرنا بہت ہی بہتر اور کار ثواب ہے۔ ہاں اگر استطاعت اور گنجائش ہو تو ضرور کرنا چاہیئے، بڑے جانور جس میں سات حصے ہو سکتے ہیں، ایسے جانور میں سے ایک ایک حصہ کی قربانی کر سکتے ہیں۔ فقط

(عالمگیری، شامی)

جامعہ ڈابھیل سورت۔ گجرات فروری ۱۹۷۱ء۔

دارالعلوم دیوبند اور جامعہ ڈابھیل کے جوابات میں صحیح اور غیر صحیح جیسے بڑے فرق ہونے کی وجہ سے لوگوں میں ایک قسم کی پریشانی اور بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔
دارالعلوم کے ایک فتویٰ کی ایک فوٹو کاپی اس خط کے ہمراہ روانہ کی ہے اور حضرت تھانویؒ نے بھی امداد الفتاویٰ دارالعلوم کے مانند جواز کا فتویٰ دیا ہے حوالہ حسب ذیل ہے۔

مبوب امداد الفتاویٰ جلد سوم۔ ادارہ اشرف العلوم کراچی۔ طبع اول شوال ۱۳۷۳ھ (کتاب الذبائح والاضحیہ ص ۴۹۵)

دارالعلوم اور حضرت تھانویؒ کے حوالے کے بعد مزید تحقیقات کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مگر جامعہ ڈابھیل کا فتویٰ گجراتی ماہنامہ رسائل میں شائع ہو کر ملک اور بیرونِ ملک میں پھیل گیا ہے۔ اس وجہ سے مزید استصواب اور تسکین کیلئے دوبارہ وہی سوال حاضر خدمت ہے۔ امید کہ مزید روشنی ڈال کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں گے۔

الجواب:۔ ۱۳۸۰ھ میں دارالعلوم دیوبند سے حضرت مفتی محمود صاحب کا لکھا ہوا جو فتویٰ گیا ہے وہ صحیح ہے۔ اسی طرح حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے رجوع کے بعد جو تحریر فرمایا ہے وہ بھی صحیح ہے۔

اور مفتی ڈابھیل نے جو بات لکھی ہے (کہ ایک بکرا کی قربانی یا سبع بقرہ (ساتواں حصہ بقرہ کا) کی قربانی چند آدمیوں کے نام سے نہیں ہو سکتی) وہ اپنی جگہ پر تو صحیح ہے لیکن یہ بات اس سوال مذکورہ کا جواب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ یہاں تو اس بکرے کی قربانی تنہا اور صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے ہوگی، آپ کا تنہا وہ حصہ ہوگا۔ اس میں چند آدمی حصہ دار نہیں ہوں گے۔

وہ چند آدمی جنہوں نے بکرا خرید کر فقط آپ کے نام قربانی کی ہے وہ خود حصہ دار

نہیں ہوئے بلکہ حصہ دار ہونے کے بجائے دوسرے کو حصہ دار بنانے والے ہوئے اوران دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے۔ یہی فرق نہ سمجھنے سے مغالطہ ہوگیا ہے۔

چند آدمیوں کا ایک بکرا یا ساتواں حصہ بقرہ (سبع بقرہ) خرید کر، مالک بن کر پھر کسی ایک کے نام سے قربانی کرادینا یا بذریعہ وراثت اس کا مالک ہوکر کسی ایک کے نام اس کی قربانی کرادینا ایک ہی چیز ہے۔ اور اس کے جواز کی تصریح موجود ہے۔

کمافی الدر علی ھامش الشامی ص۲۴۴/ج۵ وان مات احد السبعۃ المشترکین فی البدنۃ وقال الورثۃ اذبحوا عنہ وعنکم صح عن الکل استحسانا لقصد القربۃ من الکل۔

وھکذا فی العالمگیریہ ص۱۷۴/ج۴ (نولکشوری) واذا اشتری سبعۃ بقرۃ لیضحوا بھا فمات احد السبعۃ وقالت الورثۃ وھم کبار اذبحوا عنہ وعنکم جاز استحسانا الخ

لہٰذا آپ حضرات کے یہاں (برطانیہ میں) جو طریقہ رائج ہے وہ بلاشبہ جائز و درست ہے، آپ حضرات کسی شک و شبہ میں نہ پڑیں۔ اور یہ بات الگ ہوگی اور بہت اعلیٰ وارفع ہوگی کہ ایک شخص تنہا ایک بکرا خرید کر سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے نام پر تنہا قربانی کردے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ احقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند

۲۲/۱۱/۹۱ھ ۱۲/۱/۷۲ء

حق تصنیف سے متعلق سوال وجواب

سوال (۲۰) کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل میں:-

زید بہت بڑا عالم دین ہے اس نے ایک ابتدائی مذہبی کتاب لکھی جس میں

بچوں کو سوال و جواب کے طور پر عقائد و اعمال کے ضروری مسائل سکھائے ہیں۔ پھر وہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ بہت سے دینی مدارس میں داخل نصاب کر لی گئی۔ اور بہت سے لوگوں (اہل علم و تجارت) نے اس کو چھپوا کر شائع کیا، مگر زید نے کبھی کسی پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ زید کے انتقال کے بعد کچھ مدت گذرنے پر عمر نے اس کتاب کو بغرض اشاعت علم و تجارت چھپوایا۔ اس پر زید کے ورثہ مطالبہ کرتے ہیں کہ تمہارے اس کتاب کو چھپوانے سے ہماری تجارت کو نقصان پہنچا تم نے بلا اجازت اس کو چھپوایا ہے، لہٰذا ہمارے نقصان کا ہرجانہ اتنے ہزار روپیہ ادا کرو۔ ورنہ ہم عدالت میں مقدمہ دائر کرتے ہیں کہ تم نے ہماری کتاب کو بلا اجازت چھپوایا ہے۔

اب سوال یہ ہے (۱) کیا زید کے لئے خود یہ بات جائز تھی کہ وہ اپنی لکھی ہوئی دینی ضروری کتاب کی طباعت کے حقوق قانونًا محفوظ کرائے کہ کوئی دوسرا شخص نہ چھاپ سکے۔

(۲) کیا زید کے ورثہ کے لئے خود یہ بات جائز ہے کہ انتقال زید کے بعد دوسرے لوگوں کو اس کے چھاپنے سے منع کریں۔؟

(۳) کیا زید یا زید کے ورثہ کے لئے یہ بات درست ہے کہ وہ حقوق طبع کسی پریس یا تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اور کیا شرعًا ایسی بیع درست ہوگی؟ اور اس بیع سے حاصل شدہ روپیہ جائز ہوگا؟ حق طبع مال متقوم ہے یا غیر متقوم؟

(نوٹ) حضرت مولانا عبدالغنی صاحبؒ سابق مفتی مدرسہ امینیہ نے مندرجہ بالا سوالات کے جوابات تحریر فرمائے ہیں۔ وہ حضرات علماء کرام سے استصواب کے لئے شائع کئے جارہے ہیں۔ ان کے متعلق حضرات علمائے کرام کی ہر ایک رائے (خواہ وہ موافق ہو یا مخالف) قابل احترام ہوگی اور مناسب سمجھا گیا تو اس کو شائع

بھی کر دیا جائے گا۔

الجواب :- یہ اجتہادی اور قیاسی مسئلہ ہے، قرون اولیٰ میں فن طباعت کا نہ وجود تھا، اور نہ طباعت کے ساتھ مالی منفعت کے متعلق ہونے کا تصور تھا۔ لہذا اس کے بارے میں صراحۃً کوئی حکم مذکور نہیں ہے۔ لیکن اگر طباعت کو غیر متقوم اور مباح الاصل مان لیا جائے، تب بھی ایسی کتاب جس کیساتھ مصنف کی مالی منفعت یا تجارتی مفاد وابستہ ہو تو اس کو ہر کس و ناکس کا بلا اجازت مصنف طبع کرنا جائز نہیں، کیونکہ بعض افعال ایسے ہیں کہ اصل کے لحاظ سے مباح ہوتے ہیں، لیکن اگر ان کے کرنے میں دوسرے شخص کی حق تلفی اور ضرر کا امکان ہو تو ان کی اباحت ساقط ہو جاتی ہے اور وہ ممنوع شرعی بن جاتے ہیں، مثلاً ایک مسلمان عورت کو نکاح کا پیغام دینے کی ہر مسلمان مرد ہم کفو کو اجازت ہے، لیکن پیغام پر پیغام دینا ممنوع ہے، یعنی اگر ایک مسلمان مرد نے ایک ہم کفو مسلمان عورت کو اپنے نکاح کا پیغام دیدیا ہو، اور اولیاء کا نکاح کا کچھ رجحان بھی پایا جائے، تو جب تک وہ عورت انکار نہ کردے، دوسرے کسی مسلمان کے لئے یہ مباح فعل جائز نہ ہوگا۔ نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یخطب الرجل علی خطبۃ اخیہ۔

ایک شخص کسی سے بھاؤ طے کرے تو تیسرے شخص کو دام لگانے کا حق نہیں رہا اپنے مکان کی چھت پر چڑھنے اور ہوا کھانے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے، مگر جب دوسرے لوگوں کے گھروں کی بے پردگی ہوتی ہو تو اس مباح کی اباحت نہیں رہے گی (کفایت المفتی کتاب المضاربت والشرکت)

مسجد میں ہر جگہ بیٹھنا ہر نمازی کے لئے مباح ہے۔ کوئی مقام کسی شخص واحد کے لئے مخصوص نہیں، لیکن اگر کوئی شخص کسی جگہ پر آکر بیٹھ جائے اور اپنا

کپڑا وغیرہ رکھ کر کسی ضرورت کے لئے اٹھے تو اس جگہ بیٹھنا دوسروں کے لئے ممنوع ہے یعنی اس جگہ کو جب شخص واحد نے اپنے لئے مخصوص کرلیا تو دوسروں کے لئے اس کی اباحت نہ رہی، علامہ شامی نے باب مایفسد میں مطلب فیمن سبقت یدہ الیٰ مباح کے تحت مفصل طور پر بیان کیا ہے کہ کسی مباح کے ساتھ جب کسی شخص کا حق متعلق ہو جائے تو وہ دوسروں کے لئے مباح نہیں رہتا۔

کسی مصنف کی کتاب جو شب وروز کی شدید محنت کے بعد معرض وجود میں آتی ہے، اس کو طبع کرنے کا سب سے پہلا حق خود مصنف کو حاصل ہے۔ اور اس کا مقصد علم کی تبلیغ واشاعت کے ساتھ ہی مصنف کے لئے مالی منفعت کا حصول بھی ہے، تو جب تک مصنف کا حق اس کے ساتھ وابستہ ہے دوسروں کا حق اس کے ساتھ متعلق نہ ہوگا۔ ایسے تاجرانِ کتب جو مصنف کی طرف سے کتاب کی معتد بہ تعداد کی اشاعت کے باوجود اس کی کتاب کو بلا اجازت چھاپ لیتے ہیں، وہ اس کتاب کی مقبولیت سے مالی اور تجارتی فائدہ حاصل کرنے کیلئے ایسا کرتے ہیں اور ان کا یہ عذر غیر مسموع ہے کہ انھوں نے علم کی اشاعت کے لئے ایسا کیا ہے۔ کیونکہ اگر ان کے دل میں علم کی دفعت اور اشاعت علم کا جذبہ ہوتا تو وہ بڑی تعداد میں مصنف سے کتاب خرید کر غریبوں میں مفت تقسیم کرتے، اور ثواب حاصل کرتے۔

اب رہا یہ سوال کہ حق طباعت کا معاوضہ لینا مصنف کے لئے جائز ہے یا نہیں ؟

حقوق مجردہ میں سے وہ حقوق جن میں کوئی مالی منفعت نہیں پائی جاتی یا وہ تحصیل مالی کا ذریعہ نہیں بن سکتے بلکہ محض دفع ضرر کے لئے اثبات حق ہوتا ہے مثلاً حق شفعہ سوء جوار سے مامون رہنے کے لئے یہ حق دیا گیا ہے۔ بیشک ایسے

حقوق کا مالی معاوضہ لینا جائز نہیں، لیکن بعض حقوق ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ صاحب حق کی مالی منفعت حال یا مستقبل میں متعلق ہوتی ہے۔ مثلاً حق وظائف یعنی شاہی مناصب توان کا معاوضہ مال کی صورت میں لینا یا مال کے معاوضہ میں حق سے دست بردار ہونا جائز ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے حق خلافت سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دست برداری دے کر معاوضہ قبول فرمایا تھا۔ (الاشباہ والنظائر للحموی وشامی فی غایۃ الاوطار)۔

اپنے کاروبار کا کوئی نام رکھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ جس کو آج کل کی اصطلاح میں گڈول کہتے ہیں، لیکن اگر ایک شخص نے اپنے کاروبار کا نام عطرستان یا گلشن ادب، رکھ لیا، اور اس سے اس کا تجارتی مفاد وابستہ ہو گیا تو دوسرے شخص کو وہ نام رکھنے کا حق نہیں رہا۔ اور جب کہ ایک خاص نام کے ساتھ مستقبل میں تحصیل مالی اور تجارتی منفعت مقصود ہے۔ تو گڈول کا معاوضہ لینا جائز ہے (حوادث الفتاویٰ حصہ چہارم)

اسی طرح کتاب کا حق طباعت جب کہ اس کے ساتھ مصنف کی مالی منفعت حال میں یا مستقبل میں متعلق ہے۔ وہ حق بالاصالۃ ہے۔ اور مصنف اس حق کو معاوضہ لے کر منتقل بھی کر سکتا ہے، اور عہد حاضر میں ذرائع نقل وحمل اور وسائل نشر واشاعت کی بے پناہ وسعت کے ہوتے ہوئے اور مصنفین کے لئے اسباب قدردانی وہمت افزائی، نیز وجہ کفاف کے فقدان کی وجہ سے حق طباعت کا مصنف کے لئے محفوظ رہنا علمی بخل نہیں ہے، بلکہ اسی میں صالح لٹریچر کی بقاء وترقی مضمر ہے مگر صورت مسئلہ میں نقصان چونکہ نقصان منفعت ہے۔ اور وہ بھی غیر متعین اور مجہول ہے اس لئے موجب ضمان نہیں (شامی کتاب الغصب)

واللہ اعلم بالصواب ۔ کتبہ الاحقر نظام الدین عفی عنہ

دارالعلوم دیوبند

ڈرائی کلین میں دُھلے ہوئے کپڑوں کا حکم

سوال (۲۱) کیا فرماتے ہیں علمار دین اس مسئلہ میں کہ ڈرائی کلین میں دھلے ہوئے کوٹ، پتلوں یا شیروانی وغیرہ کی تطہیر کئے بغیر نماز پڑھنی یا پڑھانی درست ہے یا نہیں ؛ ڈرائی کلین میں ایک فلٹر میں چند گیلن پٹرول ڈال کر گرم کپڑے چار پانچ عدد ڈالدیئے جاتے ہیں اور مشین چالو کردی جاتی ہے، جس سے کپڑے پٹرول میں زوروں سے گردش کرنے لگتے ہیں اور میل کچیل پٹرول میں آجاتا ہے۔ پھر پٹرول کو نتھار کر کپڑے خشک کر کے پریس کردیئے جاتے ہیں۔ فلٹر میں جو کپڑے پڑتے ہیں ان میں نوے فیصد یقینی (پتلون وغیرہ) نجس ہوتے ہیں، لہذا ان کی وجہ سے ٹنکی یا پٹرول اور اس کے سارے کپڑے یقیناً نجس ہو جاتے ہیں جو محض خشک کرنے اور پریس کرنے سے پاک نہیں ہوتے۔ اس لئے ان میں ان کی تطہیر کے بغیر نماز کس طرح درست ہوسکتی ہے ؟ بینوا و توجروا۔

الجواب :- یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی کپڑا (سوتی ہو یا اونی یا ریشمی) ابتداءً جب بُنا جاتا ہے اور تیار کیا جاتا ہے اس وقت بھی اس کے دھاگے (تانے بانے وغیرہ) میں مسالہ (ماڑی وغیرہ) لگایا جاتا ہے اور وہ بھی اکثر غیر مسلم لگاتے ہیں، اور نہایت گندے پیروں سے اور گندی جگہوں میں خوب مسلتے ہیں، جس میں ناپاکیوں کی آمیزش کبھی دیکھی بھی جاتی ہے اور کبھی مظنون ہوتی ہے۔ اور تطہیر شرعی کے اصول تو قطعاً ملحوظ نہیں ہوتے جیسا کہ ان کے کارخانوں اور فیکٹریوں کا مشاہدہ کرنے والوں پر ظاہر ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ نئے کپڑے بھی خواہ سوتی ہوں یا اونی یا ریشمی بغیر شرعی ضابطہ سے پاک کئے ہوئے استعمال کرنا

درست نہ ہو، لیکن فتویٰ یہ نہیں ہے کیونکہ اصل اشیاء میں طہارت ہے کما فی الاشباہ جب تک ناپاکی لگی ہوئی یا لگتے ہوئے نہ دیکھ لیا جائے یا شرعی ثبوت یا شہادت سے ناپاک ہونا تیقن نہ ہو جائے ناپاکی کا حکم نہیں لگا سکتے۔

اسی طرح دیہاتوں میں عام طور پر سوتی کپڑے جو دھوئے جاتے ہیں وہ گدھوں کی لیدوں میں ملوث کرنے اور خوب ملنے کے بعد دھوئے جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات پانی کی کمیابی کی وجہ سے وہ ایک چھوٹے سے گڑھے میں اور کبھی محض ٹبوں میں دھوئے اور صاف کئے جاتے ہیں، اور خشک بھی بسا اوقات ناپاک زمینوں پر (جیسے تالاب وغیرہ کے گندے حواشی یا گندی جھاڑیوں میں)، پھیلا کر کئے جاتے ہیں جس کا مشاہدہ بھی عام ہے، اور جہاں کہیں دھوبی غیر مسلم ہوں اور آبادی بھی عموماً غیر مسلموں کی ہو، وہاں تو اس کا مشاہدہ اور بھی عام ہے مگر اس کے باوجود ان دھلے ہوئے کپڑوں پر ناپاک ہونے کا حکم نہیں ہوتا اور نہ بغیر شرعی ضابطہ سے پاک کئے ہوئے ان کپڑوں میں نماز پڑھنے سے نماز نہ ہونے ہی کا حکم دیا جاتا ہے۔ یہ صرف اسی قاعدۂ مسلمہ کی بناء پر ہے کہ اصل اشیاء میں طہارت ہے، پس جب تک اس کے خلاف دلیل شرعی سے نجاست کے تلوث و بقا کا یقین نہ ہو جائے حکم بالنجاست حکم شرعی نہ ہوگا، بالخصوص جب ابتلاء عام بھی اس میں شریک ہو جائے۔

بالکل اسی طرح یہاں پٹرول سے دھلے ہوئے کپڑوں کا بھی حکم ہوگا۔ بلکہ پٹرول کے اندر جذب نہ ہونے کی اور اڑ جانے کی قوت پانی سے کہیں زیادہ اور قوی ہوتی ہے۔ اور پھر اونی کپڑوں میں سوتی کپڑوں کے مقابلے میں جذب کرنے کی صلاحیت بھی تقریباً نفی کے برابر ہوتی ہے۔ اور اسی بناء پر اونی کپڑوں کو بھگا کر ٹانگ دو تو محض نچوڑنے کے ساتھ ہی ساتھ بالکل خشک ہو جاتے ہیں

بخلاف سوتی کپڑوں کے کہ نچوڑنے کے بعد بھی کافی تر رہتے ہیں، اس کا تقاضہ بھی یہ ہونا چاہیئے کہ اونی کپڑوں میں نجاست کی سرایت بھی بہت کمزور و ناپائیدار ہو، اور اس کے تطہیر کا طریقہ بھی سہل ہو، انہیں وجوہ کی بنار پر پٹرول سے دھلے ہوئے ان کپڑوں پر ناپاک ہونے کا حکم نہیں ہوتا۔ اور نہ ان کے دوبارہ دھونے کا حکم ہوتا ہے اور نہ تطہیر کرنے کا حکم ہوتا ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی نکل آئی کہ جب پٹرول میں کپڑوں کی گردش کرانے اور جھنجھوڑنے سے کپڑوں کے داغ دھبے (خواہ وہ ناپاکی ہی کے داغ دھبے ہوں) زائل ہو جاتے ہیں اور کپڑا صاف ستھرا ہو جاتا ہے تو جب پٹرول کپڑے میں جذب نہ ہو کر اڑ جاتا ہے اور اس کے اڑ جانے کے بعد بھی اثر نجاست (رنگ و بو و مزہ) باقی نہیں رہتا ہے بلکہ زائل ہو جاتا ہے تو کہنا پڑے گا کہ پٹرول ہی سے ازالہ ہوا ہے، اور تطہیر نام ہے اسی ازالۂ نجاست کا خواہ قلب ماہیت کی وجہ سے ہو جیسے شراب کا سرکہ بن جانا اور سرکہ کا پاک شمار کیا جانا، یا محض اڑ جانے سے ہو جیسے ناپاک روئی کے دھنکنے سے روئی کا پاک ہو جانا، یا غسل بالماء کے ذریعہ سے یا کسی بھی سیال طاہر شئی سے غسل کے ذریعہ سے۔ اور یہ صورت یہاں بھی حاصل ہے، لہٰذا اس بنار پر بھی دوبارہ تطہیر کا حکم دینے کی ضرورت نہ ہوگی۔

البتہ جن لوگوں کو اپنے کپڑے کی ناپاکی کا یقین ہو، مثلاً نجاست لگتے ہوئے یا لگی ہوئی خود دیکھی ہے تو ان کو پٹرول میں دھونے کے لئے دینے سے قبل خود پاک کر لینا چاہیئے یا پھر دھل کر آنے کے بعد احتیاطاً خود پاک کر لینا افضل ہوگا۔

اسی طرح یہ بات بھی الگ ہوگی کہ از روئے تقویٰ ایسے دھلے ہوئے کپڑوں کی تطہیر بقاعدہ شرع خود کر لی جائے مگر اس کو فتویٰ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ فقط

واللہ تعالیٰ اعلم ۔ کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہٗ

دارالعلوم دیوبند ۷؍۱؍۹۲ھ

الجواب صحیح

محمود عفرلہٗ ۷؍۱؍۹۲ھ

دادا کے موجودگی میں پوتے کا کیا حصہ ہے

سوال (۲۲) شریعت اسلامیہ کا یہ قانون ہے جس پر ایمان واعتقاد بھی ہے کہ دادا کی صلبی اولاد کی موجودگی میں پوتا مجوب ہوتا ہے اور وراثت سے محروم ۔ تو یہاں ذہنی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اسلامیہ کہ اس سے بڑھ کر کسی دین میں دلجوئی وتلطف رافت وشفقت علی الخلق نہیں ہے ۔ تو اس شریعت میں یہ قانون کہ دادا کی موجودگی میں پوتا وراثت سے مجوب ہوجاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا ۔ کیونکہ یہ پوتا سایۂ پدری سے محروم رہا، اب چاہئے تو یہ تھا کہ اس پر مزید انعامات واکرامات کیئے جاتے نہ یہ کہ وراثت ہی سے محروم ہوجائے ۔ گذارش یہ ہے کہ اس کا جواب مختصراً عنایت فرمائیں جس سے ذہنی خلجان وپریشانی دور ہوجائے ۔ بے حد ممنون ومشکور ہوں گا ۔

الجواب:۔ اس قانون (دادا کی میراث سے پوتا محروم ہوجاتا ہے) سے وحشت محض اس وجہ سے ہوگئی ہے کہ مسئلہ پورا ذہن میں نہیں رہا ۔ پورا مسئلہ ذہن میں آجانے کے بعد یہ وحشت یا اعتراض نہ رہے گا ۔ ہر حال میں پوتا وراثت سے محروم نہیں ہوتا بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر زید (دادا) کے کوئی اولاد نہ ہو تو پوتا بالکل ہر حیثیت سے بیٹے کے برابر اور مستحق ترکہ ہوتا ہے، اسی طرح اگر زید کے اولاد تو ہے مگر نرینہ نہیں بلکہ صرف لڑکیاں ہیں جب بھی پوتا محروم نہیں ہوتا، اسی طرح جب اس کی بیویاں ہوں جب بھی محروم نہیں ہوتا ۔ اسی طرح اس کے (زید کے) بھائی بہن ماں باپ ہوں جب بھی پوتا محروم نہیں ہوتا بلکہ مثل لڑکے کے

شمار ہوکر وراثت کا پورا پورا حقدار ہوتا ہے۔

محروم ہونے کی صرف ایک صورت ہے کہ زید (دادا) کے پوتے کے ساتھ بیٹا بھی موجود ہے تو چونکہ زید کا بیٹا زید کے پوتے کے اعتبار سے زیادہ قریب ہے اور وہ صلبی اولاد ہے، اور پوتا ایک واسطے کے بعد اولاد میں داخل ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ الاقرب فالاقرب کے قاعدے سے بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو استحقاق نہیں ہوسکتا، لیکن اس صورت میں بھی زید (دادا) کے لئے مندوب و مستحب یہ ہے کہ وہ اس محروم پوتے کے لئے بطور ہبہ کچھ دیدے یا ثلث ترکہ کے اندر اندر کچھ وصیت کردے تاکہ پوتا بے سہارا نہ رہے حتی کہ اگر زید (دادا) کچھ ہبہ یا وصیت نہ کرسکا تو زید کے لڑکے کے لئے بہتر ہے کہ وہ اپنے بھائی کی اولاد کو تبرعاً کچھ دے کر آباد کرے۔

اب غور کیجئے کہ اسلام کے قانون میں کہاں رأفت و رحمت کے خلاف تعلیم کا شبہ یا شائبہ ہے۔؟ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

مفتی دارالعلوم دیوبند ۹/۹۲ ھ

سوال (۲۳) قبرستان کو آمدنی کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے؟

مرکزی انجمن تحفظ مساجد و قبور آندھرا پردیش آپ کو واقف کرتی ہے کہ صوبہ آندھرا پردیش بالخصوص شہر حیدرآباد میں آئے دن قبرستانوں پر ناجائز قبضوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے بعض قبرستانوں کو آندھرا پردیش وقف بورڈ جس پر صیانت کی براہ راست ذمہ داری قانون اوقاف دفعہ ۱۵ ۱۹۵۴ء کے تحت عائد ہوتی ہے۔

خود آندھرا پردیش وقف بورڈ کئی قبرستانوں کے بعض حصوں کو کرایہ وغیرہ سے آمدنی وقف بورڈ کے عنوان سے دیا ہے اور بعض قبرستانوں کو بلڈنگیں

وغیرہ بنانے کے، نیز کئی سال اجارہ پر دے چکا ہے۔ مرکزی انجمن نے جب بھی ارباب وقف بورڈ سے یہ کہا کہ آراضی قبرستان کو آمدنی وقف بورڈ کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا تو ارباب بورڈ نے کہا کہ ہمارے پاس فتویٰ موجود ہے کہ فارغ آراضی قبرستان کو آمدنی کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مرکزی انجمن عالیجناب سے یہ سوال کرتی ہے کہ واقف جس غرض وغایت کے لئے آراضی کو وقف کرتا ہے واقف کے منشاء کے خلاف جانے کا کسی فرد یا حکومت کو بھی حق نہیں پہنچتا جبکہ شہر وصوبوں میں بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر قبرستانوں کی صیانت ایک مسئلہ بن چکی ہے، وغیرہ شرع میں پکی قبر بنانا جائز ہے یا نہیں، چونکہ قبرستان محدود ہونے کی بنیاد پر آیا قدیم قبروں کو منہدم کر کے مزید میتوں کو دفن کیا جا سکتا ہے، چونکہ بعض افراد یہ کہ رہے ہیں کہ ساٹھ سال کے بعد قبر کو مسمار کرنے کا حکم حدیث شریف میں موجود ہے اس تاویل کی بناء پر کئی قبرستانوں میں اعلانیہ عمارتیں وغیرہ تعمیر ہو رہی ہیں۔ اور مرکزی انجمن آخر میں مسلمانوں کی آخری آرام گاہ کی صیانت وحفاظت کے لئے علماء کرام سے فتویٰ حاصل کرنا چاہتی ہے تاکہ بعض غرض مند افراد کے غلط پروپیگنڈے ختم ہو جائیں

امید کہ جناب عالی زحمت فرما کر عاجلانہ طور پر متذکرہ سوالات کے جوابات مفصل باضابطہ فتویٰ عنایت فرمائیں گے۔

الجواب:۔ مسئلہ یہ ہے کہ جو قبرستان موقوفہ نہیں ہیں مملوکہ ہیں ان میں اصل مالکوں کو تصرف کا حق حاصل ہے۔ لیکن جو قبرستان موقوفہ ہیں، ان کا حکم یہ ہے کہ جب تک ان میں مردے دفن کئے جا سکتے ہوں صرف مردے ہی دفن کرنا متعین ہے اس کے علاوہ کسی اور کام میں اس طرح لانا جس سے منشاء واقف فوت ہو درست وجائز نہیں۔

ہاں جو موقوفہ قبرستان اس حالت میں پہنچ گیا ہو کہ اس میں تدفین موقوف ہو گئی ہو

اور آئندہ اس کی توقع بھی نہ ہو کہ تدفین ہوگی بلکہ اس کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ ہوگیا ہو تو اس کے اور اس کے واقف کے منشاء کے تحفظ و بقاء کے لئے جو مناسب صورت ہو اختیار کرنا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ اس کو چہار دیواری سے محفوظ کر کے اس میں کل کے اندر باغ لگاکر یا مثلاً اس کے حواشی پر بیرون رخ دکانیں اور اندر باغ لگاکر اس کی آمدنی دوسرے محتاج اعانت قبرستان پر خرچ کیا جائے۔ اور اگر دوسرا قبرستان محتاج اعانت نہ ہو تو اس کی آمدنی دینی مدارس پر خرچ کی جائے۔ یا اس میں مسجد تعمیر کردی جائے، یا دینی مدرسہ قائم کردیا جائے۔ اور جب بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر قبرستانوں کی زیادہ ضرورت ہو تو اس صورت میں اس کی آمدنی سے دوسرے محتاج اعانت قبرستان پر خرچ کرنا یا مستقل دوسرا قبرستان قائم کرنا زیادہ قابل ترجیح ہوگا۔ ذاتی و شخصی رہائش گاہ وغیرہ بنالینا یا کوئی عمل ایسا کرنا جس سے وقف ہی بالکلیہ فوت ہوجاتا ہو ہرگز جائز نہ ہوگا

معلوم نہیں کہ (وقف بورڈ والوں کے پاس) کیا فتویٰ ہے اور کہاں سے گیا ہے جب تک وہ فتاویٰ سامنے نہ ہوں ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔

قانون شرع میں پکی قبریں بنانا جائز نہیں ہے۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ جب قبر اتنی پرانی ہوجائے کہ جسد میت مٹی ہوچکنے کا ظن غالب ہوجائے تو اس میں دوسرا مردہ دفن کرسکتے ہیں۔ جسد میت کا مٹی ہوجانا یہ ملک و موسم کے اختلاف سے اور خود میت کے احوال کے اختلاف سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے پرانا ہونے کی تحدید و تعیین ساٹھ سال کے ساتھ کسی حدیث میں نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دارالعلوم دیوبند

۲/۲/۹۲ھ

بھوپال کے بعض اوقاف کا حکم

سوال (۴۲) کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین اس مسئلہ میں کہ سابقہ ریاست بھوپال میں جو بیگمات کے زیر حکومت تھی، فرمانروائے وقت سرکار شاہجہاں بیگم صاحبہ نے ایک پروانہ بتاریخ ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ جاری فرمایا جس کی رو سے کچھ باغات ریاست کو وقف فرمایا تھا۔ پروانہ کی نقل شامل ہذا ہے اس وقت ریاست کی جو رپورٹ سالانہ شائع ہوئی تھی اس کی دفعہ ۳۵ میں بھی اس کارروائی کی تصدیق کی گئی تھی۔ رپورٹ مذکور کا اقتباس متعلقہ بھی شامل ہے۔

۲:۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اس وقت کے نظام حکومت کے اعتبار سے۔

(۱) فرمانروائے وقت مختار کل اور ریاست کی جملہ املاک کا مالک کامل ہوتا تھا

(۲) ریاست کے اندر جو اوقاف واقع تھے ان کے متعلق قوانین واحکام وقت میں مرقوم تھا کہ تمام اوقاف شاہی (افراد خاندان شاہی کے قائم کردہ اوقاف) کی اور اوقاف عامہ (دیگر اشخاص کے قائم کردہ اوقاف) میں سے ان اوقاف کی جن کا کوئی متولی نہ ہو ریاست متولی ہوگی۔

(۳) سرکار شاہجہاں بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد ان کی جانشیں سرکار سلطان جہاں بیگم صاحبہ ہوئیں، اور انھوں نے ان میں سے ایک باغ موسومہ عیش باغ کو اپنے صاحبزادے نواب نصر اللہ خاں صاحب کو معافی میں دیدیا اور ان کے بعد دوسرے صاحبزادے نواب حمید اللہ خاں صاحب کو دیدیا، یا نواب صاحب موصوف نے جو بعد میں خود فرمانروا ہو گئے تھے اپنے حکم سے اپنے نام کرلیا۔ چنانچہ بعد کے کاغذات دیہی میں یہ باغ نواب حمید اللہ خاں صاحب کے نام درج ہوا۔ اور اب بھی ان کی صاحبزادی کے نام درج ہے۔

(۴) ازراہ کرم مطلع فرمایا جائے کہ۔

(۱) کیاان دستاویزات کی رو سے جن کی نقول شامل ہذا ہیں، باغات متذکرہ شمول عیش باغ دواماً وقف ہو گئے تھے؟

(۲) اس پروانہ مؤرخہ یازدہم ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ میں جس کی نقل شامل ہے "نیابتاً" وقف کیاجانا مذکور ہے، کیااس عبارت سے قائمی وقف میں کوئی نقص واقع ہوگیا ہے؟

(۳) کیا فرمانروایان مابعد کے عمل سے جس کی تفصیل پیراگراف ۳ مندرجہ بالا میں دی گئی ہے وقف متاثر اور زائل ہوگیا ہے؟۔

الجواب:- جب فرمانروایان حکومت بھوپال جملہ املاک ریاست کے مالک تھے تو ان کے کسی وقف نامہ میں محض لفظ نیابۃً واقع ہو جانے سے کسی وقف میں کوئی نقص واقع نہ ہوگا۔ بلکہ نیابۃً لکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ نے ۱۲۸۰ھ میں فرحت باغ کو وقف کیا ہے، اسی طرح ان ہی کے نقش قدم (نیابۃً) میں (سرکار شاہجہاں بیگم صاحبہ) بھی ۱۳۰۲ھ میں نور باغ کو نواب جہانگیر محمد خاں صاحب مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے وقف کیا اور عیش باغ کو نواب قدسیہ بیگم صاحبہ مرحومہ کے ایصال ثواب کے لئے وقف کرتی ہوں۔

صرف فرق اتنا ہے کہ نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ نے بذریعہ وصیت ۱۲۸۰ھ اس وقف کا اظہار کیا ہے اور سرکار شاہجہاں بیگم مرحومہ نے بذریعہ پروانہ سرکاری (حکم نامہ)، بابت ۱۳۰۲ھ وقف کیا ہے۔ لہذا سب صحیح و نافذ ہیں، اور اس لفظ (نیابۃ)، سے کوئی وقف زائل نہ ہوگا۔

اور پھر سرکار سلطان جہاں بیگم صاحبہ نے جو عیش باغ کو اپنے صاحبزادے نواب نصر اللہ خاں صاحب کو یاان کے بھائی نواب حمید اللہ خاں صاحب کو دیدیا یا جناب نواب حمید اللہ خاں صاحب نے اپنے دور فرمانروائی میں اپنی صاحبزادی کو دیدیا

اگرچہ بنام معافی دیا ہے مگر چونکہ حسب تصریح پروانہ یازدہم ربیع الثانی ۱۳۰۲ء مشمولہ مثل ۱۵ مد مال دفتر انشار، باقاعدہ وقف مکمل ونافذ ہوچکا ہے، اس لئے اس لفظ (معافی) سے مراد تملیک یا ہبہ نہ ہوگا بلکہ حسب ضابطہ شرعیہ کلیہ (کسی عاقل بالغ کا قول مہما امکن محمل حسن پر محمول کرنا ضروری ہوتا ہے (شرح سیر کبیر للسرخسی) یہ توجیہ ہوگی کہ ان فرمانروایاں وقت (جناب سرکار سلطان جہاں بیگم وجناب نواب حمیداللہ خاں صاحب) نے محض اپنا حق تولیت ان کے سپرد کیا ہے اور اپنا حق تولیت ان کے حق میں معاف کیا ہے اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم نے پہلے یہ حق جناب نصراللہ خاں صاحب کو دیا، پھر ان سے لے کر یا ان کے بعد اسی حق کو جناب حمیداللہ خاں صاحب کو دیا ہے، پس اگر اسی طرح دینے کو تملیک سمجھا یا اپنے کو عیش باغ کا مالک سمجھا یا اپنی صاحبزادی کو بطور تملیک وہبہ دیا تو یہ ان کی سمجھ کی غلطی تھی، مگر اس غلطی سے عیش باغ کا وقف ختم نہ ہوگا، اور نہ اس میں فتور واقع ہوگا (اور اگر ایسا نہیں ہے تو ان کی یہ غلطی بھی نہیں ہے، بہر حال) اس صورت میں بھی یہ وقف (وقف عیش باغ) قائم وصحیح رہے گا، اور صاحبزادی صاحبہ بھی متولیہ ہی شمار ہوں گی۔ اور حقوق وفرائض تولیت ان پر بھی حسب شرائط وقف متوجہ ہوں گی، اور بس، اور ان فرمانروایاں وقت کا یہ دینا قریب قریب ایسا ہی ہوا جیسا کہ باغ فدک جو پہلے سے وقف تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیا اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دیا۔ اور یہ دینا تملیک وہبہ شمار نہ ہوا، بلکہ بطریق تفویض تولیت تھا۔ فقط

واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین دارالعلوم دیوبند

۱۷/۵/۹۳ھ

ممتدۃ الطہر مطلقہ کی نکاح ثانی کیلئے جواز کی ایک صورت

سوال (۲۵) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کے ساتھ بکر کی شادی ہوئی، شادی ہونے کے بعد بچی پیدا ہوئی، بکر نے اپنی منکوحہ کو طلاق بائن دیدیا۔ بکر کی بچی تقریباً پونے دو سال کی ہے، اب تک ہندہ کو پیدائش کے بعد سے حیض نہیں آیا ہے۔ ہندہ اب ایک دوسرے شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے مگر حیض نہ آنے کی وجہ سے عدت پوری نہیں ہو رہی ہے۔ اس کو لوگوں نے حیض جاری کرنے کے لئے علاج کا مشورہ دیا ہے، ایک ماہ تک علاج ہوا مگر حیض جاری نہیں ہو رہا ہے۔ اگر کوئی صورت شادی کرنے کی ہو تو تحریر فرمایا جائے یا اس سلسلہ میں کوئی مشورہ تحریر فرمایا جائے، شادی کی سخت ضرورت ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: ۔ ایسی عورت کو دوسرے شخص سے نکاح کرنے کے لئے حنفیہ کا مسلک مختار تو یہی ہے کہ مدت ایاس تک جس کی کم سے کم مدت تیس برس کی عمر ہو جانے تک ہے انتظار کرے۔ اگر تیس سال کی عمر تک حیض نہ آئے تو آئسہ سمجھ کر تین ماہ عدت گذار کر دوسرا نکاح کرے، اس لئے اگر اس کو نکاح کی ضرورت ہے تو بہتر یہی ہے کہ اسی سابق شوہر سے نکاح کرے کہ اس کے ساتھ نکاح کرنے میں کسی عدت گذارنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن اگر سابق شوہر پھر نکاح کرنے پر تیار نہ ہو، اور یہ عورت بے سہارا ہو کہ نان و نفقہ کا کوئی نظم نہ ہو یا حالات ایسے ہوں کہ بغیر دوسرا نکاح کئے باعصمت زندگی گذارنا دشوار ہو تو اس کو اختیار ہے کہ جماعت مسلمین (شرعی پنچائت) بنا کر جس میں کم از کم تین دیندار با اثر معاملہ فہم، معزز مسلمان ہوں، اس شرعی پنچائت کے سامنے درخواست دے کر بغیر دوسرا نکاح کئے ہوئے اپنی باعصمت زندگی دشوار ہونے کو نیز نان و نفقہ وغیرہ کی اگر مجبوری ہو، بے سہارا ہو، ان باتوں کو ثابت کر کے دوسرا نکاح کر لینے کی

اجازت کا مطالبہ کرے۔

پس جماعت مسلمین (شرعی پنچائت) اگر اس کے مطالبہ کو مبنی بر حقیقت وصحت سمجھتے ہوئے حیلہ ناجزہ میں لکھے ہوئے ان وجوہ وعلل کے مطابق جو موجب ہوتے ہیں حضرت امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق زوجہ مفقود ومتعنت وغیرہ میں فسخ نکاح کے فیصلہ کے لئے۔ اگر اس عورت بھی حضرت امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق ۹ ماہ یا ایک سال مزید حیض کے انتظار کے بعد ختم عدت کا حکم دے کر دوسرا نکاح کر لینے کی اجازت دیدے تو اس عورت کو جماعت مسلمین کے اس فیصلہ کے مطابق عمل کر لینا اور دوسرا نکاح کر لینا درست رہے گا۔

اس فیصلہ کے جواز نفاذ کے دلائل شامی ص۸۲۹/۲ اور حیلہ ناجزہ ص۶۳ و ۹۵ سے بھی مستنبط ہوتے ہیں، اور یہ مسئلہ زوجہ مفقود یا متعنت کی نظیر بن سکے گا۔ فقط

واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دار العلوم دیوبند ۱۵/۳/۹۳ھ

امام کو مصلی پر اقامت کیلئے کب کھڑا ہونا چاہئے

سوال (۲۶) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلوں میں کہ۔

(۱) ہمارے یہاں ایک جماعت اقامت میں "حی علی الصلوٰۃ" پر کھڑی ہوتی ہے، اور کچھ لوگ اسے ناجائز سمجھ کر سختی سے مخالفت کرتے ہیں حتی کہ مخالفین نے پرچے چھپوا کر تقسیم بھی کئے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا اس مسئلہ کا ثبوت احادیث کریمہ یا شرح احادیث یا کتب فقہ سے بھی ہے یا نہیں۔ مسئلہ حی علی الصلوٰۃ کے عاملین ثبوت میں مشکوٰۃ شریف وشرح مرقات واشعۃ اللمعات وفتاویٰ عالمگیری وشرح وقایہ کی عبارت حتی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مذہب حوالہ میں پیش کرتے ہیں،

آیا ان کتب معتبرہ کے حوالہ جات حی علی الصلوٰۃ پر کھڑے ہونے کے لئے صحیح ہیں یا نہیں، اگر صحیح ہیں تو اس کو ناجائز سمجھنے والے اور امام اعظمؒ کا مذہب نہ ماننے والے از روئے شرع کیا حکم رکھتے ہیں۔

(۲) مخالفین یہ کہتے ہیں کہ علماء فرنگی محل کے نزدیک بھی اقامت میں حی علی الصلوٰۃ پر کھڑا ہونا جائز نہیں ہے، کیا واقعی ان کا قول صحیح ہے، اگر صحیح ہے تو حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ کا شرح وقایہ جلد اول کے حاشیہ پر اس کے جواز پر دلیلیں لکھنا اور عدم جواز کو مکروہ جاننا کیا معنیٰ رکھتا ہے۔

(۳) توہین رسولؐ کرنے والے کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں خواہ وہ اہانت کسی قسم کی ہو۔

الجواب:- (۱) جب امام، سب مقتدی مصلّٰی پر پہلے سے اس طرح موجود ہوں کہ یا تو صف بھی سیدھی کر چکے ہوں یا صف سیدھی کرنے میں دیر نہ لگے گی، اور تکبیر تحریمہ کی فضیلت فوت نہ ہوگی تو ادب یہ ہے کہ لوگ حی علی الصلوٰۃ پر کھڑے ہوں اور قد قامت الصلوٰۃ پر یا اس کے بعد معاً نماز کا تحریمہ بندھ جائے، ادب کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پہلے اگر کھڑے ہو جائیں تو مکروہ یا بُرا نہ ہو مستحق عتاب ونکیر نہ ہو فقہاء نے اس مسئلہ کو اسی ادب کے موقع میں لکھا ہے۔ چنانچہ تنویر الابصار میں، اور اس کی شرح درمختار میں اس طرح ہے کہ ولہا آداب ترکہ، لایوجب اساءۃ ولا عتاباً کترک سنۃ الزوائد لکن فعلہ افضل (نظرہ الی موضع سجودہ حال قیامہ (الی قولہ) والقیام لامام ومؤتم حین قیل حی الفلاح ..... ان کان الامام بقرب المحراب والا فیقوم کل صف ینتھی الیہ الامام علی الاظہر وان دخل من قدام قاموا حین یقع بصرھم علیہ الخ

(درمختار جلد اول ص۴۲۶ و۴۲۷)۔

اسی عبارت کا یہ جملہ "ان کان الامام بقرب المحراب" مفہوم بالا کا پورا پتہ دیتا ہے اس کا حاصل یہ ہوا کہ نفس جواز میں کلام نہیں، لیکن اس کو واجب اور ضروری قرار دینا کہ جو پہلے کھڑا ہو جائے، اس پر نکیر یا طعن و تشنیع کیا جائے جیسا کہ اس پر اصرار کرنے والے کرتے ہیں یہ ناجائز ہے۔

اور اگر امام بقرب المحراب موجود نہ ہو، اور نماز پڑھانے کے لئے پیچھے سے آئے تو جس صف میں پہنچتا جائے اس صف کے لوگ کھڑے ہوتے جائیں اور اگر سامنے سے آئے تو جس وقت لوگوں کی نظر امام پر پڑے اور سمجھ لیں کہ جماعت کرانے آرہا ہے تو امام پر نظر پڑتے ہی سب لوگ کھڑے ہو جائیں جیسا کہ عبارت بالا کے اس جملہ والا فیقوم کل صف الخ سے معلوم ہوتا ہے، اور اس میں حکمت یہ ہے کہ فوراً کھڑے ہو جانے میں امام کے مصلی تک پہنچنے میں صفیں سیدھی ہو کر (جس کے سیدھی کرنے کی بہت تاکید آئی ہے اور سیدھی نہ کرنے پر وعیدیں بھی وارد ہیں) تکبیر اولی میں امام کی معیت کی فضیلت بھی مل جائے گی اور وعیدوں سے حفاظت بھی میسر ہو جائے گی۔

اور یہی طریقہ جو فقہ کی مذکورہ بالا عبارت میں مذکور ہے۔ جناب سرکار دو جہاں کی تعلیمات اور صحابہ کرامؓ کے عمل میں ملتا ہے کتب صحاح حدیث و کتب غیر صحاح، جیسے مسلم شریف ابو داؤد شریف اور عبد الرزاق وغیرہا میں ایسا ہی معمول ملتا ہے جیسا کہ بذل المجہود ص۳۰۳ ج۱ میں دفع تعارض بین الروایات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ویجمع بان بلالا کان یراقب خروج النبیؐ فاول ما یراہ یشرع فی الاقامة قبل ان یراہ غالب الناس ثم اذا رأوہ قاموا فلا یقوم فی مکانہ حتی تعتدل صفوفھم قلت ویشھد لہ ما رواہ عبد الرزاق عن ابن جریج عن ابن شھاب ان الناس کانوا ساعة یقول المؤذن "اللہ اکبر" یقومون الصلوٰة فلا یاتی النبی مقامہ حتی تعتدل الصفوف الخ۔

انہیں احادیث و روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلالؓ حضورؐ کے نکلنے کے منتظر اور مراقب رہتے تھے، جیسے ہی حجرہ مبارک سے پردہ اٹھا اور اندازہ ہوا کہ جماعت کرانے تشریف لا رہے ہیں فوراً تکبیر شروع کر دیتے تھے اور لوگ بھی کھڑے ہو کر صفوں کی درستگی میں لگ جاتے تھے، یہ نہیں ہوتا تھا کہ آپ حجرہ مبارک سے نکل کر آکر مصلی پر بیٹھ لیں اس کے بعد مکبر تکبیر شروع کرے، اور پھر اس کے بعد آپ اور دوسرے لوگ کھڑے ہوں جیسا کہ آج کل کے بدعتی لوگ کرتے ہیں یہ ان کا من گھڑت طریقہ اور خلاف سنت ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جب تک سرکار دو جہاں جماعت کرانے کے لئے نہ نکلتے اسوقت تک لوگ بیٹھے رہا کرتے اور بیٹھ کر انتظار کرتے تھے۔ شروع زمانہ میں بعض مرتبہ لوگ پہلے ہی سے کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے تو اس سے روکا گیا جیسا کہ ابوداؤد شریف کی حدیث اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا تقوموا حتی ترونی الخ سے معلوم ہوتا ہے۔ یعنی فلا تقوموا منتظرین للصلوٰۃ (شرح ابوداؤد)، اور یہیں سے یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد میں آئے اور ابھی جماعت میں کچھ دیر ہے یا امام ابھی نہیں آیا ہے یا مکبر نے بغیر امام کی موجودگی کے تکبیر شروع کر دی ہے تو کھڑے کھڑے انتظار نہ کرے کہ یہ فعل مکروہ ہے بیٹھ جائے اور بیٹھ کر منتظر صلوٰۃ ہو، اور اسی کو مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ نے یا عالمگیری وغیرہ نے لکھا ہے۔ اس تفہیم و تشریح کے بعد تمام روایات فقہیہ و حدیثیہ آپس میں منطبق اور احناف کا صحیح مسلک واضح ہو جاتا ہے۔

(۳) توہین رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تو (نعوذ باللہ) کفر ہے مسلمان باقی نہیں رہے گا اس کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا سوال ہے اور کون مسلمان اس کی جرأت کر سکتا ہے، اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ بغیر وجہ شرعی کے کسی مسلمان کیطرف یہ نسبت معمولی گناہ نہیں ہے اگر یہ تہمت صحیح نہ ہوئی تو وہ توہین لوٹ کر اسی متہم کرنے والے پر آئے گی اور وہی اس جرم کا

مورد بن جائے گا جس کو وہ دوسروں پر تھوپنا چاہتا تھا، ایسی باتیں کہنا بڑے خطرے کا مقام ہے، متہم کرنے والے کو بھی اپنی خیر منانی چاہیئے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم۔

حررہٗ العبد نظام الدین مفتی دارالعلوم دیوبند
مورخہ ۶ / مارچ ۱۹۸۳ء یوم سہ شنبہ

گنّے کی پرچی خریدنا

سوال (۲۷) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے متعلق کہ ہمارے علاقے میں ایک طرح کا کاروبار ہوتا ہے، وہ یہ کہ کاشتکار چینی ملوں کو اپنا گنّا دیتے ہیں۔ اور چینی مل کی طرف سے کاشتکاروں کو ایک رسید کا پرزہ ملتا ہے جس پر گنّے کا وزن وغیرہ تحریر ہوتا ہے، دو ہفتہ یا ایک مہینہ یا اس سے بھی زیادہ مدت بعد اس رسید کے پرزے کو پیش کرنے پر مل کی طرف سے گنّے کا حساب ملتا ہے۔ بعض کاشتکار جو اتنے دنوں تک انتظار نہیں کر سکتے وہ پرزہ کی اصل قیمت سے تین چار روپیہ کم پر اس کو فروخت کرتے ہیں، کچھ لوگ پرزہ خریدنے کا کام کرتے ہیں۔ اور وہ اصل قیمت سے تین چار روپیہ کم پر اس پرزہ کو خرید لیتے ہیں اور جب مل کی طرف سے حساب ملنے لگتا ہے تو اس پرزہ کو پیش کر کے مل سے اس کا حساب لے لیتے ہیں۔ ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ رسید کا پرزہ خریدنے کا کام کرنے والے لوگ کاشتکار کو اپنے پاس سے چالان دیتے ہیں جس کی قیمت چار پانچ روپے ہوتی ہے۔ یہ چالان مل میں گنّا لے جانے کا اجازت نامہ ہوتا ہے۔ کاشتکار مل میں گنّا گرا کر اور رسید کا پرزہ لے کر آتا ہے تو پرزہ کا خریدار اکٹھے چالان کا دام اور تین چار روپئے اور کاٹ کر باقی حساب کاشتکار کو دیدیتا ہے۔ اور جب مل سے حساب ملنے لگتا ہے تو اس پرزہ کو پیش کر کے اس کا حساب لے لیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے پرزہ خریدنے کا کاروبار جائز ہے یا نہیں۔ برائے کرم مدلل جواب دیں، عین نوازش ہوگی

الجواب :- رسید کا پرزہ قیمت ملنے کا ذریعہ ہے، خود کوئی مال نہیں ہے اس کی بیع و شراء درست نہیں ہے، ہاں اگر پرچی (رسید کا پرزہ) بیچنے والے اور خریدنے والے بجائے خریدنے بیچنے کے اس طرح معاملہ کرلیں کہ پرچی کا مالک (گنا بیچنے والا) پرچی خریدنے والے سے یہ کہے کہ یہ گنے کی پرچیاں ہیں اس کو تم لیجاؤ مل سے اس کی رقم وصول کرلاؤ، ہم تم کو اجرت میں فی پرچی اتنا (تین روپیہ یا دو روپیہ) دیں گے یا یہ کہے کہ ہم تم کو لائی ہوئی رقم میں دو روپیہ سیکڑہ یا جتنا طے ہوجائے دیں گے تو یہ معاملہ اجارہ کا ہوگا جائز رہے گا، اور نیتجہ میں کوئی فرق نہ پڑے گا۔ صرف قاعدۂ شرع اور حکم شرع کے مطابق ہوجانے کی وجہ سے جائز ہوگا بلکہ باعث ثواب بھی ہوگا۔

یہ تاویل جواز اس صورت کی ہے جب پرچی بیچنے والا فوراً روپیہ خریدنے والے سے نہ لے، لیکن اگر پرچی بیچنے والا خریدنے والے سے فوراً اس کی قیمت لینا چاہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو اس کے لئے یہ حیلہ کرلینے کے بعد پھر دوسرا معاملہ اس طرح کرے کہ جتنے روپے خریدنے والے سے لینا چاہتا ہے اتنا روپیہ بطور قرض فی الوقت لیلے اور اس سے کہے کہ پرچی کا روپیہ وصول ہونے کی تاریخ میں جب اس کا روپیہ وصول کرکے لاؤگے اس وقت یہ قرض وصول کرلینا۔

دوسری صورت میں پرچی خریدنے والے جو کاشتکاروں کو چالان دے کر چالان کی قیمت وصول کرتے ہیں۔ اگر اس چالان دینے اور اس کی قیمت لینے کا مل مالکوں نے قانون بنایا ہے اور گورنمنٹ کی اجازت سے بنایا ہے تو جب تو یہ تاویل ہوگی کہ وہ چالان کی قیمت نہیں ہے بلکہ اجازت نامہ ملنے کی فیس ہے اور یہ دینا لینا درست ہوگا ورنہ یہ رشوت ہوگی۔ جس کے دفعیہ کے لئے مناسب کارروائی کرنی چاہئے۔ اور مجبوری میں دینے کی گنجائش رہے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ دارالعلوم دیوبند ۲۹/۱۲/۹۲ھ

پگڑی کا حکم

سوال (۲۸) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید کا انتقال ہوگیا، زید نے کرایہ پر مکان بلا پگڑی کے لیا تھا، جس کا کرایہ زید کی بیوی گھر کے خرچہ میں سے دیا کرتی تھی اور رسید زید کے نام سے کٹتی تھی۔ اب اس مکان کی پگڑی جو ملے گی وہ زید کی بیوی کو دی جائے یا سب وارثوں پر تقسیم کی جائے، بینوا توجروا۔

الجواب:- پگڑی کے روپیہ کی تقسیم کرنے کے سوال سے پیشتر یہ سوال کرنا چاہیئے کہ کرایہ دار کو محض کرایہ داری کے بنیاد پر اصل مالک کی اجازت و مرضی کے بغیر پگڑی کا روپیہ شرعاً لینا جائز بھی ہے یا نہیں۔ اصل مالک کی مرضی و اجازت کے بغیر اس کے لینے کی فقہاء اجازت نہیں دیتے۔

اصل مالک کی اجازت و مرضی کے بعد اس کا جواز نکلنے کی صورت میں اس روپیہ کی حقدار زید کی بیوی ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہٗ دارالعلوم دیوبند

۱۱/۱۲/۹۲ھ

تجارت کے فروغ کی ایک اسکیم کا حکم

سوال (۲۹) کیا فرماتے ہیں علماء دین صورت مسئولہ میں کہ۔ ایک شخص اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ ایک گھڑی کی قیمت سنتو روپے ہے اور بازار میں بھی اسی قیمت پر ملتی ہے اس کے واسطے پچاس ممبر بنائے گئے دس دس روپئے کے یہ اسکیم دس مہینہ چلائی جائیگی پہلے مہینہ جس شخص کا نام قرعہ اندازی میں نکل آیا اس کو دس روپئے میں گھڑی دے کر اس کا نام ممبری سے خارج کر دیا جائے گا، اسی طرح سے نو ماہ تک جس کا نام آتا جائے گا، اس کو گھڑی دے کر ممبری سے اس کا نام خارج کر دیا جائے گا، اور ان سے پیسے نہیں لئے جائیں گے۔

دسویں مہینہ اکتالیس اشخاص جو بچے ان کو ایک ایک گھڑی دے کر اسکیم ختم کردی جائے گی، اس صورت میں کسی کو دس روپے میں کسی کو بیس روپے کسی کو چالیس روپے میں، یہاں تک کہ کسی کو سٹو میں گھڑی ملے گی۔ لیکن قرعہ اندازی ضرور ہوگی۔

اب آپ حضرات سے دریافت طلب ہے کہ آیا شرعاً یہ صورت تجارت کے فروغ کی جائز ہے یا نہیں؟ مدلل ومفصل جواب سے نوازیں کرم ہوگا۔

الجواب:۔ اس طریق کار کا حاصل یہ ہے کہ یہ گھڑی بازار میں سٹو روپے کو ملتی ہے۔ اور اس دوکاندار نے کسی گاہک سے سٹو روپے سے زائد نہیں لیا بلکہ اپنی طرف سے پچاس گھڑیوں کا دام جو پچاس سو روپیہ ہوتا تھا۔ بجائے پچاس سو روپیہ کے صرف پینتالیس سو روپیہ لیے۔ تو گو پچاس گاہکوں میں سے بعض کو چھوٹ دی، یہاں تک کہ چار سو پچاس روپیہ کی چھوٹ دیدی۔ اور کسی گاہک سے سو روپیہ سے زاید (جو اصلی قیمت تھی) نہیں لیا، لیکن سوال یہ ہے کہ کوئی گاہک کچھ قسطیں دے کر مر جائے اور گھڑی ملنے سے پہلے مر جائے تو اس کو اس کی دی ہوئی قسط واپس ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر دی ہوئی قسط واپس دیدی جاتی ہے تو یہ محض چھوٹ ہوئی۔ اور جوا نہیں ہوا، اور معاملہ بالکل جائز رہا، اور محض تجارت کو فروغ دینے کا طریقہ ہوگیا، اور اگر دی ہوئی قسط (رقم) واپس نہیں کی جاتی تو جوا ہوگیا اور یہ معاملہ ناجائز ہوگیا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند ۔ ۲۷ / ۹ / ۹۲ھ

خاندان کا مشترک کاروبار اور تقسیم متروکات

سوال (۳۰) مفتیان شرع ذیل کے مسئلہ میں از روئے شرع کیا فرماتے ہیں۔

دو بھائی تھے بڑا مسمیٰ عبدالرؤف اور چھوٹا محمد شریف، بڑا بھائی سرکاری ملازم

تھا، اور چھوٹا بھائی کاروبار میں لگا تھا، اور دونوں ساتھ کھاتے پیتے اور گھریلو سارے کام مشترک طور پر کرتے تھے، چھوٹے بھائی نے ایک ہوٹل کیا اور خود چلانے لگے، پھر کچھ دنوں بعد چھوٹے بھائی کے لڑکے اسفند یار بھی ان کے ساتھ ہوٹل میں لگ گئے۔

پھر کچھ عرصہ بعد اسفند یار بھی سرکاری ملازم ہو گیا اور کچھ دنوں بعد چھوٹے بھائی محمد شریف گھر پر رہنے لگے، چونکہ اسفند یار سرکاری ملازم ہو گئے تھے اور ان کے باپ گھر رہنے لگے، اس لئے ہوٹل کا حال خراب ہو گیا اس لئے ایک صاحب مسمیٰ الیاس کو ہوٹل اس شرط پر دیدیا گیا کہ نصف آمدنی اسفند یار پسر مسمیٰ محمد شریف کو ملے گی اور نصف الیاس صاحب لیں گے۔ محمد شریف کے بڑے بھائی عبدالرؤف نے اپنی ذاتی کمائی سے دو رکشے بنوائے تھے جو چل رہے تھے، کچھ عرصہ بعد عبدالرؤف کا جو بڑا بھائی تھا انتقال ہو گیا، تو ان کے چھوٹے بھائی محمد شریف نے گھر کا انتظام مشترکہ طور پر سنبھال لی، اور عبدالرؤف صاحب مرحوم کے جے، پی فنڈ سے جو پانچ سو روپیہ ملا، وہ بھی شریف نے لے کر گھر کے مصرف میں اور دوکان مذکور کے قرض ادا کرنے میں یہ کہہ کر لگا دیا کہ خاندان کا سب کام مشترک ہے، لہذا یہ روپیہ سب کے کام میں لگا دیا جائے گا۔ پھر کچھ دنوں بعد شریف صاحب نے اپنے مرحوم بڑے بھائی کے اکیلے لڑکے مسمیٰ عبدالرزاق صاحب کو الگ کر دیا، اور بڑے بھائی کے ذاتی کمائی سے جو دو رکشے چل رہے تھے ایک۔ بڑے بھائی عبدالرؤف کے اکیلے لڑکے عبدالرزاق کو دیدیا اور ایک خود یہ کہہ کر لے لیا کہ سب چیز مشترکہ ہے تو آدھا میرا ہے اور آدھا تمہارا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ عبدالرؤف کی کمائی کے پانچ سو روپئے بھی شریف نے لے کر گھر میں لگا دیا اور رکشہ میں سے بھی بٹوارہ کر لیا لیکن شریف نے جو ہوٹل کیا تھا جس کو شریف کے لڑکے اسفند یار اور دوسرے آدمی محمد الیاس نصفا نصف کی شرط پر چلا رہے ہیں، اس میں سے شریف نے عبدالرؤف کے لڑکے

عبدالرزاق کو کچھ نہیں دیا، لہٰذا عبدالرزاق کا کہنا یہ ہے کہ جب میرے باپ کی کمائی میں آدھا آدھا بٹوارہ ہوگیا ہے تو چچا کی کمائی ہوٹل میں سے مجھے بھی حصہ مل جانا چاہئے اور اگر چچا کی کمائی سے حصہ نہیں ملتا ہے تو پھر چچا نے ایک رکشہ اور مبلغ پانچ سو ۵۰۰ روپئے جو میرے والد کی کمائی کے تھے کس طرح لے لئے ہیں وہ مجھے واپس ملنی چاہئے

۱۔ کیا عبدالرؤف اور شریف کی مشترکہ کمائی جو ہوٹل اور رکشہ ونقد پانچ سو روپئے کی شکل میں تھے اس میں دونوں کے لڑکوں کو آدھا آدھا ملے گا یا کس حساب سے حصہ ملے گا؟

۲۔ اگر دونوں کی کمائی الگ سمجھی جاتی ہے تو پھر عبدالرؤف کے لڑکے عبدالرزاق کو پانچ سو روپئے اور ایک رکشہ جو چچا نے لے لیا ہے ملے گا یا نہیں؟ اور شریف کی کمائی ہوٹل ان کے سب لڑکوں کو ملے گا یا صرف اسفندیار کو ملے گا جن کا نام شرائط نامہ مذکورہ بالا میں ہے؟

۳۔ جب محمد شریف نے اپنے بڑے بھائی کی کمائی سے مشترکہ ہونے کے ناطے حصہ آدھا بٹا لیا تو پھر محمد شریف کی کمائی ہوٹل سے بڑے بھائی کے لڑکے عبدالرزاق کو حصہ ملے گا یا نہیں؟

۴۔ اس وقت دونوں بھائی عبدالرؤف اور محمد شریف انتقال کر چکے، دونوں کے لڑکے اس طرح ہیں کہ عبدالرؤف کے صرف ایک لڑکا عبدالرزاق ہے اور محمد شریف کے تین لڑکے اسفندیار، محمد عیسیٰ اور محمد قمر ہیں۔ مفصل اور واضح طور پر تحریر فرمایئے کہ کس کس کو شرعاً کتنا حصہ ملے گا تاکہ جھگڑا ختم ہو جائے۔ بینوا توجروا۔

الجواب:- عبدالرؤف کی زندگی تک سب معاملات کھانا پینا رہنا سہنا مشترک تھا، عبدالرؤف کے انتقال کے کچھ دنوں بعد عبدالرؤف کے لڑکے عبدالرزاق الگ کر دیئے گئے۔ شرکت ختم ہوگئی، اس وقت ہر چیز نصف نصف تقسیم کر دینی چاہئے

تھی اور سارے معاملات صاف کر لینے چاہئے تھا، ایسا نہیں ہوا، اب شرعی حکم یہ ہے کہ مبلغ پانچ سو روپے چونکہ مشترک رہنے کے زمانہ میں خرچ ہو گئے ہیں۔ اس لئے مطالبہ کرنے کا حق نہیں، البتہ رکشا جس کو عبدالرؤف نے اپنی ملازمت کے زمانے کی الگ اور ذاتی روپیہ سے خریدا ہے۔ اگر حقیقتاً واقعہ ایسا ہی ہے تو وہ دونوں رکشا تنہا عبدالرؤف کے ورثار کو ملنا چاہئے، عبدالرؤف کے ورثار میں اگر تنہا ان کا ایک لڑکا ہی ہے تو وہی اس کا مستحق ہوگا۔ اور ہوٹل چونکہ مشترک رہنے کے دور میں شروع کیا گیا، اور محمد شریف (ہوٹل شروع کرنے والا) کی الگ کمائی نہیں ملازمت وغیرہ نہیں تھے اس لئے ظاہر و متبادر یہی ہے کہ مشترک سرمایہ سے شروع ہوا، اس لئے اس میں محمد شریف اور عبدالرؤف دونوں کی شرکت ہوگی۔ اور اس میں نصف عبدالرؤف کے ورثہ کا حق ہوگا، عبدالرؤف کے ورثہ میں جب صرف وہ ایک ہی لڑکا عبدالرزاق ہے تو ہوٹل میں نصف عبدالرزاق کا ہوگا اور نصف میں محمد شریف کے سب لڑکے شریک متصور ہوں گے۔

اسفندیار کا باپ کے ساتھ ہوٹل کے کام میں لگنے سے وہ ہوٹل اسفندیار کا شمار نہ ہوگا اور محض اسفندیار تنہا اس کے مالک شمار نہ ہوں گے بلکہ وہ محمد شریف کے معین و مددگار شمار ہوں گے اور ہوٹل محمد شریف و عبدالرؤف کا مشترک ہی شمار ہوگا، اسی طرح محمد الیاس کے ساتھ معاملہ کرتے وقت شرائط نامہ میں (اس اندراج سے کہ نصف آمدنی اسفندیار کی اور نصف محمد الیاس کی لکھ دینے سے)، وہ ہوٹل تنہا اسفندیار کا شمار نہ ہوگا بلکہ محض نصف محمد شریف کا رہے گا اور ان کے انتقال کے بعد ان کے تینوں لڑکوں کا ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۲۹ / ۱۲ / ۹۲ھ

اگر دودھ والا جانور رہن ہو تو اس کا حکم | **سوال (۳۱)** کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ :-

(۱) اردو ترجمہ مشکوٰۃ شریف صہ ۵۴ میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اگر سواری کا جانور رہن ہو تو اس پر جو خرچ کیا جاتا ہے اُس کے بدلے میں اس پر سواری کی جائے۔ اگر دودھ والا جانور ہو تو اس کے مصارف کے عوض اس کا دودھ پیا جائے اور جو شخص سواری کرے اور دودھ پیئے وہی اس کا خرچ اٹھائے (بخاری شریف)۔

اور ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ "اگر بکری گائے وغیرہ گروی ہو تو اس کا دودھ، بچہ وغیرہ جو کچھ ہو وہ بھی مالک کے ہیں جس کے پاس گروی ہے اس کو لینا درست نہیں دودھ کو بیچ کر دام کو بھی گروی میں شامل کر دے، جب مقروض تمہارا قرضہ ادا کر دے تو گروی کی چیز اور دودھ کے دام سب واپس کر دو اور کھلائی کے دام کاٹ لو" اب سوال یہ ہے کہ حدیث سے تو ثابت ہوتا ہے کہ رہن شدہ جانور کا دودھ اور سواری بعوض مصارف مرتہن استعمال کر سکتا ہے۔ اور مولوی صاحب کے بیان کے مطابق نہیں کر سکتا ہے۔ لہذا گزارش ہے کہ کونسی بات پر عمل کرنا صحیح ہوگا۔ مفصل تحریر کرنے کی تکلیف فرمائیں۔

(۲) مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کہتے ہیں کہ نبی صلعم نے فرمایا ہے کہ "سود ادھار میں ہے" اس کا کیا مطلب ہے، تاجر جو ادھار سے سامان کا لین دین کرتے ہیں، کیا جائز نہیں ہے؟ جو بات صحیح ہو مفصل تحریر فرمادیں، مہربانی ہوگی۔

(۳) ایک مولوی صاحب کا بیان ہے کہ "جو چیز تمہارے پاس کسی نے رہن رکھی ہے اس چیز کو کام میں لانا، اس سے کسی طرح کا نفع اٹھانا، اسی طرح باغ کا پھل کھانا، زمین کا غلہ یا روپیہ لے کر کھانا، گھر میں رہنا کچھ بھی درست نہیں ہے" لیکن کچھ لوگوں کا

کہنا ہے کہ اگر راہن مرتہن کو رہن شدہ جائداد سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیدے تو مطابق روایت شرح وقایہ، درمختار اور فتاوی عزیزی کے درست ہے۔ لہذا صحیح بات سے آگاہ فرمادیں۔

۲ زید نے اپنا ایک کھیت بکر کے پاس رہن رکھا، بکر اس میں کاشت کر کے فائدہ اٹھاتا ہے جس کی وجہ سے زید کو لگان یعنی مالگزاری دیتا ہے، اور رہن شدہ مکان میں رہتا ہے اور اس کا کرایہ دیتا ہے تو کیا بکر کا مکان میں رہنا اور کاشت کرنا جائز ہے؟

الجواب:- (۱و۳) حدیث مذکور کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ مرتہن نفقہ کے عوض میں ظہر مرہونہ پر سواری کرے یا مرہونہ کا دودھ پئے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شئ مرہونہ کا اصلی مالک راہن ہی ہوتا ہے اس لئے نفقہ راہن ہی کے ذمہ ہوتا ہے اور اسی نفقہ کے سبب سے باوجود مرہون ہونے کے راہن اس پر سواری کرسکتا ہے اور اس کا دودھ بھی استعمال کرسکتا ہے۔ اور یہ معنی لینا زیادہ بہتر واولی ہیں، جیساکہ اس کے بعد والی حدیث سے (جس کو سعید بن مسیب نے روایت کیا ہے نیز حضرت امام شافعیؒ نے سند صحیح ومتصل ومرفوع سے نقل کیا ہے) اس مفہوم کی تائید وتقویت ہوتی ہے اور یہ مفہوم لینا اس لئے اولی ہے کہ اس مفہوم کے لینے سے روایات کا تعارض مرتفع ہوجاتا ہے۔

اور اس لئے بھی اولی ہے کہ اس مفہوم کے لینے سے آیت کریمہ (آیت ربوا) سے بھی ٹکراؤ نہیں ہوتا ہے، اور پہلا مفہوم مراد لینے سے اگلی حدیث سے بھی تعارض ہوگا، اور آیت کریمہ سے بھی تعارض ہوگا، پس وہ مطلب صحیح نہیں۔ اور اگر تسلیم ہی کرلیا جائے تو اس حدیث کو یا تو ظاہر سے پھیرنا پڑے گا یا آیت ربوا سے منسوخ ماننا پڑے گا، اور اس لئے بھی دوسرا مفہوم اولی اور بہتر ہے کہ جمہور امت نے

جس میں ائمۂ ثلثہ (امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ) سب نے وہی دوسرا مفہوم لیا ہے بلکہ امام احمدؒ نے بھی فی روایۃ یہی مفہوم لیا ہے، اور اس اعتبار سے پہلے مفہوم کے قائل اسحٰقؒ ہوں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مرتہن مرہون جانور پر بوجہ رہن سواری کر سکتا ہے نہ اس کا دودھ استعمال کر سکتا ہے۔ اگر بوجہ رہن خود استعمال کرے گا تو ربوا ہو جائے گا، الّا یہ کہ راہن سے آزاد اجارہ کا معاملہ (جس میں رہن و قرض کا دباؤ بالکل نہ ہو) کرے یا مرتہن کے استعمال کرنے کا عرف نہ ہو۔ اور راہن خود تبرع کر دے اور اجازت دیدے۔ مولوی صاحب موصوف کا جواب اسی نظریہ پر ہے، اور صحیح ہے۔

۲:۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اموال ربویہ میں ادھار میں سود ہو جاتا ہے نہ کہ ہر مال میں۔ اور مال ربوی ہوتا ہے جنس و قدر کے اتحاد سے، ورنہ ربوی نہیں ہوتا، اور جو مال ربوی نہ ہو، اس میں ادھار اور تفاضل سب جائز رہتا ہے۔

۳:۔ اگر رہن شدہ کھیت کا لگان اتنا زیادہ دیتا ہو جتنا ایک تیسرا آدمی (جس نے روپیہ نہ دیا ہو) دیتا ہو، اور پھر راہن کو اختیار بھی دیدیا ہو کہ تم جب چاہو گے ہم کاشت کرنا روک دیں گے، اسی طرح مکان کا کرایہ بھی اتنا دیتا ہو جس میں رہن کے دباؤ کا شبہ نہ ہو، اور راہن کو تخلیہ کا اختیار بھی دے رکھا ہو تو کاغذی اندراج کے ماتحت اگرچہ یہ معاملہ رہن کا ہے مگر شرعاً رہن کا معاملہ ختم ہو کر اجارہ کا ہو جائے گا اور جائز رہے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند

۱۸ 9/91 ھج

فلاحی وخیراتی ادارہ کا حکم

سوال (۳۲) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں۔

حیدرآباد (آندھرا پردیس) میں ایک فلاحی وخیراتی ادارہ "طور بیت المال" کے نام سے قائم ہے جو باضابطہ رجسٹرڈ ہے اور ادارہ کی کارکردگی اطمینان بخش ہے۔

بیت المال ضرورت مند مسلمان کی (بشرطیکہ بلحاظ قواعد قابل امداد ہوں) امداد کرتا ہے جس کی صورتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

نادار طلبہ اور لڑکیوں کی شادیوں میں امداد، غیر مستطیع اموات کی تجہیز وتکفین، اتفاقی وقدرتی حادثوں کا شکار ہونے والے مجبور وحقدار افراد کی مدد، مساجد میں بغرض تعمیر وترمیم اعانت، مدارس دینیہ میں تعاون بغیر کسی رکنیت اور قدر کے عام مسلمانوں کو جاری کی جاتی ہیں، دفعۃً اشیاء کی کفالت پر قرضوں کا اجراء، صرف مستقل ارکان کی حد تک محدود رکھا گیا ہے، جس کا طریقہ کار حسب ذیل ہے۔

نمبر ۱ ماہانہ زر اعانت جو چھ ماہ تک دیتے رہتے ہیں، ان کو مستقل رکنیت بعد تکمیل اقرار نامہ ادا کے زر اعانت ماہانہ وپابندی دستور وقواعد دی جاتی ہے۔

نمبر ۲ مستقل رکن کو ہی قرض حاصل کرنے کا حق دیا جاتا ہے تو اس سے سابقہ چھ ماہ کی زر اعانت لے کر مستقل رکنیت دی جاتی ہے۔

نمبر ۳ اگر کوئی شخص جو رکن یا مستقل رکن نہ ہو اور مستقل رکنیت حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس سے سابقہ چھ ماہ کی زر اعانت لے کر مستقل رکنیت دی جاتی ہے۔

نمبر ۴ رقمی گنجائش اور سہولت کار کے لحاظ سے بیت المال ہر مستقل رکن کو ایک سو پچیس روپیہ کی حد تک قرض بکفالت اشیاء جاری کرتا ہے لیکن کوئی زیادہ اشیاء سے ماہانہ بیت المال کو مستحکم کر رہا ہو تو ایسے رکن کو مثلاً دو روپیہ ایثار کرنے والے رکن کو دو سو اور اسی طرح دس روپیہ یا اس سے زائد ایثار کرنے والے

ارکان کو ایک ہزار کی حد تک قرض دیا جاتا ہے۔

۵۔ ہر وہ شخص جو بیت المال کا رکن نہیں ہے لیکن وہ آج مستقل رکن بن کر قرض حاصل کرنا چاہتا ہے تو بیت المال سے سابقہ چھ ماہ کی اعانت حاصل کرکے مستقل رکنیت دے کر قرض جاری کرتا ہے۔

۶۔ اگر کوئی مستقل رکن دو روپیہ ماہانہ سے بیت المال کا تعاون کرتا ہے تو قواعد کے لحاظ سے اسے دو سو روپیہ کی حد تک قرضہ دیا جاسکتا ہے لیکن اگر ایسے رکن کو پانچ سو روپیہ کی ضرورت پڑتی ہے تو بیت المال سابقہ چھ ماہ کی فی ماہ تین روپیہ کے حساب سے رقم حاصل کرکے اسے پانچسو روپیہ قرض جاری کرتا ہے۔

۷۔ اگر قرض گیرندہ رکن نے ادائے اقساط یا ادائے کامل قرض کے وقت حسب معاہدہ ماہانہ زر اعانت ادا نہیں کیا ہے، تو اس سے بقایا زر اعانت وصول کرکے قرض کی اقساط وصول کی جاتی ہے۔

۸۔ مرہونہ اشیاء کی گوداموں کا لوٹ و فسادات کے پیش نظر بیمہ کرادیا گیا ہے۔ قرض گیرندہ اگر اپنی اشیاء کو حفاظت مزید کے لئے داخل بیمہ رکھنا چاہتا ہو، وہ اپنی خوشی سے بحساب فی روپیہ ایک پیسہ قرض لینے وقت بیمہ فیس بیت المال میں جمع کرتا ہے۔ یہ قاعدہ لازم نہیں۔

مذکور طریقہ کار از روئے شرع جائز و درست ہے یا نہیں۔ اور اگر کوئی چیز جائز نہ ہو تو اس کا متبادل حل تجویز فرماکر ممنون فرمائیں۔

قرض ۶۰ فیصد۔ مد محفوظ ۵ فیصد۔ اخراجات دفتر ۱۲ فیصد۔ امداد مستحقین ۵ فیصد۔ مساجد ۵ فیصد۔ مدارس ۲ فیصد۔ طلباء ۳ فیصد۔ اموات ۲ فیصد۔ معاشی فنڈ ۲ فیصد۔ ملت فنڈ ۳ فیصد۔

الجواب:۔ (۱ تا ۸) "طور بیت المال" کا دستور اساسی اور سوال

پیش نظر سب بغور پڑھا، جب ماہانہ زر اعانت کی ممبری کا سلسلہ اور اعانتی قرض دینے کا سلسلہ دونوں الگ الگ ہے۔ اور دونوں دو مستقل الگ الگ لائنیں ہیں، ایک دوسرے کے لئے شروط یا ایک دوسرے پر معلق نہیں ہے تو دونوں کے نفس اباحت میں کوئی کلام نہیں۔

اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص یا کوئی ادارہ ہر انسان کو یا کسی ایک ہی شخص کو اس کی منھ مانگی ہر مقدار قرض نہیں دے سکتا، اس لئے اگر قرض دینے کے معاملہ میں حد شرع میں رہتے ہوئے کوئی ضابطہ مقرر کرلیا جائے یا کوئی تقید و تحدید کرلی جائے تو اس کے مباح و درست ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔

پس یہ قید لگانا کہ مثلاً ہم قرض صرف اسی شخص کو دیں گے جو ہمارا کم از کم چھ ماہ سے مستقل اعانتی ممبر ہو گا یا مثلاً یہ قید لگانا کہ صرف ۱۲۵ روپیہ تک قرض تو ہر مستقل ممبر کو علی الاطلاق دے سکتے ہیں، مگر جو شخص اس سے زائد مقدار میں قرض لینا چاہے اس کو ہم زیادہ سے زیادہ صرف ایک ہزار تک دے سکتے ہیں، اس سے زیادہ کسی کو نہیں دے سکتے خواہ وہ دس روپیہ ماہانہ سے بھی زائد ماہانہ مقدار کا مستقل اعانتی ممبر کیوں نہ ہو، حتی کہ اگر سو روپیہ ماہانہ کا مستقل اعانتی ممبر ہو گا جب بھی نہ دے سکیں گے تو اب چاہے دس روپے سے نیچے کے اعانتی ممبروں کے لئے یہ تفصیل ہو کہ دو روپے والے کو صرف دو سو تک اور تین روپیہ والے کو صرف تین سو تک دیں گے و علیٰ ہذا تو اس میں بھی کوئی شرعی قباحت نہ ہو گی بلکہ محض انتظام کے طریقہ کے درجہ کی ایک چیز ہو گی، سود و ربوا سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو گا۔

(۵) (۶) جو شخص اعانتی ممبر نہیں ہے اور وہ قرض لینا چاہتا ہے اس کے لئے یہ شرط لگانا کہ ۶ ماہ کا زر اعانت پیشگی داخل کرو، تو قرض دیا جائے گا، یہ شرط اور یہ رقم (زر اعانت کی)، بیشک قرض کی وجہ سے بظاہر ہو گی اور کل قرض جر نفعاً

فهو رِبٰوا کے تحت داخل ہو کر یہ معاملہ ممنوع ہوگا اور یہ رقم حرام و ناجائز ہوگی۔

اگر کوئی ایسا آدمی ہو جو قابل رحم و قابل اعانت معلوم ہوتا ہو، اور بیت المال اس کو قرض دینا ہی چاہتا ہو، تو اس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ جتنے روپے اسکو دینے ہوں اتنے روپئے کوئی قدیم مستقل اعانتی ممبر اپنے نام سے لے کر اس کو اپنی طرف سے دیدے، پھر باقساط یا یکمشت جس طرح بھی وہ مناسب سمجھے اس سے وصول کرتا رہے، البتہ اس شخص کو آئندہ ممبر بننے کی ترغیب دینے میں یا تحریص کرنے میں کوئی قباحت نہ ہوگی بشرطیکہ اس پر کوئی دباؤ قرض کی وجہ سے نہ ہو، لہٰذا ان دونوں نمبروں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

(۷) یہ صورت درست ہے۔

(۸) اگرچہ شئ مرہون کی حفاظت بذمہ مرتہن ہوتی ہے لیکن یہ خاص صورت حفاظت (بذریعہ بیمہ) لازم نہیں بغیر بیمہ کے بھی یہ حفاظت کی ذمہ داری پوری ہوجاتی ہے بلکہ خود بیمہ کی اجازت ہی انتہائی مجبوری (مثلاً فتنہ و فساد ملکی کی وجہ سے نقصان سے حفاظت کی کوئی صورت نہ ہو) کی وجہ سے ہوگی۔ اور اس کا نفع خود بیت المال کو بھی ہوگا، اس لئے یہ اجرت راہن پہ لازم نہیں کی جاسکتی، ہاں راہن خود دینا چاہے تو مضائقہ نہیں، گنجائش رہے گی، پس جب منجانب بیت المال لازم نہیں ہے تو اس اجرت میں اباحت کی گنجائش ہے۔

دستور بیت المال کے سلسلہ میں ضروری ہدایات

۱- صدقات واجبہ (جیسے زکوٰۃ و فطرہ وغیرہ) واجب التملیک ہوتے ہیں یعنی مستحق زکوٰۃ شخص کو بعینہ ان رقوم کا مالک بنا دینا ضروری ہوتا ہے بغیر اس کے ادائیگی صحیح نہیں ہوتی اور نہ ذمہ ہی بری ہوتا ہے، لہٰذا ایسی رقوم کو تجہیز و تکفین یا تعمیر وغیرہ یا کسی بھی کام کے عوض میں دیدینا یا لڑکیوں کی شادی یا طلباء کی فیس وغیرہ میں

اس طرح دیدینا کہ ان کے ملک وقبضہ میں یہ رقوم بعینہ نہ پہنچیں جائز نہ ہوگا، اگرچہ یہ لوگ نادار ہی کیوں نہ ہوں جیسے ان کے شادیوں میں آنے والے مہمانوں کے کھانے وغیرہ میں خود خرچ کردینا یا ان طلباء کی فیس خود ادا کردینا۔

بلکہ اس طرح خرچ کرنا ضروری ہوگا کہ یہ رقوم بعینہ ان کی ملک وقبضہ میں یا ان کے اولیاء جو مستحق زکوٰۃ ہوں ان کی ملک وقبضہ میں پہنچ جائیں جیسے یہ رقوم خود نہ خرچ کریں بلکہ اسی کو دیدیں اور وہ خود اپنے اختیار سے خرچ کریں یا زیور یا کپڑا خرید کردیدیں یا ان طلباء کو کتابیں خرید کردیدیں یا حیلہ تملیک کے بعد مذکورہ تمام مصارف (تعمیر وتکفین وغیرہ وغیرہ) میں صرف کردینا درست رہے گا۔

۲۔ دستور ص ۳۳ کے نمبر (۱۸) کی ترمیم ضروری ہے راہن و مالک اشیاء کو بھی پہلے ادائگی قرض یا انفکاک رہن کے لئے ایک مناسب مدت متعین کردیں اور یہ اطلاع دینی ضروری ہوگی، اگر مدت کے اندر ادائگی نہ ہوگی تو ہم خود فروخت کردیں گے، پھر جب اس متعینہ مدت میں علم واطلاع کے باوجود انفکاک یا ادائگی قرض نہ کرے تو اب قرض میں کمیٹی کو فروخت کردینے کا حق ہوجائے گا بغیر اس کے اس کا حق نہ ہوگا، اگر کردیں گے تو عنداللہ ماخوذ ہوں گے اور عندالناس سبب بدنامی اور باعث تہمت بھی ہوسکے گا۔

۳۔ ص ۳۶ کے نمبر (۶) کی ترمیم مثل نمبر (۱۸) کے ضروری ہے۔

۴۔ ص ۳۹ کے نمبرات (۷، ۸، ۹، ۱۰) کی ترمیم بھی ضروری ہے۔

یہ اجرت رقم وصولی میں سے لینے کے بجائے بالمقطع متعین ومقرر ہونا ضروری ہے البتہ بغرض ہمت افزائی وتحریص عاملین یہ کرسکتے ہیں کہ کم سے کم مقدار وصولی کی ایک حد (مثلاً تین ہزار سالانہ یا چار ہزار سالانہ) متعین کرکے اس سے زائد مقدار وصولی پر عامل کو اس کے کام ومحنت کارکردگی کے تناسب سے اس کی بالمقطع

مقررہ اجرت کا دس فیصد یا بیس فی صد یا جو نسبت مناسب ہو بطریق انعام دینے کا قانون بنادیا جائے تو یہ درست رہے گا۔

۵- ص۳۹ کا نمبر (۱۱) درست ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح

سید احمد علی سعید

۳/۹/۹۱ھ

دارالعلوم دیوبند

۴/۹/۹۱ھ

بعض دعاؤں کے بارے میں حکم

سوال (۳۳)۔ (۱) دینی تعلیم کے رسالہ ۳ میں حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ نے یہ دعا لکھی ہے۔

اللّٰھم انت السلام ومنک السلام

حینا ربنا بالسلام وادخلنا دار السلام

تبارکت یاذا الجلال والاکرام

ان تین سطروں میں سے پہلی اور تیسری تو تعلیم الاسلام میں بھی ہے دوسری سطر اس میں نہیں ہے، اور اس خط کشیدہ دوسری سطر کے متعلق صاحب فتاوی رحیمیہ نے یہ لکھا ہے کہ یہ بے اصل ہے احادیث میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے واعظین کی ایجاد ہے۔ فتاوی رحیمیہ اردو ص۲۴۱/۱

اب سوال یہ ہے کہ کیا حقیقت میں بات ایسی ہی ہے جیسی کہ مفتی لاجپوری صاحب مدظلہ نے تحریر فرمائی ہے۔ اگر واقعۃً ایسا ہی ہے تو پھر دارالعلوم اینہ کے محدث اور مفتی ہوتے ہوئے انھوں نے ایسی غلط بات کیوں لکھ دی؟ دینی تعلیم کے یہ رسائل ملک و بیرون ملک سیکڑوں مدارس و مکاتیب میں پڑھائے

جاتے ہیں، جس کا اثر یقیناً اساتذہ اور طلبہ پر غلط پڑے گا اور معصوم بچوں کی تربیت بھی غلط ہوگی۔ جواب مفصل تحریر فرماتے ہوئے حقیقت سے آگاہ فرمائیں عین نوازش ہوگی۔

(۲) ابتدائی مکاتیب دینیہ میں معصوم بچوں کو یہ جو پانچ چھ کلمے اور ایمان مجمل و مفصل وغیرہ پڑھایا جاتا ہے اس کی کیا اصل ہے، کیا احادیث نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت ہے۔ مکاتیب میں بچوں کو یہ سب چیزیں پڑھانا چاہئے یا نہیں؟۔

کلمے کل کتنے ہیں پانچ یا چھ، ہر ایک کے صحیح صحیح الفاظ اور جملے مع ترتیب و حوالہ کے تحریر فرمائیں، اسی طرح ایمان مجمل و مفصل کی اصل بھی تحریر فرمائیں عین نوازش ہوگی۔

(۳)۔ نماز کے قاعدہ میں درود شریف کے بعد منجملہ دیگر دعاء ماثورہ کے اللھم انی ظلمت پڑھتے ہیں اس میں وانہ کا لفظ فتاویٰ عالمگیری میں ہے کیا یہ لفظ صحیح بخاری و مسلم میں بھی ہے یا نہیں؟ اگر نہ ہو تو فتاویٰ عالمگیری کی روایت یا عبارت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس لفظ کے ساتھ یہ دعاء بچوں کو یاد کرایا جائے تو خلاف احادیث تو نہیں ہوگا؟ احتیاط اور بہتر کیا ہے؟

۴۔ برحمتک یاارحم الراحمین یہ دعائیہ جملہ احادیث میں ہے یا نہیں؟ اور اس جملہ پر نماز کے بعد والی دعاء اور دیگر دعاؤں کا اختتام کیا کریں تو کوئی خلاف سنت تو نہیں ہوگا؟۔

الجواب:۔ (۱) حینا ربنا بالسلام الخ اس قول کو سرکار دوجہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا قول کہنا یا اس کی نسبت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کی جانب کرنا تو بغیر ثبوت کے صحیح نہیں اور جائز نہیں اور یہی حاصل

ہے اس قول کا جو مرقات صفحہ ۲۱۹ شرح مشکوۃ میں مذکور ہے جس کا حوالہ فتاوی رحیمیہ میں ہے لیکن اس کا مفہوم صحیح ہے اور بہت سے نصوص کے فحوی سے ثابت و مستنبط ہے کیونکہ حیّنا ربنا بالسلام الخ دعاء خیر ہے اور خیر طلب کرنے کا حکم احادیث صحیحہ سے بکثرت وارد ہے جیسے وسئلوا اللہ من خیرھا الخ (رواہ الشافعی وابو داؤد وغیرہ) کمافی المشکوۃ لہذا اس کو دعاء میں بعد نماز کے شامل کر لینا ناجائز و نادرست یا خلاف تعلیم نبوی علیہ السلام نہ ہوگا جبکہ بعد اذان کی دعا میں وآت محمدن الوسیلۃ والفضیلۃ والدرجۃ الرفیعۃ الخ میں والدرجۃ الرفیعۃ احادیث میں ماثور نہیں ہے۔ لیکن اس کا داخل دعاء کر لینا درست ہے اور عامۃً داخل ہے، صاحب مرقات کا یہ مقصود ہرگز نہیں ہے کہ اس جملہ کا مفہوم غلط ہے یا یہ بات غلط ہے، اور اس کے ذریعہ دعاء کرنا ناجائز و نادرست ہے۔ اور جب اس کا مفہوم اور معنے درست ہیں اور اس کے الفاظ کی نسبت سرکار دوجہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نہ کی جائے گی تو تربیت بھی غلط نہ ہوگی اور نہ اس کا غلط اثر بچوں پر پڑے گا، امید کہ اس معروض سے تشفی ہو جائے گی، ورنہ حضرت مصنف علام بفضلہ تعالیٰ ابھی صحیح سلامت زندہ موجود ہیں ان کی ہی جانب رجوع کر لیا جائے ممکن ہے موصوف سے تشفی بخش جواب مل جائے۔

(۲) ۔ کلمہ سے مراد اگر ایسے کلمات ہیں جن سے باری تعالیٰ عز اسمہ کی معرفت حاصل ہو اور ایمان صحیح و مکمل ہو تو وہ لاتعد و تحصیٰ ہیں، اس کا احاطہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اس پر خود آیات قرآنی ناطق ہیں، مثلاً قل لوکان البحر مداد الکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مددا الاٰیۃ (سورہ کہف) اور مثلاً وان ما

فی الارض من شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمات اللہ الآیۃ (سورہ لقمان)۔

البتہ ان میں سے چند کو جن کو مختصر اور زیادہ جامع دیکھا اور بچوں کے ونادا قفوں کے تصحیح عقائد وایمان کے لئے بنیادی طور پر مفید دیکھا اکٹھا کرکے تعلیم دینے میں اخذ کرلیا جیسے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور جیسے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمداً عبدہ ورسولہ۔ اور جیسے امنت باللہ کما ھو باسمائہ وصفاتہ وقبلت جمیع احکامہ وغیر ذلک اور پھر ان کے لئے ایک نام جو ماثور ملے یا اپنی فہم سے اس کے مناسب حال جو ہو تجویز کردیا تاکہ تعلیم وتعلم اور افادہ واستفادہ آسان ہوسکے اور اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ ماثورہ الفاظ متعدد ہیں، اس لئے آپ کے سامنے جو الفاظ ہوں ان کو لکھ کر دریافت فرمالیں کہ وہ صحیح ہیں یا غلط یہ طریقہ اسہل واحوط واہون ہوگا۔

۳ - ہاں انہ کا لفظ بھی بعض روایات میں وارد ہے اس کو بھی بچوں کو یاد کرادینا غلط یا خلاف احادیث نہ ہوگا۔

۴ - اس طرح (برحمتک یا ارحم الراحمین) یکجا تو نہیں ہے لیکن الگ الگ موجود ہے، مثلاً اللّٰھم اغفر برحمتک اور مثلاً انہ ارحم الراحمین اور یکجا کرنے میں ان کا مفہوم بگڑتا نہیں، اس لئے یکجا کرلینا بھی غلط ونادرست نہ ہوگا، نیز نماز والی دعاؤں کا یا دیگر دعاؤں کا اس پر ختم کرنا خلاف شریعت یا ناجائز نہ ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دارالعلوم دیوبند

۵/۵/۹۳ھ

ہندوستان میں بیت المال کا شرعی حکم

سوال (۱۴۳) کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین اس مسئلے میں کہ ہماری بھٹکل کے مسلمانوں کی جو کہ سب کے سب شافعی المذہب ہیں، ایک جماعت بیت المال قائم کرنا چاہتی ہے جس کا کام یہ ہوگا کہ مسلمانوں سے زکوۃ جمع کرے اور شہر کے مستحقین پر تقسیم کرے۔ اس سلسلہ میں مقامی علماء سے استصواب کیا گیا، علماء نے جواب دیا کہ قیام بیت المال کے لئے اہم شرط اسلامی قوت قاہرہ کا وجود ہے جو احکام شرع کا بزور قوت نفاذ و اجراء کر سکے۔ اور چونکہ فی زماننا یہ امر مفقود ہے اس کے علاوہ دوسرے مفاسد کے پیدا ہونے کا امکان ہے جن کے انسداد و استیصال کا کوئی ذریعہ نہیں، لہذا موجودہ صورت میں شرعاً قیام بیت المال کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے، علماء کرام کا استدلال یہ ہے کہ تبدیل احوال و ظروف سے احکام بھی تبدیل ہو جاتے ہیں، اب جناب کی خدمت میں حسب ذیل امور پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ بیت المال کی شرعی حیثیت کیا ہے، آیا یہ فرض، سنت، مستحب ہے۔

۲۔ کیا مشروط بشرط نصب امام و دیگر شرائط ہے۔

۳۔ وہ دیگر شرائط کیا ہیں۔

۴۔ درصورت اثبات کیا ہمارے زمانے میں یہ شرط پائی جاتی ہے یا پائی جا سکتی ہے۔

۵۔ بیت المال میں کس قسم کا مال جمع کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ کیا علماء کا مذکورہ بالا ادعاء صحیح ہے۔

۷۔ درصورت صحت ادعاء مسائل میں اس کی نظیریں کیا ہیں۔

۸۔ کیا کسی بستی کا کوئی ادارہ یا جماعت المسلمین امام یا مسلمان حاکم کی جگہ لے سکتا ہے۔

۹ - کیا موجودہ زمانے کے قضاۃ جو صرف انعقاد نکاح وطلاق وغیرہ کا کام کرتے ہیں، امام یا حاکم کی جگہ لے سکتے ہیں -

۱۰ - کیا کچھ لوگ جمع ہوکر بیت المال کا نام لئے بغیر لوگوں سے جمع زکوۃ وتقسیم زکوۃ کا کام اجتماعی طور کر سکتے ہیں یا نہیں -

۱۱ - درصورت امتناع بیت المال ایسے ممانعت کو کس قسم میں رکھا جائیگا

(نوٹ)- ہماری بستی شافعی المذہب پر مشتمل ہے، ازراہ کرم جواب میں مذہب شافعی کے نقطہ نظر کو بھی واضح فرمائیں ؟ بینوا د توجروا-

الجواب :- بیت المال اصطلاح شرع میں اس شرعی خزانے کا نام ہے جس کو امام المسلمین قائم کرتا ہے جس میں مال غنیمت خمس وعشر وخراج واموال ظاہریہ کی زکوۃ وغیرہ اکٹھا کی جاتی ہے، اس کے انعقاد واقامت کے لئے بیشک وہی شرائط ہیں جن کی طرف مقامی علمار کرام نے متوجہ فرمایا ہے، اہم شرط قوۃ قاہرہ کا موجود ہونا ہے - اور اس کے فقدان کی صورت میں ان مفاسد کا ظن غالب ہے جن کی طرف مقامی علمار کرام نے توجہ دلائی ہے، البتہ اگرچہ شرعی بیت المال مفقود ہے اور اس کے انعقاد واقامت کے شرائط بھی موجود نہیں ہیں لیکن چونکہ بعض مصارف بیت المال موجود ہیں، جیسے غربار ومساکین اور مبلغین ودعاۃ وعلم دین کے معلمین ومتعلمین وغیرہ وغیرہ، اس لئے ان مصارف کا وجود جہاں موجود ہو یا مدات بیت المال کے محل جہاں میسر ہوجائیں جیسے دار الیتامیٰ یا وہ مدارس علوم دینیہ جن میں مستحقین صدقات وزکوۃ کی کفالت کی جاتی ہو وغیرہ وغیرہ ان پر وہ اموال جو بیت المال میں جمع کئے جاتے ہیں خرچ کئے جائیں تو درست ہوگا، اور اس بنا پر اس قسم کے اداروں کو جن میں مستحقین زکوۃ وصدقات رہتے ہیں بیت المال کا مصرف قرار دے کر وہ رقوم وہاں دینا اور اس کی نوعیت مدات

کی توضیح کرتے ہوئے خرچ کرنے کی تشریح کرنا درست ہے اور اس بنار پر بعض علمار کے ذہن میں آگیا کہ یہ بیت المال بھی کہے جا سکتے ہیں اور جب یہ ادارے بیت المال کہے جا سکتے ہیں تو پھر بیت المال کے نام پر ادارہ بھی قائم کیا جا سکتا ہے، خواہ بروقت عطا اس ادارہ میں مصرف بیت المال یعنی ایسے اشخاص موجود نہ ہوں جو مصرف بیت المال کہے جا سکیں، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جب اس ادارہ میں مستحقین بیت المال موجود نہیں بیت المال کے اموال کے مصارف بھی موجود نہیں تو پھر اس کو بیت المال شرعی کا مصرف کیسے کہا جائے بخلاف دارالیتامیٰ و مدارس دینیہ کے جن میں طلباء غیر مستطیع کے کھانے کپڑے کی کفالت کی جاتی ہے اور جس میں یہ طلبہ تعلیم و تعلم کا مشغلہ رکھتے ہیں ان پر مصرف بیت المال کے محل کا اطلاق ہو سکتا ہے اور مصرف بیت المال کا محل قرار دے کر وہ اموال جو بیت المال میں جانا چاہئے۔ فقدان بیت المال کی صورت میں مصارف بیت المال کے محل میں صرف کر دینا عین منشار شارع کی تکمیل ہے اور ان مفاسد کا بھی ظن غالب نہیں ہے جن کی طرف علمار مذکورہ نے اشارہ فرمایا ہے، اس لئے اگر اس قسم کا کوئی نظم قائم کر لیا جائے جس کا جلد سے جلد اور محتاط طریقہ سے لوگوں کی زکوٰۃ ادا ہو جائے تو جائز کہا جائے گا۔ لیکن اصحاب دار اکین ادارہ کو یا اس کے ذمہ دار لوگوں کو کسی سے زبردستی و بجبر خواہ وہ اموال ظاہر یہ ہی کیوں نہ ہوں وصول کرنے کا حق نہ ہوگا اور اگر ارباب اموال اس میں اپنی زکوٰۃ نہ دیں تو گنہگار بھی نہیں ہوں گے بلکہ ان کو اپنے اموال کی زکوٰۃ خدا سے ڈر کر خود اس کے مصرف میں اور اس کے مستحقین تک پہنچانا ضروری رہے گا۔ البتہ اگر کسی ادارہ میں جس کے بارے میں ظن غالب ہو اور یہ بات متحقق دیکھیں کہ اس میں یہ رقوم زکوٰۃ وغیرہ اس کے مستحقین کی ملک میں نہایت صحیح طور پر پہنچ جاتے ہیں اور ادائیگی

حسب قاعدہ شرع ہو جاتی ہے دیدیں تو ان کی ادائیگی بھی صحیح ہو جائے گی۔

اسی طرح اصحاب و اراکین ادارہ نے اگر محتاط اور صحیح طریقہ سے شریعت مطہرہ کے بتائے اصول کے مطابق ان رقوم کو ان کے مستحقین کے ملک میں پہنچانے سے پہلے پہلے خرچ کر ڈالا تو ارباب اموال کی صدقات وزکوٰۃ واجبہ (نذر و کفارۂ روزہ) وغیرہ ادا نہ ہوگی، اور ایسا کرنے والے عنداللہ سخت مجرم و ماخوذ ہوں گے بلکہ دنیا کے وبال میں بھی ابتلاء کا شدید اندیشہ رہے گا، اور ارباب اموال کو اس کا علم صحیح اور یقین ہو جانے کے بعد ایسے ادارہ میں اپنی رقم دینا جائز بھی نہ ہوگا۔

ہماری ان گذارشات سے امتناع کا درجہ بھی معلوم ہو گیا کہ امتناع لعینہ نہیں ہے بلکہ محض امتناع لغیرہ ہے لفقدان شرائط، اور اس امتناع لغیرہ کا حاصل وہی ہے جو اوپر ابھی مذکور ہوا، اس میں ضرورت کے تمام اجزاء کا جواب آگیا، اور ہر نمبر کے تفصیلی جواب الگ الگ لکھنا مقصد سے زائد اور بلا ضرورت ہے۔

فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند ۱۲/۳/۹۳ھ

تقسیم شئی مشترک کا ایک خاص فیصلہ

سوال (۳۵) کیا فرماتے ہیں علماء دین مندرجہ ذیل مسئلہ میں۔ دو بھائیوں کے درمیان ایک مکان ارث میں آیا۔ مکان کی پوزیشن اس طرح واقع ہوئی ہے کہ مکان کے دو حصہ ہیں، ایک حصہ دوسرے حصہ سے عمدہ اور اچھا ہے اور اس کی قیمت بھی دوسرے زیادہ ہے، چنانچہ عمدہ حصہ لینے والے کو یہ کہا گیا کہ وہ دوسرے حصہ والے کو بارہ ہزار زائد دے گا۔ اور اچھے حصہ کے ایک کمرہ میں دونوں بھائیوں کا زمانہ سے آفس ہے، آفس بدستور رہے گا بلکہ کرایہ اس کو دیا جائے گا جس نے اس اچھے حصہ کو خریدا ہے وہ اس کو

کبھی اس کمرہ سے نکلنے کے لئے نہیں کہے گا۔ اس شرط پر دونوں بھائی راضی ہو گئے اور معاملہ طے ہو گیا۔ اس طرح مکان تقسیم ہو گیا۔ اب جس نے اچھا حصہ لیا تھا دوسرے بھائی کو آفس سے نکلنے کے لئے کہہ رہے ہیں، حالانکہ وہ کرایہ برابر دیتا ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اس طرح نکالنا جائز ہوگا یا نہیں، اور جو معاملہ طے کیا گیا تھا وہ صحیح تھا یا نہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب:۔ اس معاملہ کا تعلق دو جزء سے ہے ایک جزو کا تعلق تقسیم سے ہے خواہ تقسیم وراثت ہو یا تقسیم شئ مشترک ہو اور دوسرے جزو کا تعلق عقد اجارہ سے ہے اور عبارت استفتاء سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ مسلم عند الفریقین ہے اور نافذ بھی ہو چکا ہے۔ خواہ ثالثین کے فیصلہ کے ذریعہ سے ہو یا آپس کے مصالحتی معاہدہ کے ذریعہ سے ہو، اور یہ نزاع نفاذ فیصلہ کے بعد پیدا ہوا ہے۔

نیز فیصلہ کے اس جملہ (اچھے حصہ کے کمرہ میں دونوں بھائیوں کا زمانہ سے آفس ہے) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بوقت فیصلہ و تقسیم دونوں بھائیوں کا کاروبار مشترک تھا۔ پس اگر اس وقت دونوں بھائیوں کا کاروبار مشترک تھا اور اب بھی مشترک ہے تو اس صورت میں اس کمرے سے نکالنا درست نہیں ہے۔ ہاں اگر حالات و وقت کی تبدیلی کی وجہ سے سابق کرایہ (تیس روپیہ) موجودہ عام کرایوں کے اعتبار سے بہت کم رہ گیا، تو اس میں مناسب اضافہ ہو سکتا ہے اور اگر اب دونوں بھائیوں کا کاروبار جدا جدا ہو گیا ہو یا کمرہ ہی اس قدر خراب اور بوسیدہ ہو چکا ہو کہ قابل رہائش باقی نہ ہو تو نکال بھی سکتے ہیں، اور یہ الگ بات ہوگی۔

اور اگر بوقت فیصلہ و تقسیم دونوں بھائیوں کے کاروبار الگ الگ اور جدا تھے تو پھر اس کمرہ (آفس) میں دونوں کے مشترک رہنے اور کرایہ داری کا فیصلہ دینے کا کیا منشاء و سبب تھا جواب کے لئے اس کا واضح ہونا بھی ضروری

ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ نظام الدین

مفتی دارالعلوم دیوبند ۔ ۲۱ ۳ ۹۴ھ

الجواب صحیح

محمود غفرلہ

حج بدل کے بعض اہم مسائل

سوال (۳۶) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے میں کہ :۔

(۱) حج بدل کرنے والا تمتع کر سکتا ہے یا نہیں، اور اس مسئلہ میں باذن الآمر اور بغیر اذنہ دونوں کا حکم یکساں ہے یا اذن کے بعد کر سکتا ہے ۔

(۲) اگر اجازت کے بعد کر سکتا ہو تو جس صورت میں حج عن المیت کیا جا رہا ہو، ورثہ کی اجازت کیا اس حج کیلئے جانے والے کی جانب سے کافی ہو جائے گی یا نہیں ؟

(۳) اور یہ حج بوصیت میت ہو یا بہ تبرع وارث تو اس مسئلہ میں دونوں کا ایک ہی حکم ہوگا، یا مختلف ؟

.براہ کرم سب صورتوں کا واضح جواب مرحمت فرمایا جائے تاکہ سمجھنے میں خلجان نہ ہو ۔

الجواب :۔ (۱) محجوج عنہ (آمر) پر اگر حج فرض تھا اور بوجہ معذوری خود نہیں جا سکتا ہے بلکہ اپنی نیابت میں کسی کو حج بدل کے لئے بھیجنا چاہتا ہے تو اس صورت میں حج بدل کے صحیح ہونے کے لئے بیس سے زائد شرطیں ہیں، جو باب المناسک وغیرہ میں تفصیل سے مذکور ہیں ۔ منجملہ ان کے جو شرطیں مامور (حج بدل کے لئے جانے والے) سے متعلق ہیں وہ یہ ہیں ۔ کہ ۔

(الف) جب تک محجوج عنہ (آمر)، مامور کو حج قرآن یا تمتع کی اجازت نہ دیدے

مامور کو حج قران یا تمتع کرنا جائز نہ ہوگا، اگر کرے گا تو حج بھی آمر (جس نے اپنے حج بدل کے لئے بھیجا ہے) کا ادا نہ ہوگا، بلکہ مامور کا ادا ہوگا۔ اور اس صورت میں مامور (جو حج بدل کے لئے گیا ہے) پر ضمان لازم آئے گا۔

(ب) اور اگر آمر (محجوج عنہ) نے قران و تمتع کی اجازت دیدی ہے، خواہ مجملاً ہی دی ہے مثلاً بایں طور کہ تم کو اختیار ہے کہ میری طرف سے جس طرح چاہو حج بدل کراؤ۔ تو اس صورت میں مامور کو حج قران و تمتع دونوں کرنا جائز رہے گا، لیکن دم قران دم تمتع و دم جنایت یہ سب بذمہ مامور ہوگا۔ مامور کو اپنے ذاتی مال سے ادا کرنا ہوگا۔ کما فی المختار ودم القران والتمتع والجنایۃ علی الحاج ان اذن لہ الآمر والا فیصیر مخالفا فیضمن۔ معلوم ہوا کہ باذن الآمر اور بغیر اذنہ دونوں کا حکم یکساں نہیں ہے، بلکہ دونوں کے حکم میں فرق ہے۔

(۲ و ۳) (الف) اور اگر محجوج عنہ (آمر) پر حج فرض تھا اور اس نے حج بدل کی وصیت کر کے انتقال کیا ہے، اور تہائی ترکہ بعد ادائیگی قرض وغیرہ (حقوق متقدمہ) مکان آمر (محجوج عنہ) سے حج بدل کے لئے کافی ہے، تو اگر کسی متعین شخص کو بھیجنے کی وصیت کی ہے، تو جب تک وہ متعین کردہ معذور یا انکار نہ کرے یا ایسا مہمل نہ ہو کہ اس سے حج بدل ادا ہی نہ ہوگا، اس متعین کردہ شخص کو بھیجنا ورثہ پر ضروری رہے گا اگر کسی شخص کو آمر نے متعین نہ کیا ہو تو ورثہ جس کو مناسب سمجھیں بھیج سکتے ہیں بھیجنا ضروری رہے گا۔

(ب) اگر وصیت تو کی ہے مگر تہائی ترکہ بعد ادائیگی حقوق متقدمہ (قرض وغیرہ) محجوج عنہ (آمر) کے مکان سے حج بدل کے لئے کافی نہ ہوگا، مگر خارج میقات سے بھیجنے کے لئے کافی ہوگا، تو خارج میقات سے بھیجنا اگر ورثہ کی قدرت میں ہے، تو خارج میقات سے ہی جہاں سے کافی ہو بھیجنا واجب رہے گا۔ ہاں اگر ورثہ اپنے

ذاتی مال سے تبرع کرکے اور پہلے سے بلکہ مکان آمر سے ہی کسی کو بھیج دیں تو درست ہوگا، بلکہ بہتر و افضل ہوگا۔ وصیت کی ان تمام صورتوں میں مامور کو حج قرآن، تمتع کرنا درست نہ ہوگا، اور نہ ورثہ کی اجازت منجانب موصی کافی ہوگی، بلکہ حج افراد کرنا ہر حال میں ضروری رہے گا۔

(ج) وصیت تو کی ہے مگر اتنا ہی چھوڑا کہ اس کا تہائی حصہ خارج میقات سے حج کے لئے کافی ہو تو وہ رقم مکہ مکرمہ بھیج کر مکی حج کرا دینا ضروری ہوگا۔

(د) اور اگر وصیت تو کی ہے لیکن بالکل کوئی ترکہ نہیں چھوڑا کہ مکی ہی حج کرایا جا سکے یا ترکہ کافی چھوڑا مگر وصیت نہیں کی تو اگرچہ اس پر (آمر و محجوج عنہ) پر حج فرض باقی رہا ہو مگر اس صورت میں ورثہ پر کسی قسم کا حج (مکی یا میقاتی) کرانا ضروری نہیں رہے گا البتہ اگر ورثہ اپنی طرف سے تبرع کردیں تو بہتر و احسن ہوگا۔ اور اگر اللہ نے وسعت دی ہو تو کرا دینا چاہیے۔

(ﮦ) اگر محجوج عنہ (آمر) پر حج فرض نہیں تھا، لیکن حج کرانے کی وصیت کردی، اور حقوق متقدمہ کی ادائیگی کے بعد تہائی ترکہ کی مقدار اتنی ہے کہ آمر (محجوج عنہ اور موصی) کے مکان سے نہ سہی راستہ ہی کے کسی حصہ سے حج بدل میقاتی کرایا جا سکتا ہے اور وہاں سے حج کرانا ورثہ کی قدرت میں ہو، تو ورثہ پر وہیں سے حج کرانا ضروری رہے گا، اور اس حج بدل کرنے والے (مامور) کے لئے قران و تمتع کرنے کی اجازت نہ رہے گی، اور موصی کے ورثہ کی اجازت منجانب موصی کافی و صحیح نہ ہوگی۔

(و) اگر محجوج عنہ (آمر) پر حج فرض نہ رہا ہو، اور نہ اس نے حج کی وصیت کی ہو یا وصیت کی ہو مگر تہائی بعد ادائیگی حقوق متقدمہ علی الوصیۃ (جیسے قرض و مہر وغیرہ) اتنی مقدار کا بھی نہ چھوڑا ہو کہ جس سے حج مکی ہی سہی (وہ حج جو خارج میقات سے

اگر کیا جائے) کیا جا سکے تو اس صورت میں کسی وارث پر حج بدل کرانا ضروری نہیں رہے گا ، حج بدل کرادے تو کرا سکتا ہے بلکہ مستحسن ہے اور ایسے حج بدل میں قران وتمتع سب کرا سکتا ہے ۔

(س) اگر صورت نمبر (۵) میں تہائی ترکہ کی اتنی مقدار ہو کہ مکی حج (جو اندرون میقات والوں پر ہوتا ہے) کرایا جا سکتا ہے اور ورثہ کی قدرت میں ایسا حج کرانا ہے تو اس کا ہی ادا کرادینا ضروری رہے گا ، اور اس صورت میں حج بدل کرنے والا (مامور) قران ، تمتع ، افراد سب کر سکتا ہے ، البتہ دم قران و دم تمتع ، دم جنایت خود بذمہ مامور ہو گا ۔ مامور کو یہ دم اپنے ذاتی مال سے ادا کرنا ہو گا ۔ ھکذا یستفاد من جمیع مباحث الحج عن الغیر ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند

ایک علمی اشکال کا جواب | **سوال** (۷۳) بخدمت اقدس جناب مفتی صاحب دامت برکاتہم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

بعد سلام کہ معلوم ہو کہ آپ کی دعاؤں کے صدقے بندہ خیریت سے ہے ، آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں ۔

دیگر عرض خدمت اقدس میں یہ ہے کہ چار پانچ مسائل آپ کی خدمت میں لکھ کر بھیج رہا ہوں اگر آپ اس کا جواب ارسال فرما دیں تو یہ آپ کی نوازش ہو گی ۔ اور جاہل مطلق کا ذہن صاف ہو جائے گا ، کیونکہ میرا زیادہ تر بیٹھنا اٹھنا ہندوؤں میں ہے کچھ ہندو ایسے بھی ہیں جو نہایت متعصب قسم کے ہیں ، میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے آقا ﷺ کی ہر بات کو صحیح اور صاف ستھری ثابت کر دوں ، جب میں کوئی جواب نہیں دے پاتا تو دل رات دن بے چین رہتا ہے ، اسلام کو سچا ثابت کرنے کے

لئے۔ اور آپ تو بہتر جانتے ہیں کہ واحد اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے کہ دنیا کے ہر شخص کو مدلل اور معقول جواب دیتا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ کوئی خلش باقی نہ رہے ایک ہندو کو میں نے عقلی دلیل سے راون کے پوجنے پر سمجھایا کہ یہ بالکل غلط ہے۔ الحمدللہ اس نے قسم گیتا کی کھائی کہ آج سے ہم راون کو نہیں پوجیں گے، اور اس نے پوجا چھوڑ دی، جیسا کہ شق القمر کا ہمارے آقا کا معجزہ جس پر راجہ بھوج پور نے تحفہ تحائف بھیجے تھے راجہ بھوج پور کے نزدیک معجزہ ثابت ہوا، اسی صورت سے میرے رہبر آپ قرآن اور حدیثوں کے علاوہ دلیلوں سے تمام مسئلہ ثابت کیجئے گا، یہ اس ناکارہ کی درخواست ہے، تاکہ غیر مسلموں کو جواب دینا ہے۔ میرے غم گسار یہ نہ کہئے گا کہ تم کیوں ان چیزوں سے الجھ رہے ہو، ان میں ہمارے مذہبی وقار کا سوال ہے۔ اگر جواب طویل ہوں تو اگر آپ مناسب سمجھئے تو ایک ایک کر کے یا عامر عثمانی سے کہکر تجلی میں عنایت فرما دیجئے اگر آپ مناسب سمجھئے تو۔ اور یہ ضرور لکھ کر بھیجئے گا کہ کس مہینہ کی تجلی میں جواب آ رہے ہیں۔ باقی ہماری تو دلی خواہش یہی ہے کہ یہ زحمت آپ گوارہ فرمائیں۔

(۱) کیا ثبوت ہے کہ بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پیدا ہونے والا ہر بچہ مسلمان ہوتا ہے؟

(۲) اگر مسلمان شراب کی حالت میں مرجائے تو حدیث کے مطابق کافر مرا، اب اس کو ایصال ثواب پہنچا سکتے ہیں یا نہیں۔؟

(۳) کیا ثبوت ہے کہ مذہب اسلام ہی سچا مذہب ہے۔؟

(۴) لوگ مردے سے کیوں ڈرتے ہیں، اکیلے رات کو اس کے پاس نہیں بیٹھتے چاہے جتنی محبت کرتے ہوں۔؟

(۵) اگر کوئی عورت جنگل میں یا کسی بھی ویران جگہ میں مرجائے کوئی وارث نہ ہو

ہو، پتہ کیسے چلے گا کہ ہندو ہے یا مسلمان۔؟

(۶) جب آدم ہی کی سب اولاد ہیں تو پھر ہندو کیا مسلمان کیا سکھ کیا عیسائی اور پارسی کیا۔؟

(۷) اگر بچہ کو ننگا نہ دیکھیں تو کیسے پتہ چلے گا کہ بچہ لڑکا ہے یا لڑکی۔؟

چاہے دو تین دفعہ میں جواب دیجئے مگر میرے اللہ کے ولی ہم کو جواب ضرور دیجئے گا۔

الجواب:۔ محترمی! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب نے جس مقصد کے حصول کا تذکرہ گرامی نامہ میں کیا ہے اس کا اصل طریقہ تو یہ ہے کہ اہل دل ومشائخ کی صحبت میں اسی مقصد کی تحصیل کی غرض سے رہا جائے، اور اخذ مقصد ان کی ہدایت کے مطابق کیا جائے، ان کی صحبت و گفتگو کی برکت سے قلب وذہن اس طرح تیار ہو جاتا ہے کہ ہر مرحلہ میں خود رہبری کرتا ہے اور دوسروں پر بھی اپنا اثر ہی نہیں ڈالتا بلکہ ان کو بھی اپنا ہم رنگ بنا دیتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ الآیۃ میں بتلایا گیا ہے۔

وہ ملکہ جس کے حصول کی آنجناب کو فکر ہے یقیناً بہت نیک مقصد ہے اور فی زمانہ تو اس کی تحصیل بہت ہی ضروری ہے مگر اس کا طریقہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا، محض خط وکتابت ولٹریچر ومضامین وغیرہ دیکھ کر کچھ معلومات میں اضافہ یا بولنے کا ڈھنگ تو آجاتا ہے مگر وہ ملکہ راسخہ پیدا نہیں ہوتا جو مقصود ہے یا جو دوسروں پر اپنا رنگ چڑھا دے نہیں ہوتا۔ الا ما شاء اللہ۔

اس لئے اگر اس کا شوق ہے تو کسی اہل دل محقق شیخ سے ربط وتعلق قائم فرمایئے۔ البتہ آپ کی بصیرت کے لئے اور ازدیادِ شوق کے لئے ایک اور

ضابطہ عرض کئے دیتا ہوں، اگرچہ یہ ضابطہ اس اصلی ضابطہ وطریقہ کا جو اوپر مذکور ہوا ہے بدل تو نہیں ہو سکتا، لیکن کارآمد ضرور ہوگا اور بہت ہوگا، نیز اس اصل طریقہ کے تحصیل میں معین و مددگار ہوگا جس سے اس کے تحصیل کا شوق بھی بڑھے گا

روزمرہ نئے نئے حالات و معاملات، پھر نئے نئے مسائل و سوالات نئے نئے انداز سے پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کے لئے نئے نئے انداز سے تحقیقات وجوابات بھی درکار ہوتے ہیں، اور یہ سب چیزیں غیر متناہی سلسلہ رکھتی ہیں۔ ہر ایک کے لئے محض رٹے ہوئے جوابات کافی نہیں ہوتے۔ پس اگر وہ ملکۂ راسخہ جو مشائخ کی صحبت و برکت و توجہ سے حاصل ہوتا ہے موجود نہ ہو جب بھی اگر کم از کم علمی وعقلی درجہ کا ہی ضابطہ محفوظ رہے تو ان پیدا شدہ جزئیات و سوالات کا جواب معتد بہ درجہ میں دیا جا سکتا ہے اور وہ ضابطہ یہ ہے۔

توحید باری تعالیٰ عقلی ہے اور اس کا ثبوت عقلی و واقعاتی ہے۔ اگر کوئی بھی نبی مبعوث نہ ہوئے ہوتے اور نہ کوئی کتاب نازل ہوئی ہوتی جب بھی محض عقل کی رہبری سے اور واقعات کے تجزیہ اور تجربہ سے توحید کا قائل ہونا ضروری ہوتا۔ بلکہ ضروری تھا اور رہے۔ اور اسی بنا پر متقدمین حکمار یونان بھی محض عقلی دلائل کی رہبری سے اپنے انداز پر مدعی توحید ہوتے ہیں۔ پس اس کو تو عقل اور عقلی دلائل سے ثابت کیا جائے۔ اور اس مدعا کو ثابت کرنے کے لئے فن علم کلام سیکھا جائے۔ اور علم کلام و علم عقائد کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے اور اس کے معلومات فراہم کئے جائیں۔

توحید باری تعالیٰ کے اثبات کے بعد باری تعالیٰ عز اسمہٗ کی ذات وصفات کا تفصیلی علم اور اس کے حقوق و آداب کا علم نیز اس چیز کا علم کہ کیا کیا چیزیں باری تعالیٰ عز اسمہ کی مرضی کے مطابق اور پسندیدہ ہیں تاکہ اس کا امتثال کیا

جائے اور کیا کیا چیزیں ان کی مرضی کے خلاف و ناپسندیدہ ہیں تاکہ اس سے پرہیز واجتناب کیا جائے۔ اور اپنی دنیوی واخروی صلاح و فلاح کا سامان پیدا کیا جائے اور نجات حاصل کی جائے۔ ان سب علوم کا احاطہ محض عقل نہیں کرسکتی عقلاء کے متضاد نتائج بھی اس کی کھلی دلیل ہیں۔ ایک صاحب عقل ایک چیز کو مرضی قرار دے کر اس کے کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور دوسرا صاحب عقل اسی چیز کو نامرضی قرار دے کر اس سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے۔ اگر کوئی ذی عقل بطور محاکمہ کے کچھ فیصلہ بھی کردے جب بھی اس فیصلہ کا یقینی ہونا ضروری نہیں ہوگا غیر یقینی بلکہ مشکوک ہوگا، ہاں اگر باری تعالیٰ عز اسمہ خود ہی اپنی ذات وصفات سے متعلق اپنے حقوق وآداب سے متعلق اپنی مرضی و نامرضی سے متعلق کچھ معلومات عطا فرمادیں تو بے شک وہ معلومات یقینی اور غیر مشکوک ہوں گے۔

چنانچہ باری تعالیٰ عز اسمہ نے اپنے فضل وکرم سے اور اپنی شفقت ورحمت کے طفیل جو مخلوق پر متوجہ ہے، تخلیق کائنات انسانی کے روز اول سے ہی انبیاء ورسل مبعوث فرمانے کا سلسلہ شروع فرمادیا۔ اور ان میں سے بہتوں کو ان کی قوم کی ضرورت کے مطابق مستقل کتابیں بھی دیں، نیز بقدر ضرورت بطور اتمام حجت بہتوں کو معجزے بھی ساتھ کر دیئے تاکہ اگر کوئی معاند عناد برتے تو اس کو مقہور ومغلوب بھی کیا جاسکے۔

چنانچہ نبی آخر الزماں نبی امی خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم (روحی فداہ وقلبی)، کو سب سے اخیر میں قیامت تک کے لئے اپنا رسول بنا کر بھیجا جو تمام ادیان کے لئے ناسخ ہو، مبعوث فرمایا، اور آپ پر اپنا کلام ازلی وسرمدی قرآن پاک نازل فرمایا اور اس کو قیامت کے لئے زندہ رہنے والا معجزہ بنایا، اور اس کے حفاظت کی ضمانت خود اپنے ذمہ لی۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے کہ بلاشبہ

ہم ہی نے یہ ذکر (قرآن پاک) نازل کیا ہے۔ ہم ہی اس کے محافظ ہیں کہ اس کو مٹنے اور ہر تغیر سے محفوظ رکھیں گے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون

نیز مزید اظہار اعجاز کے لئے اور تحدی و مقابلہ کرنے والوں کی عاجزی ظاہر کرنے کے لئے اور مؤمنین کی تقویت وطمانیت کے لئے یہ بھی ارشاد فرمایا گیا۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صادقین ۰ وان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکافرین ۰ پ

(اے انسانو) اگر تم اس کتاب (قرآن مجید) کے نازل کرنے میں جس کو میں نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا ہے شک میں ہو تو اس کتاب کی کسی (چھوٹی سے چھوٹی) سورت کے مثل ہی (بناکر) لاؤ، اور اس (معاملہ) میں اپنے تمام معبودین کو شریک کرلو، اللہ کے سوا، اگر تم (اپنے اس شک و دعویٰ میں) سچے ہو (تو ضرور ایسا کرو)، اور (سن لو) اگر تم اس کے مثل نہ لاسکے اور (یقین کرلو کہ) ہرگز کبھی مثل نہیں لا سکتے۔ لہٰذا اس آگ سے ڈرو جس کے ایندھن پتھر اور انسان ہوں گے۔ ان منکرین کے لئے وہ آگ (جہنم) تیار کرلی گئی ہے۔ ۱۲

غرض جب ان چیزوں (توحید، رسالت وکتب سماوی کا نزول) مدلل کردیا جائے گا اور مخاطب کو اس پر مطمئن کردیا جائیگا تو پھر اگلی منزل (افہام وتفہیم مسائل ومعاملات) آسان تر ہو جائے گی، اور محض کتاب وسنت کے دلائل سے ہی دل میں اترتی اور پیوست ہوتی چلی جائے گی۔

ان چیزوں (توحید ورسالت وکتب سماوی کا نزول) کا عقلی انداز کا محققانہ ثبوت

جس کے انکار کا کسی معاند کو بھی مجال نہ ہو، قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ کے مضامین ورسائل وتصانیف میں ملے گا مثلاً حجۃ الاسلام تقریر دلپذیر۔ میلہ خداشناسی وغیرہ ان کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ کسی محقق ذی مناسبت واستعداد عالم سے سبقاً سبقاً سمجھ کر محفوظ کرنا چاہیئے۔

اور قوت فکریہ وذہنیہ کی تصحیح وتکمیل وتزکیہ وصفائی کے لئے اہل دل شیخ محقق کی صحبت کی تلاش کرنا چاہیئے۔ اور جب تک یہ صحبت میسر نہ ہو اس وقت تک حضرت قاسم العلوم والخیرات نور اللہ مرقدہ کی تصانیف ومضامین کے مطالعہ کے ساتھ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کے مواعظ وملفوظات وتصانیف کا بالخصوص اشرف الجواب ہر سہ حصہ اور المصالح العقلیہ فی الاحکام الشرعیہ کے مستقل مطالعہ کا معمول رکھنا چاہیئے۔ پھر انشاء اللہ تعالیٰ ان مذکورشدہ سوالات ہی کا نہیں بلکہ ہر پیش آنیوالے سوالات کا شافی جواب خود دے سکیں گے۔

کثرت مشاغل کی وجہ سے جناب کے تمام سوالات کا تفصیلی جواب کا موقع نہیں ملا، نیز وہ اتنا مفید بھی نہ ہوگا جتنا ان اصول کو اپنانا اور اس پر کاربند ہونا مفید ہوگا۔

آپ کی تسکین خاطر کے لئے اجمالی طور پر مختصر جواب کتاب وسنت کی روشنی میں بھی عرض کردیا جاتا ہے۔

(۱) حدیث شریف میں وارد ہے۔

کل مولود یولد	ہر بچہ فطرۃ اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں
علی فطرۃ الاسلام فابواہ	باپ (مربی) اس کو یہودی بنادیں یا نصرانی بنادیں یا
یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ	مجوسی بنادیں (غرض جیسے خود ہوتے ہیں ویسا بنا
او کما قال ؐ	دیتے ہیں)۔

اور تجربہ بھی شاہد ہے کہ بچہ بالکل خالی الذہن اور صحیح الفطرۃ ہوتا ہے۔ جیسی

تعلیم و تربیت و صحبت ہوتی ہے ویسا ہی بن جاتا ہے۔ یہیں سے علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی بچہ شعور پیدا ہونے سے پہلے بالکل تنہا و اکیلا چھوڑ دیا جائے تو جب وہ بڑھے گا اور عقل حاصل ہوگی تو موحد ضرور ہوگا، شرک و کفر سے محفوظ رہے گا۔ اور یہی حقیقت تو اسلام کی بھی ہے۔

(۲)۔ کافر نہیں مرتا، مؤمن مرتا ہے مؤمن ہی رہتا ہے۔ اس معصیت کی وجہ سے گنہگار و فاسق البتہ ہو جاتا ہے اور ہر فاسق کا کافر ہونا ضروری نہیں بلکہ عاصی و فاسق الگ چیز ہے اور کافر الگ چیز ہے، جس نے اس کے خلاف کہا ہے اس نے غلط کہا ہے۔

(۳) قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے۔

ان الدین
عند اللہ الاسلام

اور ایک جگہ ارشاد ہے۔

ومن یتبع
غیر الاسلام دینا
فلن یقبل منہ وھو
فی الاخرۃ من الخاسرین ٥

اس سے معلوم ہوا کہ دین اسلام ہی برحق اور سچا دین ہے۔

(۴)۔ وہم کے غلبہ اور ایمان کے ضعف کی وجہ سے ڈرتے ہیں، قوی الایمان اور صحیح العقل نہیں ڈرتے۔

(۵)۔ جس طرح مرد کو اسلامی لباس و پوشاک شکل و صورت اختیار کرنے کا اور رکھنے کا اور شعائر اسلامی اپنانے کا حکم ہے اور ضروری ہے اسی طرح عورتوں

کو بھی حکم ہے اور اس کو اپنانا ضروری ہے - پس جس طرح ان چیزوں کے ذریعہ سے مرد پہچانا جائے گا اسی طرح وہ بھی پہچانی جائے گی - پھر اگر وہ نمازی ہوگی تو نور نماز بھی اس کو متمیز کردے گا اور اگر اس نے یہ سب چیزیں اختیار نہیں کیں اور ذی مسلم (یعنی مسلم کی وضع قطع) اختیار نہیں کیا نماز روزہ کو نہیں اپنایا اور پھر نہ پہچانی گئی تو وہ خود اسکی ذمہ دار ہوگی، دوسروں پر اس کا وبال نہ ہوگا - حدیث شریف میں فرمادیا گیا ہے ومن تزیا بقوم فھو منھم - اوکما قال ؐ -

بر تقدیر تسلیم اگر دنیا میں اس کے ساتھ کچھ خلاف ایمان اور غلط معاملات ہوجائیں تو ہوجائیں مگر نفس ایمان کی برکت سے آخرت میں حقیقت واضح ہوکر اپنے اعمال نیک و بد کے اعتبار سے بدیر یا جلد مؤمنین کے زمرہ میں آجائے گی -

(۶) - اسی توحید اور اس کے تفصیلی حقوق و آداب واحکام کے اختیار کرنے اور ترک کرنے سے یہ فرق پیدا ہوگیا، کوئی مومن کوئی کافر، کوئی ناجی کوئی ناری، کوئی جنتی کوئی دوزخی ہوگیا -

(۷) - بچوں کے غیر ذی شعوری کے زمانہ تک ان کا ننگا بھی دیکھنا درست ہے اور بلکہ پیدا ہوتے ہی جب کہ وہ قدرتاً ننگا ہوتا ہے، لڑکا یا لڑکی ہونا معلوم ہوجاتا ہے - پھر اسی کے مطابق اس کے لباس و پوشاک بھی عادۃً ہوجاتے ہیں، پھر یہ کونسی پوچھنے کی بات یا استعجاب کی چیز ہے - بلکہ خود یہ سوال ہی قابل استعجاب ہے البتہ شریعت مطہرہ نے ان ایہامات کے رفع کرنے کے لئے بھی یہ حکم دیا ہے کہ لڑکوں کو بچپن ہی سے مردانہ لباس اور لڑکیوں کو زنانہ لباس پہنایا جائے - اس کے خلاف کرنا حکم شریعت کے خلاف ہے - فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

مفتی دارالعلوم دیوبند

طلاق کی ایک خاص صورت

سوال (۳۸) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ کسی منکوحہ کا شوہر جو عرصہ آٹھ سال سے اپنی بیوی بچی کے نان و نفقہ سے بے نیاز ہو، اور اسے اپنے یہاں آباد نہ کرتا ہو۔

اس کی بیوی بچی کے ساتھ اپنے والدین کے یہاں رہتی ہو، نانا، نانی اپنی لڑکی اور نواسی کے نان و نفقہ میں کفیل ہوں تو ایسے شوہر کے لئے شرعی حکم کیا ہے، نیز منکوحہ کے شوہر سے آٹھ سال کے نان و نفقہ کا تقاضہ برابر جاری ہے مگر شوہر کو مطلق احساس نہ ہو، مزید برآں شوہر اپنی سسرال میں آکر اپنی منکوحہ بیوی سے بآواز بلند مخاطب ہو کر یوں کہے کہ میں نے ختم کیا، ختم کیا، ختم کیا، تین بار مسلسل یہی الفاظ کہے جب کہ شوہر کا نظریہ بھی یہ ہو کہ اب اس کو آباد نہ کرے گا۔

تو کیا شوہر کی زبان سے بیوی کے سنے ہوئے الفاظ طلاق کے مترادف ہو گئے، شوہر سے پردہ لازم ہو گیا، اور یہ الفاظ سننے والوں میں سسرال میں سے گھر کا دوسرا آدمی بھی ہو، براہ کرم اس کے متعلق آپ فرمائیں کہ شرعی احکام کیا ہیں۔

الجواب:۔ شوہر کا یہ جملہ کہ (میں نے ختم کیا، ختم کیا، ختم کیا) اس بات کا قرینہ ہے کہ اس کے قبل خواہ عورت سے یا سسرال والوں سے کوئی سلسلہ کلام ضرور تھا۔ لہذا جب تک وہ بھی سامنے نہ ہو محض اس لفظ "میں نے ختم کیا" پر اور محض شوہر کے نظریہ کی بنیاد پر کوئی حکم نہیں لکھا جا سکتا۔ البتہ آٹھ سال سے حقوق زوجیت ادا نہ کرنا، نان و نفقہ نہ دینا، لاپرواہی برتنا یا ایسی حالت میں عورت کا بغیر شوہر رہنا اور باعصمت رہنا اس کے لئے زندگی گذارنا دشوار ہو، تو عورت کو اختیار ہے کہ اگر مسلمان حاکم موجود ہو تو اس کی عدالت میں درخواست دے کر شوہر کی لاپرواہی اور حقوق زوجیت کی اور نان و نفقہ کی عدم ادائیگی یا اپنا بغیر شوہر باعصمت زندگی کا گذارنا دشوار ہونا بتلا کر فسخ نکاح کی درخواست کرے، پھر وہ حاکم شوہر کو مطلع کرے اور اس کو طلب کرے اور دعوی

عورت کا صحیح ثابت ہوجائے اور شرعی اصول وضوابط کے مطابق پوری تفتیش وتحقیق واقعہ کرکے فسخ نکاح کا فیصلہ دیدے۔ تو عدت گذار کر دوسرا نکاح کرلینا عورت کو جائز رہے گا، اور اگر ایسا مسلمان حاکم موجود نہ ہو تو یہ کام شرعی کمیٹی رجماعت مسلمین جو شرعاً قاضی کے قائم مقام ہوتی ہے، اس سے رجوع کرے اور سارے حالات اس کے سامنے رکھے، شرعی کمیٹی شوہر کو طلب کرکے اس سے یہ کہے یا تو تم قاعدہ سے اسے آباد کرو یا طلاق دے کر آزاد کرو، اگر تم نے ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں کی تو کمیٹی تمہاری طرف سے طلاق قرار دے گی، اور ان دونوں باتوں پر عمل کے لئے ایک مناسب مدت مقرر کردے مثلاً دو ماہ یا ایک ماہ پھر شرعی کمیٹی کی تنبیہ کا علم شوہر کو ہوجانے کے باوجو شوہر کچھ نہ کرے اور مدت مذکورہ گذر جائے اور عورت اس مقررہ مدت کے گذرنے کے بعد شرعی کمیٹی سے پھر تفریق واقع کرنے اور طلاق قرار دینے کی درخواست کرے اور شرعی کمیٹی تفریق واقع کردے اور طلاق قرار دیدے تو شرعاً طلاق واقع ہوجائیگی اور عدت گذار کر دوسرا نکاح کرلینا عورت کا جائز ہوجائیگا مگر ایسی صورت میں وقتی قانون حکومت کی زد سے بچنے کے لئے عورت کو عدالت مجاز سے حق خود مختاری حاصل بھی کرلینا چاہئے۔ عدالت مجاز سے اور شرعی کمیٹی سے تفریق شرعی اور فسخ نکاح حاصل کرنے کے اصول وضوابط مفصل طور پر رسالہ حیلہ ناجزہ میں مذکور ہیں، اس کو سامنے رکھ کر عمل کیا جاوے۔ بالوقت عمل دارالافتاء سے معلوم کرلیا جاوے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند

مغربی ممالک سے ڈبوں میں جو پکے ہوئے گوشت آتے ہیں ان کا حکم

سوال (۳۹) - ہمارے یہاں ایک مسئلہ زیر بحث ہے۔ فریقین کے دلائل درج ذیل ہیں، براہ کرم رہنمائی فرمائیں۔

(۱)۔ بعض مقامی مسلمان پکے ہوئے گوشت کے ڈبے اپنی پرچون کی دکان پر فروخت کرتے ہیں، اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ ڈبے میں خنزیر کا گوشت ہے تو قطعًا حرام ہے، اس پر ایک دکاندار نے یہ حیلہ اختراع کیا کہ وہ اس مال کو کسب کے لئے نہیں بلکہ میل ملانے کے لئے رکھے گا اور قیمت خرید پر ہی بیچدے گا۔ یہ حیلہ جائز ہے یا ناجائز۔؟

۲۔ اگر ڈبے میں بھیڑ یا گائے کا گوشت ہے، تو بھی وہ مسلمان کا ذبیحہ نہیں ہے عرب حضرات اس کو طعام اہل کتاب سمجھ کر کھاتے ہیں۔ بعض حضرات اس کی خرید وفروخت تک کے لئے حرام قرار دیتے ہیں، لیکن کچھ اور اہل علم اس کی حرمت کو لغیرہ قرار دے کر خرید وفروخت کی حد تک اجازت دیتے ہیں۔

۳۔ یہاں خون کا نمک بھی فروخت ہوتا ہے جو شوربے میں کام آتا ہے۔ اگر خنزیر کا خون شامل ہونے کا شبہ نہ ہو تو کیا خون کی حرمت اس کی اس قسم کی مصنوعات کو بھی حرام کردیں گے۔؟

۴۔ بعض کھانے کی چیزیں ان جانوروں کی ہڈی سے تیار کی جاتی ہیں، اگر یہ یقین ہو کہ اس میں خنزیر کی ہڈی نہیں شامل ہے تو کس دلیل کی بناء پر حرام ہوگی؟

۵۔ ہمارے شہر میں ذبیحہ کے دو طریقے رائج ہیں۔

(۱) جانور کو بجلی کے جھٹکے سے بیہوش کرتے ہی رگیں کاٹ کر خون بہا دیا جاتا ہے۔

(۲) دماغ میں کارتوس کی گولی مارتے ہیں، رگیں کاٹ دی جاتی ہیں، ممکن ہے پورا خون بہہ جاتا ہو، لیکن یقین نہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب:۔ ۱۔ جب یہ معلوم ہوجائے کہ یہ گوشت خنزیر کا ہے یا کسی مردار کا ہے خواہ وہ مردار ماکول اللحم تھا یا غیر ماکول اللحم تو اس کی بیع وشراء

میل ملانے کے لئے بھی حرام وناجائز ہے۔

۲۔ ڈبے میں آیا ہوا گوشت اگر مسلمان کا ذبیحہ اور شرعی ذبیحہ کا گوشت نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ یقین ہے کہ وہ ایسے اہل کتاب کا ذبیحہ ہے جو ذبح کے وقت صرف اللہ کا نام لے کر ذبح کرتے ہیں اور نہ ہی یہ یقین ہے کہ اس کے گردن کی رگ سے کم از کم تین رگیں کٹ کر سارا خون نکلا ہوا ہے۔ بلکہ اکثری حال یہ ہے کہ موجودہ دور کے اہل کتاب عموماً ان مذہبی قیود سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اس لئے ایسے گوشت کے کھانے کے بارے میں احتیاط ہی لازم رہے گی۔

البتہ اس کے بیع وشراء کی گنجائش اس وقت تک رہے گی جب تک کہ اس کے خنزیر کا یا مردار کا گوشت ہونے کا یقین نہ ہو جائے۔ ہاں اگر بطریق ظن غالب یہ علم حاصل ہو جائے کہ یہ گوشت (ڈبے والے) ایسے اہل کتاب کے ذبیحہ کا ہے جو بوقت ذبح صرف اللہ کا نام لے کر ذبح کرتے ہیں۔ جیسا کہ یہودیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے، نیز یہ بھی بظن غالب معلوم ہو جائے کہ اس کے گردن کی اکثر رگیں اس ذبح سے کٹ کر اس کا سارا خون نکل چکا ہے۔ تو ایسے ممالک میں جہاں شرعی ذبیحہ میسر نہ آتا ہو، اور بغیر گوشت کھائے دشواری ہوتی ہو تو اس گوشت کے کھا لینے کی گنجائش رہے گی۔

۳۔ خون کو نمک کس طرح سے بناتے ہیں اور اس کے نمک بنانے کی کیا شکل ہوتی ہے؟ آیا اس سے قلب ماہیت بھی ہو جاتی ہے یا نہیں؟ یہ چیز تنقیح طلب ہے۔ جب تک یہ بات منقح نہ ہو جائے کوئی منقح حکم نہیں لگایا جا سکتا، البتہ مطلق خون خواہ ماکول اللحم اور ذبیحہ کا ہو یا مردار وغیرہ کا ہو سب ناپاک ونجس اور حرام ہوتا ہے، اور کسی کا بھی کھانا جائز نہیں رہتا۔ لہٰذا قبل از قلب ماہیت اس کا کھانا حرام وناجائز ہی رہے گا۔

۴ـ خنزیر کی ہڈی تو نجس العین وحرام ہی ہے، خنزیر کے علاوہ اور مردار کی خشک ہڈیاں بھی اگرچہ پاک ہوں۔ مگر حلال نہیں ہوتیں اور ان کا کھانا جائز نہیں رہتا کھانا حرام ہی رہتا ہے۔ مردار بجمیع اجزائہ مردار (میتۃ) ہوتا ہے اور میتۃ کی حرمت قرآن پاک میں منصوص ہے حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل بہ لغیر اللہ الآیہ پ۲ فقط ماکول اللحم جانور جو شرعی قاعدہ کے مطابق ذبح کیا گیا ہو، صرف اس کی ہڈی پاک ہونے کے ساتھ ساتھ حلال بھی ہوتی ہے اور اس کا کھانا بھی حلال ہو سکتا ہے، اس لئے اگر صرف اس سے کھانے کی چیزیں بنائی جائیں گی تو فقط ان کا کھانا جائز رہے گا، لیکن جب تک دلائل شرعیہ سے معلوم نہ ہو جائے کہ یہ چیزیں انہی ہڈیوں سے تیار کی گئی جنکا گوشت حلال ہے بالخصوص ایسے ممالک میں جہاں حلال وحرام کا عموماً امتیاز ملحوظ نہ رکھا جا سکتا ہو، کھانے میں احتیاط ہی لازم رہے گی۔

۵ـ (۱و۲) اگر بجلی کے جھٹکے لگنے سے یا کارتوس کی گولی لگنے سے روح فنا نہیں ہوتی اور نہ دم گھٹ کر خون محتبس ومنجمد ہو جاتا ہو بلکہ گردن کی رگوں کے کٹنے سے روح پرواز کرتی ہو، اور خون سارا کا سارا نکل جاتا ہو، اور گردن کی اکثر رگیں کٹ جاتی ہوں۔ اور اس طرح گردن کی رگیں کاٹنے والے مسلمان یا ایسے اہل کتاب ہوں جو رگ کاٹنے کے وقت (بوقت ذبح) صرف اللہ کا ہی نام لیتے ہوں تو اگرچہ یہ طریقہ مکروہ اور خلاف سنت اور خلاف طریق انبیاء ہوگا مگر وہ جانور اگر ماکول اللحم ہے تو اس کا گوشت پاک وحلال رہے گا اور اس کا کھانا درست رہے گا فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۹/۲۳ھ

الجواب صحیح محمود غفرلہ

حکم دربارۂ الاؤنس مدرسین

سوال (۴۰) کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل میں۔ ایک مدرسہ سے کچھ ناخوشگوار حالات کی بنا پر چند مدرسین نے یکجائی درمیانی سال میں استعفا دیا، مدت استعفا سے قبل مدرسہ کی مجلس شوریٰ بیٹھی جس میں استعفا کی واپسی پر پورا زور دیا گیا مگر مدرسین واپسی پر راضی نہ ہوئے، بالآخر یہ معاہدہ ہوا کہ تیس رمضان تک استعفا موخر کیا جائے۔ درمیانی سال کے سبب اس معاہدہ میں مدرسہ کی مصلحت تھی۔ چنانچہ شوریٰ کی کارروائی میں یہ معاہدہ تحریر ہوا، اور اسی کو بنیاد قرار دے کر جملہ مدرسین کے الاؤنس جو تیس روپے ماہانہ جو مدرسہ دیتا تھا بجائے تیس روپے کے پندرہ روپے کم کر کے شامل تنخواہ۔ ۳۰/ رمضان تک کیا گیا۔ اور گورنمنٹ سے ملنے والے الاؤنس پر وعدہ کیا گیا کہ وصول ہونے کے بعد ادا کیا جائے گا، اس معاہدہ کے بعد مستعفی مدرسین بھی اخیر سال تک برابر کام کرتے رہے، ۱۹/ شعبان ۹۰ھ کو مدرسہ میں تعطیل ہوگئی، مدرسین کو شعبان کی تنخواہ نہیں دی گئی وہ اپنے اپنے مکان واپس ہو گئے۔ وسط رمضان میں صرف ۱۸/ یوم کی تنخواہ شعبان بذریعہ منی آرڈر روانہ کی گئی جس کو مدرسین نے واپس کر دیا۔ مدرسین کا یہ کہنا ہے کہ چونکہ مدرس کی حیثیت اجیر شہریہ کی ہے بغیر معاہدہ کے بھی پورے شعبان کی تنخواہ کے ہم شرعاً مستحق تھے۔ اب چونکہ معاہدہ میں مدت اجارہ ۳۰/ رمضان تک بڑھا دی گئی ہے اس لئے اس معاہدہ کی رو سے پورے شعبان و رمضان دونوں مہینے کی تنخواہ کے ہم شرعاً مستحق ہو چکے ہیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ مدرسین اس مطالبہ میں حق بجانب ہیں یا نہیں۔ اگر حق بجانب ہیں تو شرعاً مہتمم کو ان دونوں ماہ کی تنخواہ روکنے کا حق نہیں ہونا چاہئے۔ ایسا کرنے پر مہتمم عند اللہ ماخوذ ہوں گے یا نہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب:- صورت مسئولہ میں معاہدہ مذکورہ کی وجہ سے مدرسین کا

مطالبہ صحیح ہے اور مطالبہ پورا نہ کرنے پر مہتمم کے سر مواخذہ ہوگا۔ قال اللہ تعالیٰ اوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا (سورہ اسراء) مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ہے ان الوعد للحق بالدين كما روى عنه صلى الله عليه وسلم العدة دين على ما رواه الطبرانى فى الاوسط عن على وابن مسعود (ص ۶۴۶ ج ۴)۔ الاشباہ والنظائر میں ہے الخلف فى الوعد حرام (ص ۴۵۲)۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

محمد یٰسین غفی لہ المبارکفوری خادم التدریس والافتاء فی الجامعۃ العربیہ احیاء العلوم المبارکفوری۔ ۱۱ ذی الحجہ سنہ ۱۳۹۰ھ

الجواب: - یہ صحیح ہے کہ رمضان کی تعطیل کلاں استراحت کے لئے ہوتی ہے کہ بعد استراحت پھر مستعدی سے کام ہو سکے جیسا کہ عام مدارس میں متعارف ہیں۔ اور اس بناء پر آئندہ سال نہ آنے والے مدرسین و ملازمین کو رمضان کی تنخواہ کا استحقاق نہیں ہوتا۔ مگر صورت مسئولہ کا معاملہ اس عرف سے الگ اور ایک جدید معاہدہ کے تحت ہے، اس معاہدہ میں جب حسب تحریر سوال ۳۰ رمضان تک کی تصریح ہے تو یہ مستعفی مدرسین ۳۰ رمضان تک کے اجیر قرار پا گئے۔ اور تعطیل کلاں عرف عام ماتحت مدرسہ نے خود کی ہے۔ اس لئے اس تعطیل کا تعلق اس معاہدۂ خصوصی سے نہ ہوگا۔

ہاں اگر ۳۰ رمضان سے قبل ۱۹ شعبان کو مدرسہ بند کرتے وقت ان مستعفی مدرسین کے ساتھ پھر کوئی معاہدۂ جدیدہ کرنے کے بعد ان کو وطن واپس کیا گیا ہوتا تو بیشک سابق معاہدہ ختم ہو کر اس جدید معاہدہ کے ماتحت حکم ہوتا۔ لیکن جب ایسا نہیں کیا گیا تو حسب معاہدہ ۳۰ رمضان تک کے اجورہ کے مستحق شرعاً یہ مستعفی مدرسین ہوں گے۔ لہٰذا ان مدرسین کا یہ مطالبہ صحیح ہے۔ اور وہ اجورہ بذمہ مدرسہ واجب الاداء

ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

الجواب صحیح

سید احمد علی سعید ۔ ۲۸/۱۲/۹۰ھ

مسبوق کے تکبیر تحریمہ کہتے ہی بیٹھنے سے قبل قبل امام نے سلام پھیر دیا

سوال (۱۴۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں۔ اگر کوئی شخص مسجد میں آکر وضو کر کے امام کے ساتھ شریک ہونا چاہتا تھا کہ امام قعدہ اخیرہ میں تھا۔ جب وہ شخص آیا اور نیت ابھی باندھ ہی چکا تھا کہ امام نے سلام پھیر دیا تو آیا اب وہ نیت توڑ کر دوبارہ تکبیر تحریمہ کہکر نماز پڑھے گا یا اسی پہلی تکبیر تحریمہ ہی پر صلوٰۃ کی بنار کریگا اور یہ شخص قعدہ میں امام کے ساتھ شریک نہ ہو سکا تھا۔ مدلل تحریر فرما دیں۔

الجواب:۔ حرم صلوٰۃ میں داخلہ تکبیر تحریمہ سے ہوتا ہے لقولہ علیہ السلام تحریمها التکبیر و تحلیلها التسلیم او کما قال۔ وکما قال فی شرح التنویر ص۱۴۳ج۱۔ قال فی الحلیۃ عند قول المنیۃ ولا دخول فی الصلوٰۃ الا بتکبیر الافتتاح۔

جب اس نے تحریمہ نماز اللہ اکبر کہکر باندھ لیا ہو تو حرم صلوٰۃ میں داخل ہو گیا اور اس کا تحریمہ منعقد و صحیح ہو گیا، اور اس کو بحکم لا تبطلوا اعمالکم باطل نہ کرے اور نہ توڑے اور اسی پر اپنی نماز پوری کرلے۔

گفتگو جو کچھ ہے، صحت اقتدار میں ہے، صحت اقتدار کیلئے منجملہ اور شرائط کے مشارکۃ فی الرکن بھی ہے فی الدر المختار فی باب الامامۃ۔ شرائط اقتدار گناتے ہوئے کہتے ہیں ومشارکۃ فی الارکان اور مسلم ہے کہ تحریمہ یا تکبیر

تحریمہ رکن صلوٰۃ نہیں ہے بلکہ صرف شرط ہے محض اتصال بالارکان کی وجہ سے تمام شرائط وارکان ملحوظ ہوتی ہیں۔ پس محض تحریمہ باندھنے سے ابھی مشارکۃ رکن متحقق نہیں ہوئی تھی کہ امام نے سلام پھیر دیا، تو صحت اقتداء کی شرائط کہاں پائی گئیں کہ صحت اقتداء کا بھی حکم ہو جائے، اور رکن سے مراد رکن اصلی ہے۔ چنانچہ اسی متن کے تحت علامہ شامی فرماتے ہیں۔

قولہ ومشارکۃ فی الارکان الخ ای فی اصل فعلھا (الیٰ قولہ) لوجود المتابعۃ التی ھی حقیقۃ الاقتداء (شامی ص۳۳۷ ج۱ باب الامامۃ) پھر دوسری جگہ مطلب مہم فی تحقیق المتابعۃ الامام کے تحت فرماتے ہیں قال فی شرح المنیۃ لاخلاف فی لزوم المتابعۃ فی الارکان الفعلیۃ اذھی موضوع الاقتداء الخ۔

پھر طویل ونفیس بحث کے بعد فرماتے ہیں۔ والحاصل ان المتابعۃ فی ذاتھا ثلثۃ انواع۔

ع۱۔ مقارنۃ لفعل الامام مثل ان یقارن احرامہ لاحرامہ ورکوعہ لرکوعہ وسلامہ لسلامہ۔

ع۲۔ ومعاقبۃ لابتداء فعل امامہ مع المشارکۃ فی باقیتہ

ع۳۔ ومتراخیۃ عنہ فمطلق متابعۃ الشامل کھذہ الانواع الثلاثۃ یکون فرضا فی الفرض وواجب فی الواجب وسنۃ فی السنۃ عند عدم المعارض اوعدم لزوم المخالفۃ۔

اور جہاں جہاں مشارکۃ فی الارکان کی مثال دیتے ہیں۔ قیام کو چھوڑ کر رکوع کی مثال دیتے ہیں اس لئے کہ رکوع رکن اصلی ولازم ہے اور قیام ویسا نہیں ہے چنانچہ نوافل بعذر میں قیام ساقط ہو جاتا ہے، اور بغیر عذر بھی بیٹھ کر پڑھ لینے کی اجازت ہے

بخلاف اور ارکان (رکوع وسجود وقعود) کے اس لئے محض قیام کی مشارکت شرائط انعقاد اقتداء میں کافی نہیں سمجھا گیا ہے اور اس وجہ سے جمہور علماء کے نزدیک جو محض سلام اول سے خروج مانتے ہیں۔ اگر کوئی شخص سلام اول کے بعد علیکم سے قبل بھی امام کو پائے تو اقتداء صحیح نہیں ہوتی اور صلوٰۃ امام کو پانے والا نہیں مانتے۔

بعض علماء کے نزدیک جو دونوں سلام سے خروج عن الصلوٰۃ مانتے ہیں۔ اگر کوئی سلام اول کے بعد سلام ثانی سے قبل قبل امام کو پا جائے، یعنی قعدہ میں بیٹھ جائے کما اشار الیہ لفظ ادرکہ فی عبارتہ سے نماز امام کو پانے والا مان لیتے ہیں کما فی الطحطاوی ص ۱۳۷، ۱۳۸۔

قولہ مرتین الخ ھو الاصح وقیل الثانیۃ سنۃ کما فی الفتح ثم الخروج عن الصلوٰۃ بسلام واحد عند العامۃ۔ وقیل بھما کما فی مجمع الانھر۔ فلو اقتدی بہ بعد لفظ السلام الاول قبل علیکم لا یصح عند العامۃ۔ وقیل ان ادرکہ بعد التسلیمۃ الاولی قبل الثانیۃ فقد ادرک مع الصلوٰۃ الخ

اور یہیں یعنی (قبل الثانیۃ کی قید سے) یہ بھی معلوم ہوا کہ جب سلام ثانی بھی پھیر دے اور کوئی امام کو پائے تو کسی کے نزدیک اقتداء صحیح نہیں ہوگی۔ اور یہاں یہی صورت ہے جیسا کہ سوال کے خط کشیدہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے لہٰذا صورت مسئولہ کسی کے نزدیک اقتداء صحیح نہیں ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر کوئی شخص امام کے سلام اول کے میم کہنے سے قبل قبل امام کو پا گیا خواہ قعدہ میں نفس قعود ہی کر لیا تو بھی امام کو پا گیا، اور اقتداء بالاتفاق سب علماء کے نزدیک صحیح ہو گئی۔

اور ثمرۂ اختلاف یہ نکلے گا کہ اختلافی صورتوں میں اگر کوئی شخص بناء کرے اور

اقتداء کے طور پر نماز پڑھ لے تو وجوب اعادہ کا حکم نہ ہوگا مگر عبادات مفروضہ کا یہ معاملہ ہے، اس لئے احتیاط اولیٰ ہے تاکہ ادائیگی فرض بالقطع والیقین ہو ــــ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

الجواب صحیح

سید احمد علی سعید - ۲۹/۱۲/۹۱ھ

حج اور حاجیوں کے کچھ خصوصی احکام

سوال (۴۱) ماقولکم رحکم اللہ تعالیٰ فی المسائل المرقومہ۔ بینوا توجروا۔

۱۔ اہل مکہ اور جو ان کے حکم میں داخل ہیں ان کے لئے جواز تمتع کی کوئی شرعی صورت بھی ہے یا نہیں؟۔

۲۔ جو حجاج کرام اپنی اپنی میقات پر احرام عمرہ باندھ کر مکہ معظمہ داخل ہوتے ہیں پھر حلالی ہو کر زیارت کے لئے مدینہ منورہ جاتے ہیں، وہاں سے واپسی کے وقت احرام کس طرح باندھنا چاہیئے، صرف حج کا یا قران کا یا صرف عمرہ کا۔

۳۔ جو حجاج کرام ایک مرتبہ عمرہ کر کے فارغ ہوتے ہیں، قبل الحج ان کے لئے اور نفلی عمرہ کرنا کیسا ہے؟

۴۔ جو حجاج کرام پاکستان یا ہندوستان سے بذریعہ جہاز آتے ہیں۔ ان کو احرام کہاں سے باندھنا چاہیئے۔ اور احرام کی آخری حد کی کہاں تک گنجائش ہے؟۔

۵۔ جو حضرات زیارت کی غرض سے مدینہ منورہ آتے ہیں ان کو نیت کس طرح کرنی چاہیئے مسجد کی یا روضہ کی یا مسجد و روضہ مطہرہ دونوں کی، اور مدینہ منورہ کے زمانہ قیام میں بار بار بلکہ روزانہ مکرر سہ کرر روضہ مقدسہ کی زیارت کرنا حضرات

صحابہؓ سے ثابت ہے یا نہیں -؟
۶ - کن کن لوگوں کے لئے بدون احرام کے مکہ معظمہ میں داخل ہونا جائز ہے
الجواب ۱ :- اگرچہ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اشہر حج آنے سے قبل میقات سے باہر کسی مقام پر عارضی قیام کرلے پھر سوق ہدی کے ساتھ حج تمتع کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، لیکن یہ قول مرجوح ہے۔
متفق علیہ صورت یہ ہے کہ اشہر حج داخل ہونے سے پیشتر مکہ مکرمہ کی باشندگی ترک کرکے میقات سے باہر کسی جگہ کو مثلاً مدینہ طیبہ کو وطن اصلی بنالے اور مع بال و بچے کے وہاں مقیم ہوجائے اور وہاں سے سوق ہدی کے ساتھ حج کے لئے آئے تو حج تمتع بھی کرسکتا ہے، اور بعد فراغت از حج اگر مکہ مکرمہ کو پھر وطن اصلی بنالے گا تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔

(۲) جب بعد عمرہ کے حلال ہوگئے تو اب احرام قران کا تحقق نہیں ہوسکتا پس اگر اشہر حج کے اندر یہ صورت پیش آئے تو صرف حج کا احرام باندھنا چاہیئے۔

(۳) مکی و آفاقی کو اشہر حج سے قبل ایک عمرہ سے زائد نفلی عمرہ جتنا ہوسکے کرلینا بہتر ہے، اسی طرح بعد حج بھی جتنا عمرہ ہوسکے کرلینا بہتر ہے اور اشہر حج کے اندر آفاقی کو صرف ایک عمرہ کرنا چاہیئے، خواہ قران کا ہو یا تمتع کا ہو، اور مکی صرف حج افراد کرے گا عمرہ نہ کرے گا۔

(۴) قدیم مشہور قول کی بناء پر یلملم ہے۔ اور جدید تحقیق میں جدہ بھی بعض حضرات نے شمار فرمایا ہے، احتیاط قول قدیم میں ہے۔

(۵) روضۂ اطہر کی زیارت کے ساتھ مسجد نبوی کی زیارت کی نیت بھی کرنی چاہیئے، اس لئے کہ دونوں کی زیارت کی ترغیب وارد ہے اور جس کو وسعت ہو اس کے لئے قبر مبارک کی زیارت کو قریب بہ واجب کہا گیا ہے فی الشامی

ص۲۵۷ ج۲ والمختار انها قریبة من الوجوب لمن له سعة -

وفی القنیة ص۸۱ قال مشائخنا انها افضل العبادات وفی مناسک الفارسی - وشرح المختارات انها قریبة من الواجب لمن له سعة (فتح) (الی قوله) اخرج ابوداؤد بسند صحیح مامن احد یسلم علی الا رد الله علی روحی حتی ارد علیه السلام - فینالہ من فوز عظیم حیث یرد صلی الله علیه وسلم السلام علیه مشافهة - و فی ذٰلک فلیتنافس المتنافسون -

وفی الشامی ص۲۵۳ ج۲ - قوله مندوبة الخ ای باجماع المسلمین کما فی اللباب وما نسبت الی الحافظ ابن تیمیة الحنبلی من انه یقول بالنهی عنها وقد قال بعض العلماء انه لا اصل له - وانما یقول بالنهی عن شد الرحال الی غیر المساجد الثلاث - واما نفس الزیارة فلا خلاف فیها کزیارة سائر القبور -

فی الدر المختار - ومکة افضل منها (ای المدینة) علی الراجح الا ما ضم اعضاؤه علیه الصلوٰة والسلام فانه افضل مطلقا حتی من الکعبة والعرش والکرسی وتحت رد المحتار ص۲۵۷ ج۲ قوله الا ما ضم الخ قال فی اللباب والخلاف فیما عدا موضع قبر المقدس مما ضم اعضاؤه الشریفة فهو افضل بقاع الارض بالاجماع اھ - قال شارحه وکذا ای الخلاف فی غیر البیت فان الکعبة افضل من المدینة ماعدا الضریح الاقدس وکذا الضریح افضل من المسجد الحرام وقد نقل القاضی عیاض وغیره الاجماع علی تفضیله حتی علی الکعبة وان الخلاف فیما عداه -

نقل عن ابن عقیل الحنبلی ان تلک البقیعة افضل من العرش وقد وافقه السادة البکریون علی ذلک وقد صرح التاج الفاکھی بتفضیل الارض علی السموات لحلوله صلی اللہ علیہ وسلم بھا (الی قوله) وقال النووی الجمھور علی تفضیل السماء علی الارض فینبغی (ای یجب) ان یستثنیٰ منھما مواضع ضم اعضاء الانبیاء للجمع بین اقوال العلماء۔

یہ کلام ان فقہاء امت کا ہے، جنہوں نے ارشادات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام خود اپنے کانوں سے نہیں سنا ہے، جنہوں نے حسن وجمال باکمال مصطفوی کا مشاہدہ خود اپنی آنکھوں سے نہیں کیا ہے، جو کچھ سنا یا سمجھا ہے بوسائط سنایا سمجھا ہے، پھر ان کے ذوق اور ان کے ترغیب وتحریض کا تقاضہ یہ ہے کہ ایک دن میں مکرر سہ کرر کیا بلکہ جتنی بار بھی زیارت اس بقعۂ مبارک کی کیجائے تو کم ہے۔ تو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جو عشق واتباع نبی میں ضرب المثل ہیں، جن کے بارے میں اجتماعی عقیدہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ تمام کے تمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق ومتبع عاشق صادق تھے، فرمان رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر جان دینے والے اور فدائی تھے، انھوں نے حسن وجمال نبوت کا مشاہدہ خود اپنی آنکھوں سے کیا تھا اور فدائی ہوئے تھے۔ جب انھوں نے اپنی عشق کی سوزش وپیاس بجھانے کی تدبیر آپ کے اس حیات ظاہری سے پردہ کر لینے کے بعد کے لئے خود رسالتماب علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم سے اس پر ترغیب دیتے ہوئے سُن لیا ہوگا۔ جس میں قبر مبارک کی زیارت کی ترغیبات وتحریضات بھی ہیں۔

مثلاً ——— من وجد سعة ولم یزرنی فقد جفانی او کما قال ؐ۔

اور مثلاً ——— من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی

اوکما قال ؐ۔

اور مثلاً ــــــ من حج فزار قبری بعد وفاتی کان کمن زارنی فی حیاتی - اوکما قال ؐ۔

اور مثلاً ــــــ من زارنی متعمداً کان فی جواری یوم القیٰمۃ اوکما قال ؐ۔

خاص کر پہلی حدیث میں من وجد سعۃ ولم یزرنی احسن لینے کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ موقعہ و وسعت رہتے ہوئے صحابہؓ روضۂ اطہر کی زیارت نہ کریں اور فقد جفانی کے مصداق بنیں۔

حافظ حدیث منذری کی تصریح کے مطابق کہ حدیث لا تجعلوا قبری عیداً اوکما قال ؐ۔ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جس طرح عید پورے سال میں صرف ایک مرتبہ یا دو مرتبہ محض متعینہ تاریخوں میں آتی ہے ایسا معاملہ میری قبر کے ساتھ نہ کرے، بلکہ بکثرت زیارت کرتے رہنا (جذب القلوب ص۲۱۰) اس مفہوم کے اعتبار سے یہ حدیث بھی کس قدر بلیغ عنوان و انداز سے کثرت زیارت کی ترغیب دے رہی ہے تو پھر ان فدائیان رسالت کے ذوق زیارت و اشتیاق کا اندازہ کوئی کیا لگا سکتا ہے۔

اسکے علاوہ حیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام کو عامۃ المومنین کے قبروں کی زیارت کی اجازت و ترغیب اس عنوان سے دینا کہ میں نے تم کو زیارت قبور سے روک دیا تھا، لیکن اب اجازت دیتا ہوں، زیارت قبور کیا کرو، یہ دنیا سے بے رغبت بناتی ہے اور آخرت کو یاد دلاتی ہے کما رواہ ابن ماجہ عن ابن مسعودؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا فانھا تزھد فی الدنیا و

تدنکس الی آخر ۃ او کما قال ؒ اور خود سرکار دو عالم کا اپنا معمول جس کو فقیہہ امت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا لفظ کلما کے ساتھ جو دوام واستمرار کے ساتھ تجدد فعل کو بتلاتا ہے اور اس زوردار الفاظ میں بیان فرمارہی ہیں کہ جب جب میرے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باری آتی تو آپ ہمیشہ اخیر شب میں بقیع المفرقد (قبرستان صحابہ، تشریف لے جاتے اور وہاں پہنچ کر اہل قبرستان کے لئے تسکینی کلمات فرماتے اور ان کے لئے دعائے مغفرت فرماتے کما رواہ مسلم ص۱۳۱ ج۱ فی صحیحہ عن عائشہ رض قالت کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کلما کان لیلتھا الخ ھا کی ضمیر حضرت عائشہ رض کی جانب راجع کیا ہے، جیسا کہ بعض شراح نے راجع کیا ہے اور یہ گفتگو اسی تقدیر پر ہے اور ھا ضمیر کو لیلۃ اسراء قرار دیا جائے جب بھی حضرت عائشہ صدیقہ رض کی اگلی روایت مل کر ایک شب میں بالیقین دوبارہ زیارت قبور ثابت ہوجاتی ہے۔ اور یہ بھی ثبوت مدعا کے لئے کافی ہے۔

من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخرج من آخر اللیل الی البقیع فیقول السلام علیکم دار قوم مؤمنین واتاکم ما توعدون غداً موجلون وانا انشاء اللہ بکم لاحقون۔ اللھم اغفر لاھل بقیع الغرقد۔ ۱۲

اخیر رات کے سناٹے اور اندھیری میں سردی، گرمی و ہر موسم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مشقت برداشت فرمانا اور ایک دن دو دن نہیں بلکہ ہمیشہ کا اور دائمی روزمرہ کا معمول بنا لینا۔ مرے ہوئے صحابہ رض کے ساتھ کس قدر تعلق اور حسن سلوک کا ترجمان ہے، اور کس قدر احسان عظیم کا پتہ دیتا ہے۔ پھر صحابہ کرام رض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان احسانات کے حسن مکافات میں کیا کچھ کیا ہوگا۔

اس کا اندازہ کوئی کیا لگا سکتا ہے، اسی کے ساتھ نصف شعبان کی شب (لیلۃ البراۃ) والی روایت ملا لیجائے جس میں نمازِ عشاء کے تھوڑی ہی دیر بعد بستر مبارک پر کمر لگاتے ہی اٹھ جانا اور بقیع الغرقد تشریف لے جانا اور وہاں کے مدفونین کے لئے دعائے مغفرت وغیرہ کرنا منقول ہے، اس روایت کو بھی فقیہۂ امت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ہی روایت فرمائی ہے، اور اپنی ہی باری والی شب کا واقعہ نقل فرماتی ہیں۔ اس میں پہلے والی روایت کے مطابق اخیر شب میں جانے کے بجائے محض اس وقت کا جانا نقل نہیں فرماتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس شب کا ایک نیا اور مستقل عمل نقل فرماتی ہیں۔ اور عجیب ترغیبی انداز سے نقل فرماتی ہیں، جو الفاظ حدیث دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے، جس کا ظاہر متبادر یہی ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ الگ الگ اور مستقل معمول ہے۔

اس لئے کہ شب کے ثلث اخیر میں رحمت خصوصی کا نزول تو سال کی تمام راتوں میں خواہ لیلۃ البراۃ ہو یا لیلۃ القدر یا اور کوئی مبارک رات ہو ہمیشہ دائم اور مستمر رہتا ہے، اس لئے وہ معمول بھی تمام راتوں میں دائم اور مستمر رہے گا، اور شب کے اول ہی حصہ سے اپنی خاص انداز کا خصوصی نزول رحمت لیلۃ البراۃ میں ہوتا ہے، اور بعض خصوصی) راتوں میں ہوتا ہے اسی کے اعتبار سے ان راتوں میں ایک خاص اور زائد معمول منقول ملتا ہے، جیسا کہ لیلۃ القدر کے بعض خصوصی عمل سے بھی نمایاں ہوتا ہے۔ پس اسی طرح اس رات (لیلۃ البراۃ) کا یہ خصوصی عمل اول شب کا ہوگا۔ جو اس والی عمل سے الگ ہوگا۔

اور شئون باری عز اسمہٗ بے پایاں وغیر متناہی ہیں اور وہ اپنی اپنی خصوصی نوع کے ساتھ ایک شب میں موجود متحقق ہو سکتی ہے۔ اور اسی بنا پر لیلۃ القدر ایک الگ معمول ہے، اور لیلۃ البراۃ میں ایک الگ معمول ہے۔ جو اس دائمی اور سارے

سال دائر رہنے والے معمول کے علاوہ اور نیا مستقل معمول ہے، اور بیہقی کے الفاظ یہ ہیں۔

عن عائشہ صدیقہؓ قالت دخل علیّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فوضع عنہ ثوبیہ ثم لم یستتم ان قام فلبسھما فاخذتنی غیرۃ شدیدۃ ظننت انہ یاتی بعض صویحباتی فخرجت اتبعہ فادرکتہ بالبقیع الغرقد یستغفر للمؤمنین والمؤمنات والشہداء الی آخر الحدیث الطویل (ما ثبت بالسنہ مختصراً)۔

اور مسلم شریف باب زیارۃ القبور کے حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

قالت عائشہ صدیقہؓ الا احدثکم عنی وعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قلنا بلیٰ قال قالت لما کانت لیلتی التی کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم عندی انقلب فوضع رداءہ وخلع نعلیہ فوضعھما عند رجلیہ وبسط طرف ازارہ علی فراشہ فاضطجع فلم یلبث الا ریث ما ظن ان قد رقدت فاخذ رداءہ رویدا وانتعل رویدا وفتح الباب رویدا فخرج (الی قولہ) حتی جاء البقیع فقام فاطال القیام الخ نسائی شریف کے الفاظ قریب یہی ہیں، اور یہ سب حدیثیں بہت طویل اور مفصل ہیں، ان سب میں آپ نے اپنے اس طرح اچانک تشریف لے جانے کی وجہ بھی بیان فرمائی ہے اور حضرت جبرئیل کے تشریف لانے کے خصوصی احوال بھی بیان فرماتے ہیں، یہاں مختصراً محض بقدر ضرورت نقل کیا گیا ہے۔ اس تقدیر پر جناب سید کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللّٰہ علیہ وسلم سے خود ایک یوم میں زیارت قبور کا مکرر ہونا ثابت ہو جاتا ہے اور اگر اس کے ساتھ اور ان روایات کو بھی ملایا جائے جن میں حضرت

سید کائنات بہ نفس نفیس خود جنازہ کے ہمراہ بغرض دفن وغیرہ قبرستان میں تشریف لے گئے ہیں، اور اسی طرح ان روایات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جن میں حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے نقل کردہ معمول کے علاوہ دیگر اوقات میں اہل قبور کے پاس خود رسالتماب کا تشریف لے جانا مروی ہے، مثلاً حضرت ام قیس رضی اللہ عنہا کی روایت جس کو جمع الفوائد صہ ۲۰۲ ج ۱ میں نقل کیا گیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

عن ام قیس قالت لو رأیتنی ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخذ بیدی فی سکۃ من سکک المدینۃ ما فیہا بلنت حتی انتہی الی البقیع الغرقد فقال یا ام قیس فقلت لبیک وسعدیک یارسول اللہ۔ قال لترین ھٰذہ المقبرۃ یبعث اللہ منہا سبعین الفاً یوم القیمۃ علی صورۃ القمر لیلۃ البدر یدخلون الجنۃ بغیر حساب۔ اسی طرح کی اور روایتیں جو سرکار دو عالم کی خود زیارت قبور کے سلسلہ کی ہیں۔ اگر ان روایتوں کا کوئی واقعہ حضرت عائشہ رضؓ کی باری کے دن کا ہو تو خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایک دن میں حسب شانِ رسالت ایک بار سے زائد بار اہل قبور پر جانا اور ان کے لئے دعائے مغفرت وغیرہ کرنا متعدد بار اور مختلف ایام میں بھی ثابت ہو جائے گا۔

اور یہ کچھ بعید نہیں ایک بار تو ایک دن میں دو مرتبہ زیارت قبور کرنا حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی سابقہ روایات سے ثابت ہو ہی چکا ہے، اور جب خود حضرت رسالتماب سے اس تکرار کا ثبوت ہو گیا تو اب اس کے جواز میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ حضرات صحابہ رضؓ سے اس کا صدور تلاش کیا جائے، اگر حضرات صحابہ رضؓ سے اس کا صدور نہ ملے جب بھی اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ بالخصوص جب اس میں مانع شرعی موجود نہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

رہ گئی یہ بات کہ حضرات صحابۂ کرام رضؓ سے اس کا ثبوت عام طور سے کیوں نہیں ملتا، آخر اس کی کیا وجہ ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی وجوہ متعدد ہیں، مثلاً یہ کہ عام طور پر صحابہ کرام رضؓ جہاد و تبلیغ وغیرہ کے باعث اکثر باہر رہتے تھے، مدینہ طیبہ میں قیام کا موقع کم ہوتا تھا، اور جب قیام بھی ہوتا تھا تو اس سے بڑے اور اہم کاموں (دین کی تعلیم و تبیغ اور اس کی اشاعت و ترویج وغیرہ) میں مشغولیت کی وجہ سے اس کا موقع ہی کم ہوتا تھا، اسی طرح وہ صحابہ رضؓ بھی جو مدینہ پاک میں زیادہ رہتے تھے ان کو بھی کو ان اہم کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے اس کا موقع کم آتا تھا اور بے شبہ یہ سب امور اس سے بہت زیادہ اہم ہیں اور واجبات اصلیہ میں سے ہیں، ان امور کے انجام دہی سے مقصد شرع و مقصد شارع اور مقصد رسالت کی تکمیل ہوتی تھی، اس وجہ سے ان حضرات سے اس کا ثبوت عام طور سے نہیں ملتا، نہ یہ کہ ان حضرات کو اس سے انکار تھا اور نہ یہ کہ اس کو لغو و بے کار یا غلط سمجھتے تھے، بلکہ وہ حضرات بھی اس کو مستحب و مندوب یا کچھ زائد ہی سمجھتے تھے لیکن چونکہ ان امور مہمہ کو جو واجبات اصلیہ اور مقاصد شرعیہ میں سے ہیں یقیناً فوقیت و اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے ان حضرات نے اپنے جذبات و نفسیاتی تقاضوں کو دبا کر منشاء رسالت کی تکمیل کے لئے ان امور مہمہ کی تعمیل کو مقدم کیا، یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جو لوگ باہر سے اپنے وقت کو فارغ وخالی کر کے محض مزار مقدس کی زیارت کے لئے تشریف لائیں، ان کو اس سے روکا نہیں جا سکتا بلکہ ان کو پورا پورا موقع اس کا دینا چاہئے کہ حدود شرع میں رہ کر وہ جس قدر اور جتنی بار زیارت کرنا چاہیں کریں۔

صحابہ کرام کے نفسیاتی ذوق کو تو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اور واقعاتی

طور پر، فتوح الشام وغیرہ میں منقول ہے۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابن عمرؓ جب سفر سے واپس آتے تو پہلے مزار مقدس کی زیارت فرماتے اور سلام پڑھتے پھر اپنے گھروں کو جاتے۔ بروایت عبدالرزاق و بروایت دارمی بھی صحیح سند کے ساتھ یہ واقعات مذکور ہیں (جذب القلوب وفاء الوفاء) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔ مولی حضرت نافعؓ تو فرماتے ہیں کہ میں نے سو بار سے زائد بار حضرت ابن عمرؓ کو مزار مقدس کی زیارت کرتے خود دیکھا ہے۔ جب انھوں نے سو بار سے زائد بار کرتے خود دیکھا ہے تو یقیناً اس سے کہیں زیادہ بار انھوں نے مزار مقدس کی زیارت کی ہوگی۔ اور اس میں ایک دن میں مکرر سہ کرر ہونا بھی مستبعد نہیں بلکہ قرین قیاس ہے۔

اور بہت سے صحابہ کرامؓ تو شام وغیرہ دور، دور مقامات سے تکالیف سفر برداشت کرکے محض مزار مقدس کی زیارت کے لئے مستقلاً سفر فرماتے اور زیارت مزار مقدس سے مشرف ہوتے، اس قسم کے متعدد واقعات جذب القلوب ص ۱۱۹، ۲۰۰ للمحدث الکبیر الشیخ عبدالحق دہلویؒ اور وفاء الوفاء ص ۴۰۹، ۴۱۰ ج ۲ میں بھی مذکور ہیں، بلکہ تمام سادات سلف کا ذوق عامۃً اسی انداز کا ہے، ان کے ذوق کی ایک جھلک جذب القلوب ص ۱۹۹ کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اختیار مسافرت سلف از جہت زیارت سید کائنات بسیار آمدہ وازاں جملہ حکایت آمدن بلال رضی اللہ عنہ مؤذن است در زمانہ خلافت امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ از شام بمدینہ"

خلاصہ جواب یہ ہوا کہ ان تمام باتوں سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ایک دن میں مکرر سہ کرر زیارت مزار مقدس مستبعد نہیں بلکہ قرین قیاس ہے، اور اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر کسی کو اس پر اعتراض یا اشکال ہو تو ممانعت کی دلیل پیش کرنا خود اس کے ذمہ ہے نہ کہ

ہمارے ذمہ، ہمارے لئے یہ پیش کردہ روایات وعبارات کافی وافی ہیں، بس شرط یہ ہوگی کہ حدود شرعیہ کے اندر ہو۔ اقوال، افعال شرکیہ، بدعیہ سے محفوظ ومامون ہو۔ مثلاً کوئی شخص مزار مقدس کو وثن یا سجدہ گاہ یا مثل اعراس مبتدعین کے جشن گاہ یا مجلس رقص وسرور یا مجلس سماع ومزامیر وغیرہ نہ بنائے۔

(ع۶) جو لوگ میقات کے اندر کے باشندے ہوں، ان کو ادائگی نسک کے بجائے اپنی کسی حاجت ضرورت سے بغیر احرام کے بھی مکہ مکرمہ میں داخل ہونا جائز ہے من کان داخل المیقات له ان یدخل مکة بغیر احرام لحاجته (الی قوله) بخلاف ما اذا قصد اداء النسك الخ هدایه ص۲۱۱ ج۱ وهکذا فی الفتح وغیره۔ اور جو لوگ میقات سے باہر وخارج کے باشندے ہیں، وہ اگر اپنی کسی ضرورت سے مثلاً خرید وفروخت تجارت وغیرہ کی ضرورت سے یا کسی سے ملنے جلنے کی غرض سے میقات کے اندر حرم سے باہر حل کے کسی مقام پر آئیں اور پھر ضمناً مکہ بھی آجائیں تو ان کے لئے بھی بغیر احرام کے آجانا اور مکہ مکرمہ میں داخل ہوجانا درست ہے، صرف شرط یہ ہے کہ مکان سے چلتے وقت مکہ مکرمہ داخل ہونے کی نیت بالکل نہ رہی ہو بعد میں یہ نیت ہوگئی ہو۔ اگر چلتے وقت مکہ میں داخل ہونے کی نیت ہوگی تو احرام باندھنا واجب ہوجائے گا۔ اور خلاف کرنے پر ایک حج یا ایک عمرہ واجب ہوجائے گا۔ (کمافی الدر) دخل کوفی ای آفاقی البستانی ای مکانا من الحل داخل المیقات لحاجته قصد ها ولو عند المجاوزة علی ما مر ونیة الاقامة لیست بشرط علی المذهب له دخول مکة غیر محرم ووقته البستان والاشئ علیه الخ۔

(وفی الکفایه) الآفاقی اذا دخل مکة بغیر احرام لزمه بسبب دخول مکة اما حجة او عمرة عندنا خلافا للشافعیؒ

حاشیہ ھدایہ وھکذا فی شروح الھدایہ ۱۲ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ۔

مفتی دارالعلوم دیوبند

۲۴/۹/۱۲ ھ

ذکر کا ایک خاص طریقہ اور اس کا حکم

سوال (۳۴۳) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ بعض صوفیاء ومشائخ حلقہ کراتے ہیں، جس کا طریقہ یہ ہے کہ ذاکرین شیخ کے قریب حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں، پھر شیخ ذکر لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ سب ذاکرین ایک آواز سے ذکر کرتے ہیں، گاہ بگاہ وہ شیخ اس پر توجہ ڈالتا ہے، جس کی وجہ سے ان کے اوپر ایک خاص حالت وکیفیت طاری ہے۔ کیا اس طریقہ پر ذکر کرانا اور کرنا ثابت ہے۔ اگر سلف سے ثابت نہیں تو اس صورت میں ایسا کرنا مفید اور جائز ہے یا نہیں۔ تفصیل سے مع نظائر کے جواب مرحمت فرماکر ممنون فرمائیں۔

الجواب:۔ اور اشغال واذکار کی طرح یہ بھی ایک طریقہ ذکر وعلاج ہے، اس سے بھی ایسی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے، جس کے ذریعہ سے باری تعالیٰ وعز اسمہ کی محبت مطلوبہ کی تحصیل آسان ہو۔ ذکر منفرداً ومجتمعاً خواہ سراً یا جہراً، اور توجہ کا القاء ثابت وجائز ہے۔ اس لئے اس کا مجموعہ بھی جائز وثابت ہونے میں کلام نہ ہوگا۔ البتہ اس کو واجب یا سنت کہنا یا قرار دینا یا اسی میں حصر کرنا درست نہ ہوگا۔

پس اگر شیخ کامل جو مکائد نفس سے اور طریق اصلاح سے واقف ہو، اور اس کی محبت مطلوبہ کی تحصیل کے لئے یہ طریقہ استعمال کرے تو کوئی وجہ اعتراض نہیں۔ رہ گیا ذکر منفرداً ومجتمعاً والقاء توجہ کا ثبوت تو اس کے لئے مندرجہ ذیل

روایات بھی کافی ہیں۔

(۱)۔ عن ابی ھریرۃ وابی سعید قالا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یقعد قوم یذکرون اللہ الا حفتھم الملائکۃ وغشیتھم الرحمۃ ونزلت علیھم السکینۃ وذکرھم اللہ فیمن عندہ رواہ مسلم (مشکوٰۃ شریف ص۱۹۶)

(۲)۔ وعنہ فی حدیث طویل قالوا المفردون یارسول اللہ قال الذاکرون اللہ کثیرا والذاکرات۔ رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ۔

(۳)۔ عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا مررتم بریاض الجنۃ فارتعوا قالوا وما ریاض الجنۃ قال حلق الذکر رواہ الترمذی۔ مشکوٰۃ ص۱۹۔

(۴)۔ عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ وافضل الدعاء الحمد للہ رواہ الترمذی مشکوٰۃ ص۲۰۱۔

اسی کے ساتھ حضرت جریر بن عبداللہؓ کی روایت بھی ملا لیجئے جس کو مشکوٰۃ ص۵۳۵ بروایت بخاری ومسلم کے نقل کیا ہے کہ یہ گھوڑے کی سواری پر قادر نہ تھے گر جاتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سینہ پر اپنے دست مبارک سے مارا اور سوار کرایا پھر اس کے بعد سے کبھی گھوڑے سے نہ گرتے تھے، اور حضرت ابوہریرہؓ کا بھی واقعہ یاد کر لیجئے جس کو وہ خود نقل فرماتے ہیں فلبسطت نمرۃ لیس علیّ ثوب غیرھا حتی قضی النبی صلی اللہ علیہ وسلم مقالتہ ثم جمعتھا الی صدری فوالذی بعثہ بالحق ما نسیت من مقالتہ ذلک الی یومی ھذا۔ بخاری ومسلم مشکوٰۃ ص۵۳۵ اور اسی کے ساتھ

حضرت عمرؓ کا واقعہ ملا لیجئے جس کو حدیث لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من نفسہ وماله ووالدہ وولدہ او کما قال ؐ کے تحت محدثین نقل فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! مال واولاد وغیرہ سے تو زیادہ محبت آپ کی دیکھتا ہوں لیکن ان میں جان سے زیادہ نہیں دیکھتا تو آپ نے حضرت عمرؓ کے سینہ پر دست مبارک سے ٹھونکا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ الآن یارسول اللہ یعنی ہاں اب یارسول اللہ آپ کی محبت اپنی جان سے بھی زیادہ پانے لگا۔ اس روایت کو اشعۃ اللمعات نے بھی نقل کیا ہے یہ سب توجہ نہیں تو اور کیا ہے۔ علماء نے توجہ باطنی کی بہت سی طرق تفصیل سے نقل فرمائے ہیں ان کو مطالعہ فرمائے۔ اب امید کہ خلجان رفع ہو جائے گا فقط

واللہ اعلم بالصواب

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند

۹/۲/۹۱ھ

منیٰ کی قربانیوں کا گوشت اور چمڑا قابل استعمال بنانے کی اسکیم

سوال (۳۴۴) ادارہ ہذا نے منیٰ کی قربانی کے جانوروں کے چمڑے گوشت وغیرہ کو سائینٹفکٹ طریقہ پر کارآمد بنا کر اس کی آمدنی سے مسلمانوں کی تعلیمی ومعاشی پستی کے انسداد کے لئے سفارتخانہ حکومت سعودیہ عربیہ دہلی سے درخواست کی۔ معزز سفیر نے رابطہ عالم اسلامی کانفرنس سے رجوع کرنے کی ہدایت کی۔ نیز حکومت ہند نے مذہبی موانعات کا جواز ظاہر کر کے اس میں حصہ لینے سے مجبوری کا اظہار کیا۔ ان حالات میں ہم اپنے منصوبہ کی تکمیل وکامیابی کے لئے آپ کی اصابت رائے اور فتویٰ کافی اہمیت کا حامل ہے، براہ کرم اس تعلق سے فتویٰ صادر فرما کر ممنون فرمائیں

الجواب :- یہ تو ظاہر ہے کہ قربانی کا گوشت و چمڑا قربانی کرنے والا خود استعمال کرڈالے یا کسی غریب کو صدقہ کردے یا کسی غنی کو تحفۃً ہدیہ کردے یہ سب جائز ہے، بشرطیکہ وہ واجب التصدق نہ ہو (جیسے نذر کی قربانی یا میت کی طرف سے اس کی وصیت کے مطابق کی ہوئی قربانی یا دم جنایت) ورنہ اس کا حکم دوسرا ہوگا پھر وہ غنی و غریب اس کا مالک ہونے کے بعد خود استعمال کرے یا کسی کو دیدے حتیٰ کہ چمڑے کو اگر فروخت کرکے اس کی قیمت اپنے مصرف میں صرف کرڈالے اس کا بھی اسے اختیار حاصل ہے۔ ہاں قربانی کرنے والا اگر خود تحفہ ہدیہ یا صدقہ کرنے کے بجائے فروخت کردے تو اس پر اس کی قیمت کا تصدق کرنا لازم ہوجائیگا یہی حکم منیٰ کی قربانی اور مناسک حج کے اضحیہ کا بھی ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ مناسک حج کا اضحیہ خالص اور اعلیٰ شعائر اسلامیہ میں سے ہے اور اس میں محض اظہار تعبد بشکل اراقۂ دم ہے، جیساکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی موقعہ پر ستر اونٹ اور کسی موقع پر سو اونٹ کی قربانی کرنے سے ظاہر ہے کیونکہ نفس وجوب اضحیہ تو ایک بکری یا اونٹ کے ساتویں حصہ سے بھی ادا ہوسکتا تھا۔

اور یہ اسکیمیں اگرچہ بظاہر خوشنما ہی نہیں قدرے مفید بھی معلوم ہوتی ہیں مگر اظہار تعبد کے منافی ہیں اور اس مقصد کو فوت کرتی ہیں جو مشکوٰۃ نبوت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے طرز عمل سے ظاہر ہورہا ہے۔ کیونکہ اس طرح کاربند ہونے پر بعد چندے یہ عمل (اراقۂ دم) بھی محض ایک سیاسی، تجارتی، معاشی مقصد ہوکر رہ جائے گا اور اظہار تعبد فنا ہوکر قلب موضوع، قلب ماہیت اور مسخ مذہب کا بھی ذریعہ و سبب بن جائے گا، اس لئے اس اسکیم کو اختیار کرنا شریعت مطہرہ کے ایک اہم مقصد کو فوت کرنا ہے۔

دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پستی کے ازالہ کی اس سے آسان اور

بے کھٹکہ دوسری بہت سی صورتیں موجود ہیں اور ان میں سے یہ صورت تو بہت ہی آسان ہے کہ ایسا نیک جذبہ رکھنے والے اگر خود صاحب نصاب نہ ہوں جب بھی اپنے گرد و پیش بسنے والے اغنیاء سے پوری پوری رقم زکوٰۃ ادا کرائے اور اس قسم کے پریشاں حالوں کی پریشانی کے رفع کرنے میں خرچ کرائیں اور اگر خود بھی صاحبِ نصاب ہیں تو ان پر اور بھی یہ حکم متوجہ ہے کہ اپنی رقم کی پوری پوری زکوٰۃ صحیح طریقہ سے ان مقاصد میں صرف کر کے ایسے لوگوں کی پریشاں حالی دور کریں اور دور کرائیں اور اس کا باقاعدہ نظم فرمائیں۔

اسی طرح حکومتوں کو بھی اس طرف متوجہ فرمائیں کہ اموال باطنہ وظاہرہ دونوں کی زکوٰۃ کا صحیح نظم اور صحیح استعمال ہونے لگے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفی عنہ

دار العلوم دیوبند

۵/۲/۹۲ھ

حرمتِ رضاعت سے متعلق مسائل

سوال (۴۵) محمد سراج الحق چودھری نے ایسی ایک عورت کو شادی کرنے کا ارادہ کیا جس پر تین معتبر عورتوں نے شہادت دی کہ سراج الحق نے اس عورت کی ماں کا دودھ پیا ہے، شاہدات ایک سراج الحق کی ماں جس کو تمام ہمسایہ والوں نے معتبر وثقہ ہونے کی شہادت دی۔ لیکن سراج الحق اس بارے میں اپنی ماں کی تصدیق نہیں کرتا بلکہ فاسقہ بھی کہتا ہے۔ دوسری عورت۔ عورت مذکورہ کی ماں یعنی دودھ ماں وہ بھی معتبر اور ثقہ ہے۔ سوم۔ ہمسایہ کی ایک عورت حاجی۔ بہر حال تینوں معتبر ہیں لوگ جانتے ہیں خصوصاً ہمسایہ کے لوگ جانتے ہیں، ایسی حالت میں سراج الحق کو اس عورت سے جو اپنی دودھ بہن ہے (شاہدات کی شہادت کی وجہ سے) اس سے شادی کرنا جائز

ہے یا نہیں بینوا بالدلیل توجروا باجر جزیل۔

الجواب:- مانا کہ حرمت رضاعت ثابت ہونے کیلئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت ضروری ہے، محض عورتوں کی شہادت سے حرمت ثابت نہ ہوگی، لیکن حرمت ثابت نہ ہونے پر نکاح کرلینا واجب بھی تو نہ ہوگا، بہت سے بہت مباح و جائز ہو سکے گا، اور حقیقی ماں کی اطاعت مباح امور میں واجب ہوتی ہے، اسی طرح رضاعی ماں کا احترام و عظمت اور اس کی اطاعت بھی امور مباحہ میں ضروری ہوتی ہے، پس جب یہ دونوں کہتی ہیں یہ دونوں رضاعی بھائی بہن ہیں۔ نیز اس کی شہرت بھی ہو چکی ہے تو ہرگز اسکو دونوں حقیقی ماں، رضاعی ماں، کی مخالفت جائز نہ ہوگی اور نکاح کی اجازت نہ ہوگی۔ علاوہ ازیں ماں کو فاسق کہنا سخت گناہ ہے۔ اگر بغیر وجہ شرعی کہا ہے تو خود فاسق شمار ہوگا، کیونکہ حکم قرآنی لاتقل لہما اف الایۃ کے خلاف ہے اور حدیث میں عقبہ بن حارث کا واقعہ بالکل اسی قسم کا منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس نکاح سے منع فرمادیا۔ پھر انھوں نے دوسری عورت سے نکاح کیا (مشکوٰۃ شریف ص۲۷۴) اس لئے سراج الحق صاحب کو ہرگز ایسی عورت سے شادی کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۹۱/۷/۱۴ھ

الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمود غفرلہ	سید احمد علی سعید
	دارالعلوم دیوبند

بینک کی ملازمت اور فنڈ سے متعلق مسائل

سوال (۴۶) (الف) کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ ایک شخص سرکاری ملازمت کرتا ہے سرکاری ملازمین کے مطابق ہر ماہ اس کی تنخواہ میں سے ۱۰ روپے لازمی طور پر کٹ جاتے ہیں۔ اور سالانہ ۱۲ روپے پر کم ازکم چار روپے یا اس سے زیادہ سود ملتا ہے، اور اسی رقم مجموعہ پر ہر سال اسی کے مطابق سود جمع ہوتا رہتا ہے، اور نوکری چھوڑتے وقت اس کو وہ تمام رقم مجموعہ مع سود در سود کے ملتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ سود لینا رقم پر قبضہ کے وقت جائز ہے یا نہیں؟

(ب) اگر ناجائز ہو، اور سود لینے سے بچنے کے لئے وہ ہر سال اپنی مجموعہ رقم پر جو سود ملتا ہے اس کے قبضہ سے پہلے اپنی جیب سے اتنی خیرات کردے اور قبضہ کے وقت تمام رقم اپنے پاس رکھ لے تو جائز ہے یا نہیں، یہ اس لئے کہ آخر ہی رقم سود کی نکلتی ہوئی نظر آئے اور اس سے دل میں تذبذب پیدا نہ ہوجائے، اس لئے کرنے کا ارادہ ہے۔

(ج) اس رقم کی زکوٰۃ ہر سال نکالنی ہوگی یا اس پر قبضہ کے بعد تمام سالوں کی نکالنی ہوگی یا صرف ایک سال کی۔

(د) بینک کی ملازمت کرنا، نیز بینک میں پیسے جمع کروانا یا بینک سے شیرز خریدنا اور ان شیرزوں کا مع نفع کے بیچنا مثلاً دس روپے کا شیر ۲۵ روپے میں بیچنا، نیز بینک کے علاوہ بڑی بڑی کمپنیوں کے شیرزوں کو اصل رقم سے زائد میں خریدنا مثلاً کسی میل کا شیر ۱۰۰ روپے کا ہو تو اس کو دوسو پچاس روپے میں خریدنا و بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

(ھ) وہ کون کونسے رنگین کپڑے ہیں کہ جو مردوں کو پہننا جائز ہے۔

(و) مردوں کو سونے کا بٹن، نیز سونے کی گھڑی کی چین جائز ہے یا نہیں؟

(س) اگر مؤذن کے بجائے ٹیپ ریکارڈ سے بلا کسی عذر کے اذان دینا جائز ہے یا نہیں؟ اعلام جو مقصود ہے وہ حاصل ہو جاتا ہے۔

(ح) کسی آدمی کی آمدنی بالکل یقینی طور پر ناجائز ہے، مثلاً چوری، شراب، جوا وغیرہ تو اس سے بیع وشرار کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور جو نفع بیع سے حاصل ہے، وہ ہمارے لئے جائز ہے یا نہیں؟

ان مسائل کا جواب کتب عربیہ سے عنایت فرمادیں۔

الجواب:- (الف، ب) سرکاری ملازمین یا کسی بھی ملازم کی تنخواہ سے ہر ماہ جو رقم محکمہ کاٹ کر خواہ جمع کرتا رہتا ہے اور اس پر سود کے نام سے یا جس نام سے بھی اضافہ کرتا رہتا ہے اور بعد ختم ملازمت ملازم کو دیتا ہے وہ سود نہیں ہے، وہ منجانب محکمہ انعام کے قبیل سے ہے، اس کا لینا اور اپنے استعمال میں لانا سب بے تکلف جائز ہے کسی قسم کا کوئی خیال یا شبہ نہ کریں، البتہ فنڈ سے جو قرض لیتے ہیں اور اس میں جو سود دیتے ہیں وہ شرعاً سود دینا ہے، اس سے بچنے کے لئے جہاں تک ہو سکے ایسا قرض نہ لیں۔!

(ج) اس رقم کی زکوٰۃ وصول ہونے کے بعد جب اس پر ایک سال گذرے گا، اس وقت ادا کرنا واجب ہوگی ابھی نہیں۔

(د) بینک میں ایسے کام کی ملازمت کرنا جو جائز ہو جائز ہے اس کی ہر ملازمت ناجائز نہیں، حفاظت کی ضرورت سے جمع کرنا درست ہے، جس بینک میں شرکت یا مضاربت کے اصول پر کاروبار ہوتا ہو اسکے شیرز اور اسی طرح تجارتی کمپنیوں اور فیکٹریوں کا شیرز خریدنا جائز ہے، یہ شیرز خریدنے والے ملکیت میں شریک اور مالکان فیکٹری وغیرہ کے افراد میں سے ایک فرد ہو جاتے ہیں۔ پھر جب اس شیرز کی حیثیت نقد سے بڑھ کر کمپنیوں میں اور فیکٹریوں میں کے سامان وآلات واثاثہ میں بھی منتقل ہو جائے تو

خریدے ہوئے روپیوں سے زائد میں فروخت بھی کر سکتے ہیں، البتہ شیرز کے محض متعین روپیوں کو محض روپیوں کے بدلے میں فروخت کرنا ہو تو زائد پر فروخت کرنا درست نہ ہوگا پس ۲۵ روپیہ کو ۵۰ روپے میں بیچنا تو جائز نہ ہوگا مثلاً یہی ۲۵ روپیہ کے شیئر کا مالک وہ دس رہا اسی نسبت سے پوری فیکٹری جو مثلاً دو لاکھ روپیہ کی ہو چکی ہے ۲۵ روپیہ والا شریک بھی مالک و شریک ہوا۔ اور وہ اپنے اس حصہ کو ۲۵ روپیہ کے بجائے ہزار روپیہ میں بیچے تو یہ درست ہوگا۔

(ھ) احمر قانی (گارھا سرخ) شوخ گلابی، کسم کا رنگ زعفران (جو رنگ زنانے شمار ہیں) ان رنگ کے کپڑوں کا استعمال مردوں کو درست نہیں ہے۔

(د) سونے کے بٹن جو مستقل اور الگ ہوتے ہیں، ان کا استعمال مردوں کے لئے جائز نہیں ہے۔ گھڑی کے سونے کی چین جائز نہیں ہے۔

(س) مؤذن کا محض انسان ہونا کافی نہیں بلکہ ایسا مسلمان ہونا بھی شرط ہے جو اوقات صلوٰۃ کو پہچانتا ہو، اور مقصد اذان بھی سمجھتا ہو۔ یہ ٹیپ ریکارڈ مسلمان ہونا تو درکنار انسان بھی نہیں ہے مقصود اذان کا حصر اعلام میں نہیں اور نہ اعلام علت ہی ہے کہ یہ مذکورہ تفریع متفرع ہو سکے۔

(ح) کسی آدمی کی آمدنی اگرچہ سب ناجائز ہی ہو لیکن جبتک متعین طور پر یہ معلوم نہ ہو جائے کہ جو چیز یہ بیچ رہا ہے یہ حرام و ناجائز کی ہے یا جو قیمت یہ دے رہا ہے وہ حرام و ناجائز پیسہ کی ہے، اس کے ساتھ خرید و فروخت کا ناجائز ہونا ضروری نہیں۔ اور نہ اس سے حاصل شدہ رقم کا حرام و ناجائز ہونا ضروری ہے۔ فقط

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند ۲۲ ھ ۹۱

الجواب صحیح

محمود عفرلہ ۔ دار العلوم دیوبند

مسئلہ وراثت

سوال (۷۰۴) کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں، چار بھائی اور والد صاحب ایک ساتھ رہتے تھے مگر آپس کے خانگی جھگڑے کی وجہ سے ایک بھائی الگ ہونا چاہا، اس حالت میں کہ تمام جائداد، دوکاندار الگ مگر والد محترم اور نہ ہی بھائیوں سے ایسا کرنے دیا بلکہ اس طرح الگ کرنا چاہا کہ جو کام تم کرو اس سے اپنے بال بچوں کا خرچہ چلاؤ۔

لیکن جو بھائی الگ ہو رہا تھا وہ یہ چاہتا تھا کہ اسی وقت ہر چیز بانٹ دیجائے مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ اس کی اس بات پہ یہ کہا گیا کہ تم گاڑی کے آگے کانٹا رکھتے ہو۔ بہرحال مجبور ہو کر اس بات پہ والد محترم اور بھائیوں سے ایک بھائی کو الگ کیا کہ تم کارخانہ پہ جتنا ہوگے اس سے اپنے بال بچوں کا خرچہ چلانا، باقی جو کاروبار ہو رہا ہے اسی طرح سے ہوتا رہے گا، وقتی طور پر تمہیں الگ کر رہا ہوں، پھر جب حالات سازگار ہوئے تو ایک ہی ساتھ کردوں گا، تم نہ یہ سمجھو کہ تمہیں الگ کر رہا ہوں لہذا وہ بھائی الگ ہو گیا، اور اس کو ایک ہینڈلوم کارخانہ جس پر ۲۲ ساڑی تھی جو دوسرے مکان میں تھا اور جس کی باقی دے کر الگ کر دیا وہ بھائی بن نہیں پا رہا تھا، اس لئے دوسرے سے اور خود بھائیوں سے کچھ قرض لے کر کاروبار کر رہا ہے اب جو بھائی الگ ہوا تھا وہ ان تین بھائیوں کے کاروبار میں اپنے حصہ کا مطالبہ کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ اس فرم میں بھی برابر کا شریک ہوں، جب کہ اسی فرم سے ایک مکان لیا گیا جس کی چار بھائیوں کے نام کی رجسٹری بھی ہوئی، مگر تین بھائی اس کے حصہ کو تسلیم نہیں کرتے جبکہ والد صاحب تسلیم کرتے ہیں۔ اب ایسی حالت میں شریعت کی رو سے جو ہو آپ فیصلہ فرما دیں۔

الجواب:- جب والد محترم زندہ تھے اور سب بھائی ان کے ساتھ ہی کام کرتے تھے تو والد صاحب تنہا سب کے مالک تھے محض کسی ایک لڑکے کو

الگ کر دینے سے یا الگ ہو جانے سے اس کا حق وراثت سوخت نہیں ہوگا، خاص کر اس تحریر سوال کے مطابق بلکہ والد صاحب کے انتقال کے بعد ان کے تمام متروکات میں جس میں یہ خرید کردہ مکان بھی شامل تھے چاروں لڑکو کا یکساں اور برابر حق ہے الگ ہونے والے بھائی کو اپنے حق کے مطالبہ کا استحقاق حاصل ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

الجواب صحیح — دار العلوم دیوبند

محمود غفرلہ — ۱۴/۷/۹۱ ھ

بعض احکام متولی

سوال (۴۸) ایک ہمسایہ مسجد کا متولی ہے، دو ڈھائی سال سے اپاہج ہے، کرسی پر بیٹھے پڑے رہتے ہیں، نقل وحرکت بالکل کر سکتا نہیں دوسرے آدمیوں کی امداد کے بغیر پیشاب پاخانہ مشکل، لحاف وغیرہ خود بخود استعمال نہیں کر سکتا، نماز وغیرہ میں اسی وجہ سے خانگی رہتی ہے۔ مسجد جانے کی ضرورت ہو تو تین چار آدمی کرسی پر اٹھا کر لاتے ہیں، ایسی حالت پر ہمسایہ کے لوگ متولی رہنے پر ناراض ہیں، کیونکہ اس سے تو کماحقہ ہر کام چلتا نہیں، بلکہ وہ زبردستی متولی رہنا چاہتا ہے، کچھ تعصباً اس کی طرفداری کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں ایسے شخص کو مسجد کا متولی باقی رکھنا شرعاً کوئی قباحب ہے یا نہیں، اطمینان بخش جواب مطلوب ہے۔

الجواب:۔ انتظام مسجد درست رکھنے کے لئے متولی کا مسجد میں آنا ہر وقت ضروری نہیں ہے۔ اگر یہ متولی پہلے سے مقرر ہے اور صحیح کام انجام دیتا تھا اور اب بھی غبن وغیرہ خرد برد وقف میں نہیں کرتا تو محض اس کی معذوریوں کی وجہ سے اس کو معزول نہ کیا جائیگا، ایسا کرنا درست نہ ہوگا فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ۔ دار العلوم دیوبند۔ ۱۴/۷/۹۱ ھ

رویت ہلال عیدگاہ کمیٹی بمبئی کا رویت ہلال سے متعلق مفصل بحث

سوال (۴۹) (۱) رویت ہلال کا مسئلہ روایت و خبر سے تعلق رکھتا ہے یا شہادت سے ؟

(ب) اگر خبر سے تعلق رکھتا ہے تو اس کو قبول کرنے کے کیا شرائط ہونے چاہئے

(ج) اگر شہادت سے تعلق رکھتا ہے تو اس کو قبول کرنے کے کیا شرائط ہونے چاہیئے ۔

(د) ڈاڑھی مونڈنے والے شخص کی خبر یا شہادت قبول کرلی جائے گی یا نہیں ۔

سوال ۲؎ (۱) کیا اختلاف مطالع کی کوئی جغرافیئی حقیقت ہے ؟

(ب) کسی مقام یا علاقہ کی رویت دوسرے مقام یا علاقہ کے لئے شرعاً معتبر ہے یا نہیں ؟

(ج) کیا مشرقی علاقہ کی رویت جہاں آفتاب پہلے غروب ہوتا ہے مغربی علاقہ کے لئے جہاں آفتاب بعد غروب ہوتا ہے معتبر سمجھی جانی چاہیئے یا نہیں ۔

(د) کیا ہندوستان کے کسی مقام کی رویت کو پورے ملک کے لئے قابل قبول ہونا چاہیئے ۔

سوال ۳؎ (۱) دوربین کے ذریعہ یا ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بلندی سے چاند دیکھنے کا اعتبار کیا جائے گا یا نہیں ۔

سوال ۴؎ (۱) کسی مقام کی رویت کا اعلان اگر مقامی قاضی ٹیلیویژن یا ریڈیو پر کرتا ہے یا بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دیتا ہے تو مقامی لوگوں کے لئے ایسا اعلان اور ایسی اطلاع قابل قبول ہے یا نہیں ۔

(ب) ریڈیو اور ٹیلیویژن کی خبر دوسرے مقامات کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں اگر ہے تو کن کن شرائط کے ساتھ ۔

(ج) ٹیلیفون کی اطلاع جب کہ آج کل بڑے بڑے شہروں کے درمیان

ڈائریکٹ ڈائلانگ کا سسٹم رائج ہے، دوسرے مقامات کے لوگوں کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں، اگر ہے تو کن شرائط کے ساتھ۔

(د) تار کی اطلاع دوسرے مقامات کے لوگوں کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں اگر ہے تو کن کن شرائط کے ساتھ۔

(ہ) خط کے ذریعہ دوسرے مقامات کے لوگوں کو اطلاع مل جائے تو اسے قبول کیا جائے گا یا نہیں اگر قبول کیا جائے گا تو کن صورتوں میں۔

سوال ۵ - کیا رویت ہلال کے اعلان کے لئے کسی مرکزی کمیٹی کی تشکیل سے آپ متفق ہیں اور کیا بڑے بڑے شہروں میں ذیلی کمیٹیوں کی تشکیل سے بھی آپ کو اتفاق ہے۔

سوال ۶ - رویت ہلال کے مسئلہ پر کوئی اور مشورہ جو آپ دینا چاہیں

الجواب:- (۱) ہلال رمضان تو مطلقاً خبر سے متعلق ہے باقی اور ہلال (عید وغیرہ) اگر حاکم یا والی مسلم یا قاضی شرع یا اس کا قائم مقام جیسے رویت ہلال کمیٹی وغیرہ موجود ہو تو شہادت سے متعلق ہوتا ہے ورنہ وہ بھی خبر شرعی سے متعلق ہوتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے۔

(الف) وقبل بلا دعوی وبلا لفظ اشهد وبلا حكم ومجلس قضاء لانه خبر شهادة للصوم خبر عدل مستور . . . -

(ب) وشرط للفطر مع العلة والعدالة نصاب الشهادة ولفظ اشهد وعدم الحد فی قذف لتعلق نفع العبد . . . ۱۲

(ج) ولو كانوا ببلدة لا حاكم فيها صاموا بقول ثقة وافطروا باخبار عدلين مع العلة للضرورة الى الآخر -

اور اس کے تحت شامی کتاب الصوم ص ۱۲۵/۲ میں ہے۔

قولہ للضرورۃ الخ ای ضرورۃ عدم حاکم یشھد عندہٗ۔

اس لفظ للضرورت سے معلوم ہوا کہ اگر حاکم شرع یا اس کا قائم مقام موجود ہوگا تو اس کو تقدم ہوگا اور فیصلہ کرنے کا استحقاق اسی کو رہے گا۔

(ب وج) شہادت کے متعلق ہونے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ خصومات یا حقوق العباد میں واقع شدہ نزاعات کی طرح ہر اعتبار سے تحت القضاداخل ہو بلکہ مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز اگرچہ دیانات کے قبیل سے ہے مگر چونکہ اس کا تعلق عامۃ المومنین سے ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں جیسے رویت ہلال فطر میں کہ اس میں نفع عباد کا بھی تعلق ہوجاتا ہے، اس لئے درستگی نظم اور عمدگی امتثال کے لئے قضاد امارات سے تعلق ہوجاتا ہے اور قضاوامارات سے متعلق ہونے کے معنی بھی یہ نہیں ہے کہ امیر المومنین وصاحب قوت قہریہ کا موجود ہونا ضروری ہو بلکہ اگر یہ موجود ہو تو فھو المراد، ورنہ ایسا معتمد وثقہ شخص جو تراضی مسلمین سے اس قسم کے معاملات میں حدود شرع میں رہ کر فیصلہ کرنے کے لئے اور اس میں جو اختلافات رونما ہوں، ان کو دور کرنے کے لئے منتخب و نامزد کردیا گیا ہو تو کافی ہے اور اگر ایسا عند الکل معتمد شخص موجود نہ ہو تو جماعت مسلمین (جیسے رویت ہلال کمیٹی جس کے سب ارکان باشرع ہوں) یا خطیب جامع مسجد وعیدگاہ یا وہاں کا معتمد مفتی یا عالم جس کے سامنے اس قسم کے معاملات میں رجوع کیا جاتا ہو قاضی شرع کے قائم مقام قرار دے کر اس کے سامنے حسب قاعدۂ شرع شہادتیں گذار کر ثبوت رویت حاصل کرلیا جاوے اور اگر ایسا بھی نظم موجود نہ ہو تو محض خبر شرعی پر حسب قواعد شرع عمل کرلیا جائے کیونکہ وجوب صوم وافطار کا مدار محض ثبوت رویت پر ہے جو شرعی ضابطہ کے مطابق ہو جیسا کہ آیت کریمہ فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ الآیۃ پارہ ۲ کے منطوق

اور احادیث صحیحہ کے مدلول اور مفہوم سے واضح ہوتا ہے۔ مثلاً

(الف) صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ (مسلم ص۳۴۷ ج۱) — چاند دیکھ کر روزہ رکھا کرو اور چاند ہی دیکھ کر افطار کیا کرو۔

(ب) لا تصوموا حتی تروا الھلال ولا تفطروا حتی تروہ فان اغمی علیکم فاقدروا لہ (وفی روایۃ) فاقدروا لہ ثلاثین (وفی روایۃ) فعدوا ثلاثین (مسلم) (مسلم ص۳۴۷ ج۱ وابوداؤد) — روزہ مت رکھا کرو اور اسی طرح افطار مت کیا کرو جب تک چاند نہ دیکھ لو اور اگر (بوجہ ناصافی مطلع) چاند مخفی رہ جائے تو (مہینہ کی) مقدار پوری کر لیا کرو اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے لئے تیس دن پورے کر لیا کرو اور ایک روایت میں ہے کہ تیس کا شمار کیا کرو۔

(ج) لا تقدموا الشھر حتی تروا الھلال او تکملوا العدۃ ثم صوموا حتی تروا الھلال او تکملوا العدۃ (ابوداؤد ص۳۲۵ ج۱) — (کسی مہینہ کی ابتداء) چاند دیکھنے پر مقدم نہ کیا کرو (اگر چاند نظر نہ آوے) تو شمار (تیس دن کا) پورا کر لیا کرو پھر (اسی طرح چاند دیکھ کر) روزہ رکھا کرو یا تیس دن کا شمار پورا کر لیا کرو

اور جن شرائط و قیود کا قبول شہادت و خبر میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ان کی تفصیل فقہائے کرام رحمہ اللہ نے اس طرح تحریر فرمائی ہے۔

(۱) اگر موقع ہلال رمضان کا ہو اور مطلع ناصاف ہو یعنی کسی غبار وغیرہ کی وجہ سے رویت عامہ سے مانع ہو تو محض ایک عادل یا مستور الحال مسلمان کی شہادت سے روزہ رکھنے کا حکم دیدیں گے خواہ وہ گواہ گواہی دینے کا لفظ (میں گواہی دیتا ہوں الخ) کہے یا نہ کہے دونوں صورتیں معتبر ہوں گے (درمختار)۔

(۲) اگر موقع ہلال عیدین یا کسی اور مہینہ کا ہو اور مطلع نہ صاف ہو تو دو عادل یا

مستور الحال ثقہ مسلمان کی شہادت سے جو گواہی کے الفاظ (مثلاً میں گواہی دیتا ہوں الخ) کے ساتھ ہو (در مختار)

(۳) اگر موقع ہلال رمضان یا غیر رمضان (عیدین وشعبان وغیرہ) کا ہو مگر مطلع صاف ہو تو عادل یا مستور الحال ثقہ مسلمانوں کی شہادت (گواہی کے الفاظ) کے ساتھ اتنی تعداد میں ہو کہ رویت ہلال کے ثبوت کا ظن غالب ہو جائے (نوٹ) یہ تعداد متعدد ہونے کے بعد کسی خاص عدد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ قاضی شرع یا اس کے قائم مقام (ہلال کمیٹی وغیرہ) کی صواب دید پر محمول ہے۔

(۴) اگر ایسے مقام میں رویت ہلال کے ثبوت کا مسئلہ پیش کیا جائے جہاں قاضی شرع یا اس کے قائم مقام (رویت ہلال کمیٹی یا خطیب جامع وغیرہ) کوئی موجود نہ ہو تو وہاں کے لوگوں پر لازم ہوگا کہ وہ لوگ انہی تفصیلات مذکورہ کیساتھ جو ابھی تین نمبروں میں مذکور ہوئی ہیں، عادل یا مستور الحال مسلمان کے قول وخبر کے مطابق عمل کریں (در مختار) عوام خود رائی ہرگز نہ کریں۔

(۵) ڈاڑھی رکھنا تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت اور تمام انبیاء کا طریقہ بتایا گیا ہے اور اسکو اپنانے کی بڑی تاکید فرمائی گئی ہے اور مونچھ کٹانے اور ڈاڑھی رکھنے کو مسلمانوں کی پہچان اور اسلامی شعار بتایا گیا ہے اور اس کا بھی بہت تاکیدی حکم دیا گیا ہے فرمایا گیا ہے قصوا الشوارب واعفوا اللحیٰ (وفی روایۃ) حلقوا الشوارب واعفوا اللحیٰ وخالفوا ذی الاعاجم (مسلم شریف) ترجمہ مونچھوں کو کٹایا کرو اور ڈاڑھی کو بڑھایا کرو اور ایک روایت میں ہے مونچھوں کو صاف کر دیا کرو (یعنی جلدی سے بال نکال دیا کرو مونڈ کر یا کاٹ کر) اور ڈاڑھی کو بڑھا کے رکھا کرو، اور اعاجم (غیر مسلمین

کے طور طریقے کی مخالفت کیا کرو۔

اس مضمون کی بہت سی تاکیدی روایات واحادیث اور بھی ہیں، اس کو شعار اسلامی قرار دینے سے اہمیت اور عظمت اور بھی بڑھ گئی ہے، قرآن کریم میں ہے ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب۔ الآیۃ اور شعائر کے تحفظ کرنے وزندہ رکھنے میں قوم کی بقاء وزندگی مضمر رکھی گئی ہے۔ انہی وجوہ سے ڈاڑھی نہ مونڈانا واجب قرار پایا ہے اور مونڈانا معصیت کبیرہ قرار پایا ہے اور یہ ایسا کبیرہ ہے کہ اس کو چھپانا بھی چاہے تو چھپا بھی نہیں سکتا۔ اور پھر اس کے مونڈانے کی عادت کر لینے میں تو کبیرہ گناہ کے ارتکاب علی الاعلان پر اصرار ہو جاتا ہے جس سے معصیت کبیرہ کی شدت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور ایسا علانیہ وظاہر ارتکاب ہوتا ہے کہ اس کے ثابت کرنے میں کسی دلیل شرعی کے قائم کرنے کا احتیاج بھی نہیں رہتا ہے۔ اس لئے ایسا شخص اصطلاح شرع میں خود بخود فاسق معلن کی فہرست میں آجاتا ہے جس طرح تارک صلوٰۃ تارک صوم جو علی الاعلان وبرملا صوم وصلوٰۃ کو ترک کرتا ہو تو اگرچہ ڈاڑھی رکھتا ہو مگر وہ بھی فاسق معلن کی فہرست میں آجاتا ہے اور ڈاڑھی رکھنا اس کو اس فسق سے نہیں بچاتا لیکن اس کے باوجود اس کی شہادت ہر موقع میں نامقبول وردنہ ہوگی بلکہ بہت سے مواقع میں مقبول ومعتبر ہوگی جیسا کہ اگلی تفصیلات سے عنقریب واضح ہو جائے گا۔ اس لئے کہ فاسق معلن کے بارے میں حکم خداوندی ہے کہ جب کوئی فاسق کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کرو تبیین کرو، اور بغیر تحقیق وتبیین کے کوئی حکم اس کی خبر پر نہ لگاؤ۔ ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا (الآیۃ) اور اس کا حاصل یہی ہے کہ اگر تحقیق وتبیین کے بعد خبر کے صداقت کا ظن غالب ہو جائے تو وہ مقبول ہو سکتی ہے لہٰذا جب شرعی اصطلاح

کے مطابق کوئی شخص فسق میں ابتلاء کے ساتھ شہادت یا خبر دے گا تو بحکم آیت قرآنی اس کی تبیین و تحقیق کریں گے، اور قاضی خاں کے ذکر کردہ تفصیل کے مطابق قبول یا عدم قبول کی تعیین کریں گے۔ قاضی خاں اس طرح فرماتے ہیں۔

الفسق لا یمنع اهلیة الشهادة عندنا وانما یمنع اداء الشهادة لتهمة الکذب وتکلموا فی الفسق الذی یمنع الشهادة اتفقوا علی ان الاعلان بکبیرة یمنع الشهادة وفی الصغائر ان کان معلنا نوع فسق مستشنع یسمیه الناس فاسقا مطلقا لا تقبل شهادته وان لم یکن کذلک ینظر ان کان صلاحه اکثر من فساده وثوابه اغلب من الخطاء ویکون سلیم القلب

فسق کسی کو اس کے شاہد بننے کی صلاحیت سے نہیں روکتا بلکہ کذب کی تہمت کیوجہ سے شہادت ادا کرنے (اور قبول کرنے سے) روکتا ہے (اور علماء نے اس فسق کے بارے میں جو ادائے شہادت سے روکتا ہے پوری گفتگو فرمائی ہے علماء نے اتفاق کیا ہے کہ کبیرہ گناہ کو علی الاعلان کرنا قبول شہادت سے روک دیتا ہے اور صغائر کو بالاعلان کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس قسم کا ہو جس سے شنیع و قبیح درجہ کا فسق نمایاں ہوتا ہو کہ اس کی وجہ سے عوام الناس اس کو فاسق سمجھنے لگتے ہوں تو اس کی شہادت بھی مقبول نہ ہوگی اور اگر وہ شخص ایسا نہ ہو تو غور کریں گے اگر اس کی صلاح و اچھائیاں اس کے خطاء و برائیوں پر غالب ہوں اور وہ شخص سلیم القلب ہو تو وہ عادل ہی شمار ہوگا اور اس کی شہادت بھی مقبول ہوگی

یکون عدلاً تقبل شھادتہ وعن ابی یوسف ان کان الفاسق وجیھا ذامروۃ جازت شھادتہ لان مثلہ لایکذب (قاضی خاں کتاب الشھادۃ)	اور حضرت امام ابو یوسفؒ سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر فاسق ذی وجاہت اور بامروت ہو تو اس کی شہادت بھی مقبول ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ ایسا آدمی جھوٹ نہیں بولتا جھوٹ کو اپنی حیثیت عرفی کے منافی سمجھتا ہے۔

اور اسی مضمون کو متعدد فقہاء نے اپنے اپنے انداز میں مختلف عبارتوں میں ذکر فرمایا ہے جیسے رد المحتار، در مختار، بحر الرائق، بدائع الصنائع۔ چنانچہ صاحب بدائع ص۲۷۱ کے الفاظ یہ ہیں لکن الصدق لایقف علی العدالۃ لا محالۃ یعنی لیکن صدق ہمیشہ سچائی اور لامحالہ عدالت ہی پر موقوف نہیں رہا کرتی بلکہ فان من الفسقۃ من لایبالی بارتکاب انواعا من الفسق ولکن یستنکف عن الکذب۔ بلکہ بہت سے فاسق ایسے ہوتے ہیں جو طرح طرح کے فسق میں مبتلیٰ رہنے کے باوجود جھوٹ نہیں بولتے جھوٹ بولنے کو برا جانتے اور مانتے ہیں اور اس سے بچتے ہیں۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ ڈاڑھی مونڈانے والا شخص مثلاً اگر صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے، معاملات کا سچا ہے، جھوٹ نہیں بولتا، یا ذی وجاہت وذی مروت ہے، باوقار ہے، جھوٹ بولنے کو، بالخصوص ایسے معاملات میں اپنی تحقیر و توہین سمجھتا ہے یا اس میں اس کی تحقیر و توہین لازم آئے گی تو اس کی شہادت قبول کی جائے گی۔

اسی طرح ایسا شخص جس کی شکل وصورت وضع قطع شریعت کے مطابق نہ ہو لیکن وہ سنجیدہ اور باوقار ہو جھوٹ بولنے کو خود اپنی شان کے خلاف

سمجھتا ہو، اس کی شہادت بھی تسلیم کی جا سکتی ہے، درمختار کتاب الشہادت میں ہے فان عدالۃ الشاهد شرط لوجوبہ لا لمصلحتہ فلو قضی بشاهدۃ فاسق نفذ اور اسی بنا پر ایسے لوگوں کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ اپنے فسق کا علم رکھتے ہوئے بھی اگر شہادت دیں، اس لئے کہ بسا اوقات قاضی اس کی شہادت قبول کرے گا۔ چنانچہ اسی درمختار میں ایک سوال قائم فرماتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وهل لہ ان یشهد مع علمہ لفسقہ قال البزازی نعم لان القاضی ربما یقبلہ۔ ترجمہ (سوال) کیا کسی فاسق کو اپنے فسق کا علم ہونے کے باوجود گنجائش و جواز ہے کہ وہ شہادت دیدے تو (جواب میں) صاحب فتاویٰ بزازیہ نے کہا ہے کہ ہاں اس لئے کہ قاضی بسا اوقات اس کی شہادت قبول کرے گا اور حق واضح ہوگا اور ڈاڑھی منڈانے والے یا اپنی شکل وصورت یا وضع قطع مطابق شریعت نہ رکھنے والے بسا اوقات ایسے سنجیدہ ذی وجاہت اور باوقار ہوتے ہیں جو جھوٹ بولنے کو خود اپنی شان کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ بخلاف اس شخص جو ڈاڑھی حد شرع میں رکھتا ہو لیکن شراب کے نشہ میں برملا چور رہتا ہو، اور بلا حجاب و شرم باہر نکلتا اور اسی نشہ میں گھومتا پھرتا ہو۔ اور بخلاف اس شخص کے جو ڈاڑھی بھی رکھتا ہو، حج بھی کرچکا ہو، نماز بھی پڑھتا ہو مگر برملا شراب سازی کا کاروبار بھی کرتا ہو یا طوائف کے ساتھ بھی خلوت وجلوت، ربط وضبط رکھتا ہو، یہ لوگ اپنی ظاہری شکل وصورت اگرچہ صحیح رکھتے ہوں مگر اپنے اس شنیع فعل اور دنی و ذلیل حرکات کے وجہ سے عوام کے نزدیک بھی باوقار و ذی وجاہت و معتبر شمار نہ ہوں گے اور ایسے لوگوں کی شہادت قبول نہ کی جائے گی۔ اسی طرح وہ شخص جو برملا سٹہ بازی کرتا اور جوا کھیلتا ہو، اور عام طور پر متہم بالکذب والانارۃ ہو اس کی شہادت بھی باوجود

ظاہری شکل وصورت، وضع قطع خلاف شرع نہ ہونے کے قبول نہ کی جائے گی۔
بخلاف اس شرابی یا زانی یا چور یا سود خوار کے جو یہ حرکتیں مخفی طور پر کرتا ہے اور مخفی رکھتا ہے عند اللہ اگرچہ وہ بھی فاسق وفاجر اور عاصی ہے اور تائب ہونا اس پر بھی واجب ہے مگر عند الناس بوجہ خفاء کے فاسق معلن شمار نہ ہوگا اور باب الشہادت میں ناقابل قبول یا مردود الشہادت ہونا ضروری نہ ہوگا اس لئے کہ شریعت مطہرہ نے لقد کرمنا بنی آدم کے تحت اور عرض مومن کے تحفظ کے خاطر بلاوجہ تجسس سے روکا ہے حتیٰ کہ فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ ان الشاهد اذا کان فاسقا سرًا لا ینبغی ان یخبر بفسقه (الی قوله) والمعدل اذا قال للشاهد هو متهم بالفسق لا تبطل عدالته (شامی ج ۳ ص ۲۲۷) ترجمہ شاہد جب مخفی طور پر فسق میں مبتلی ہو تو جائز نہیں ہے کہ کوئی اس کے فسق کی خبر دے کر اور اس کی صحیح شہادت کو مجروح کرے بلکہ اگر معدل بھی کسی شاہد کے بارے میں اطلاع دے کہ یہ شخص فسق کے ساتھ متہم ہے تو بھی ایسی حالت میں اس کی عدالت ظاہری باطل نہ ہوگی۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ فاسق خواہ چوری، شراب نوشی، زنا وغیرہ کی فسق میں مبتلا ہو یا ڈاڑھی مونڈانے کی فسق میں گرفتار ہو، لیکن ہر دور میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو ان سارے وجوہ کے باوجود ذی وجاہت یا مروت ہوتے ہیں، اور اپنی حیثیت عرفی کو قائم رکھنے کے لئے جھوٹ کو اپنی شان سے گرا ہوا دیکھ کر کبھی اس کا ارتکاب نہیں کرتے۔ نیز ایسے لوگ بھی دیکھے جاتے ہیں جو عام معاملات اور عبادات کے لحاظ سے دیندار معلوم ہوتے ہیں۔ فرائض وواجبات بلکہ سنن ونوافل ومعمولات کے بھی پابند ہوتے ہیں، لیکن سوسائٹی کی خرابی کی وجہ سے ڈاڑھی نہیں رکھتے۔ اس لئے ایسے افراد کے لئے شریعت مطہرہ نے

علی الطلاق شہادت رد کردینے کے بجائے تبیین وتحقیق کا اصول مقرر کیا ہے ان کی خبر یا شہادت کو ان اصولوں کے معیار پر رکھ کر دیکھ لیا جائے اگر تبیین وتحقیق کے بعد ان کی خبر یا شہادت قابل قبول ہو تو قبول کرلی جائے ورنہ رد کردیا جائے

(۲) (الف) اختلاف مطالع کے موجود ہونے اور اس کے ثابت ومتحقق ہونے اور پائے جانے سے قطعاً انکار نہیں ہے اس کا وجود تو تسلیم ہے بلکہ مشاہد ہے کہ ایک جگہ طلوع آفتاب کا وقت ہے تو ایک جگہ دوپہر کا وقت ہے اور ایک جگہ غروب کا وقت ہے فی زمانہ اس کے وجود کا انکار معمولی عقل کا انسان بھی نہیں کرسکتا، کلام اس کے وجوب صوم وافطار میں معتبر ہونے میں ہے۔ شریعت مطہرہ نے وجوب وثبوت صوم وافطار کو اختلاف مطالع پر محمول یا دائر نہیں فرمایا بلکہ حد شرع کے مطابق چاند کے دیکھنے اور دیکھنے کی شہادت وخبر پر دائر فرمایا ہے جیساکہ اوپر ہم صوموا الی رویتہ وغیرہ احادیث اور آیت کریمہ فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ الآیۃ پیش کرکے ذکر کرچکے ہیں پس اختلاف مطالع کی جغرافیائی حیثیت تو تسلیم ہے بلکہ نماز وغیرہ کے اوقات اور دیگر بہت سے معاملات میں جن میں شریعت نے اس کے اعتبار کرنے کی آزادی دی ہے اعتبار بھی ہے مگر صوم وافطار میں شریعت مطہرہ نے ہم کو پابند بنادیا ہے۔ اس لئے اس کا اعتبار اور اس پر مدار رکھنا درست نہ ہوگا۔

(ب) اپنے قیود وشرائط کے ساتھ معتبر ہوگی۔

(ج) ہاں! جب شرعی ضابطہ کے مطابق آجائے تو معتبر ہوگی۔

(د) ہاں! اس کا بھی یہی حکم ہے کہ جب شرعی ضابطہ کے مطابق ثابت ہوکر اور شرعی ضابطہ کے مطابق اس کی اطلاع آجائے گی تو معتبر ہوگی، ان تینوں نمبروں (ب، ج، د) میں محولہ شرعی قیود وشرائط کی تفصیل عنقریب خود بخود سوال نمبر چار

میں آجائے گی۔

(۳) دین اسلام دین سادہ اور دین فطرت ہے، اس کے احکام بھی سادہ اور فطری اصول کے مطابق ہوتے ہیں تاکہ ہر عاقل بالغ انسان خواہ پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ خواہ امیر ہو یا غریب اور خواہ کسی خطہ کا باشندہ ہو آسانی سے عمل کر سکے اور اپنے خالق و مالک و مربی سے اپنا رشتہ عبودیت صحیح طریقے سے جوڑ سکے۔

سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رصد گاہیں ہند و بیرون ہند میں موجود تھیں، اصطرلاب وغیرہ بھی آلات موجود تھے اور ان آلات و رصد گاہوں کے ذریعہ سے صحیح طریقہ سے معلوم بھی کیا جاتا تھا کہ اس وقت چاند کس مقام کے مطلع میں نمودار ہو رہا ہے کیونکہ چاند تو ہر وقت کسی نہ کسی مقام کے مطلع میں موجود رہتا ہے نظر آئے یا نہ آئے یہ دوسری بات ہے۔ اگر ان آلات اور رصد گاہوں کے ذریعہ تلاش ہلال کا حکم دیدیا جاتا تو کچھ مستبعد بات نہ ہوتی، مگر سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا حکم نہیں دیا بلکہ صاف صاف فرما دیا گیا کہ جب تک تم لوگ چاند نہ دیکھ لو روزہ نہ رکھو، اسی طرح روزہ شروع کرنے کے بعد جب تک چاند نہ دیکھ لو روزہ ختم نہ کرو بلکہ اگر تم پر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے مخفی رہ جائے تو تیس دن کے تعداد مہینہ کی ابتدائے صوم میں بھی اور انتہائے صوم میں بھی بلکہ ہر مہینہ کے تعداد ایسے حالات میں تیس دن کی پوری کر لو۔ نیز مدینہ واطراف مدینہ میں پہاڑیاں بھی موجود تھیں ان پر لوگ چڑھتے بھی تھے اور یہ بھی یقین تھا کہ اوپر کی فضا صاف ہوتی ہے اگر اس پر چڑھ کر چاند تلاش کرنے کا حکم دیدیا جائے تو لوگ عمل بھی کر لیں گے اور یہ بھی اطمینان تھا کہ اگر پہاڑ پر چڑھ کر چاند دیکھنے کا حکم دیدیا جائے تو لوگ پہاڑ سے اوپر اڑ کر نہ جا سکیں گے کہ غلو کرنے یا افراط و تفریط کرنے کا اندیشہ یا خطرہ ہو۔ پھر بھی پہاڑ پر چڑھ کر چاند دیکھنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ بالکل سادا

طریقہ پر جیسے عام انسان عام طور سے چاند دیکھتے ہیں چاند دیکھنے کا اور تلاش کرنے کا حکم دینے پر قناعت فرمائی گئی۔ یہی نہیں بلکہ علمی و سائنسی موشگافیوں اور حسابی دقیقہ سنجیوں کے احتمال سے بھی اعراض فرمایا گیا اور ...... نحن امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب کا فرمان ناطق فرما دیا گیا، یہ سب چیزیں اسی بات کا پتہ دیتی ہیں کہ نہ دوربیں استعمال کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہوائی جہاز میں اڑ کر تلاش کرنے کی حاجت ہے بلکہ ان سب طریقوں کو لازم کرنا یا اہمیت دینا شرع و شارع علیہ السلام کا مطلوب نہیں ہے اور حکم شرع بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ شکل حکم شرع بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو اس پر شرعی حکم محول و دائر نہ کیا جائے گا اور نہ ہی اس کا اہتمام ہی کیا جائے گا، البتہ اگر خبر دینے والے یا شاہدین ہوائی جہاز سے دیکھ کر طریقہ موجب کے ساتھ جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے خبر یا شہادت دیدیں گے تو حسب ضابطہ شرعی اعتبار کر لیا جائے گا اور اس طرح وہ خبر یا شہادت بھی معتبر و مقبول ہو سکتی ہے۔

(۴) (الف) اگر اعلان بایں الفاظ ہو کہ فلاں رویت ہلال کمیٹی چاند کے شرعی ثبوت مل جانے کے بعد یہ اعلان کر رہی ہے یا اپنے انتظام سے کرا رہی ہے کہ رویت شرعاً ثابت ہو چکی ہے، صبح سے (مثلاً) روزے رکھے جائیں یا صبح نماز عید ادا کی جائے اور یہ کمیٹی جانی پہچانی اور معتبر ہو، اور اس کے سب ارکان باشرع ہوں تو یہ اعلان مقبول ہوگا اور اس پر عمل کرنا واجب ہو جائیگا۔

اسی طرح معتمد و معتبر ہلال کمیٹی کے موجود نہ ہونے کی صورت میں یہی اعلان اگر قاضی شہر یا اس کے قائم مقام کی جانب سے ہو تو وہ بھی مقبول اور واجب العمل ہوگا۔

(ب) انھیں شرائط مذکورہ (الف) کے ساتھ دوسرے مقامات سے آنے والا اعلان بھی واجب العمل ہوگا صرف ایک قید ملحوظ ہوگی کہ اس اعلان پر عمل کرنے کی وجہ سے مہینہ ۲۸/ دن کا نہ ہورہا ہو۔ اگر ۲۸/ دن کا ہورہا ہوگا تو عمل کرنا جائز نہ رہے گا۔

(ج) ٹیلیفون کی اطلاع کو چونکہ بہت سے آدمی بیک وقت نہیں سن سکتے اس لئے اس کے ذریعہ اطلاع میں اعلان کی شان نہ ہوگی بلکہ یہ اطلاع محض خبر کے درجہ کی چیز ہوسکے گی خواہ ڈائرکٹ ڈائلنگ کے ذریعہ سے ہو یا کسی اور طریقہ سے ہو کیونکہ اعلان کے مفہوم و ماہیئت میں یہ داخل ہے کہ اس کو بیک وقت بہت سے لوگ سنیں، اور اس اطلاع کے مقبول ہونے کی شرط یہ بھی ہوگی کہ ٹیلیفون میں بولنے والا شخص جانا پہچانا اور معتبر و ثقہ شخص ہو، اور اس کی آواز بھی خوب اچھی طرح پہچانی جارہی ہو، اس میں کسی قسم کا اشتباہ یا خلط نہ ہو، اور وہ یہ کہے کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے یا مجھ سے فلاں شخص نے (اور وہ بھی خوب جانا پہچانا اور معتبر و ثقہ شخص ہو) اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے اور مجھے خبر کرنے کے لئے کہا ہے جب یہ اطلاع ان لفظوں میں ہوگی اور وہاں قاضی شرع یا اس کا قائم مقام (رویت ہلال کمیٹی وغیرہ) نہ ہوگا تو رمضان و عید کے چاند کے اعتبار سے اور مطلع صاف و ناصاف ہونے کے اعتبار سے جو شرائط و قیود سوال ۱ کے جواب میں گذر چکی ہے انھیں شرائط و قیود کے ساتھ مقبول و نامقبول ہوگی۔

(د) ظاہر ہے کہ تار میں تار دینے والے کے الفاظ یا اس کی بعینہٖ نقل نہیں آتی بلکہ ٹیلیگراف مشین (ایک آلہ) کی آواز (کھنکھناہٹ) کے اصطلاحی اشاروں کی محض ترجمانی آتی ہے اور وہ بھی بالواسطہ یا بالوسائط، اس لئے تار کی اطلاع

کو نہ تو اعلان کہہ سکتے ہیں اور نہ خبر شرعی کا درجہ دے سکتے ہیں اور یہ سب امور ظاہر ہے اس لئے محض تار کے ذریعہ ثبوت رویت کا حکم نہیں دیا جا سکتا البتہ تقویت و تائید یا تصویب و تصدیق کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

(۵) خط کا حکم یہ ہے کہ اگر خط لکھنے والے نے دو معتبر و ثقہ مسلمانوں کے سامنے خط لکھ کر ان دونوں کو اس پر شاہد بنا کر خط کے ہمراہ بھیجا ہے اور یہ دونوں خط لانے والے خط لا کر شہادت دیں کہ کاتب نے ہمارے سامنے یہ خط لکھا ہے تو یہ خط معتبر و حجت بنے گا۔ پس اگر یہ خط لکھنے والا قاضی شرع یا اس کا قائم مقام (جیسے رویت ہلال کمیٹی) وغیرہ ہے اور اس خط میں ثبوت رویت کی اطلاع لکھی ہے تو اس خط پر عمل کرنا واجب ہو جائے گا۔

اور اگر قاضی شرع یا اس کے قائم مقام نے نہیں لکھا ہے بلکہ کسی تیسرے شخص نے لکھا ہے اور اس میں اپنے چاند دیکھنے کی خبر دی ہے تو یہ خط خبر کے درجہ میں ہوگا اور رمضان و عیدین کے چاند کے اعتبار سے اور مطلع صاف و ناصاف ہونے کے اعتبار سے جو شرائط و قیود تفصیل سے سوال (۱) کے جواب میں درج ہیں اس کے مطابق مفید ہو سکے گا اور اگر شاہد بنا کر نہیں بھیجا ہے تو "الخط یشبہ الخط" کی وجہ سے مفید و معتبر نہ ہوگا۔ ہاں اگر مختلف مقامات سے مختلف آدمیوں کے خط رویت ہلال کے ثبوت کے اتنی تعداد میں آجائیں کہ انکار کی گنجائش نہ رہے تو اس صورت میں اس کا بھی اعتبار ہو جائے گا اور وہ مفید رویت بن جائے گا۔

(۵) ہاں اتفاق ہے۔ البتہ رویت ہلال کی ہر شرعی کمیٹی میں سب ارکان کا باشرع ہونا ضروری ہے اور جہاں تک ہو سکے ہر کمیٹی میں دو ایک ایسے رکن کا انتخاب کرنا انسب ہوگا جو کتاب و سنت اور فقہ سے اچھی واقفیت رکھتے ہوں۔

(۶) چونکہ ہلال رمضان و عیدین کا مسئلہ دین و دیانت اور عبادات سے تعلق

رکھتا ہے، اس لئے اس معاملہ میں مسائل پر غور و بحث اور اجتماعی فیصلہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ اہل سنت و جماعت کے علماء خاص طور پر ایسے علماء جو مذاہب اربعہ کے فقہ پر عبور رکھتے ہوں، ان کی رہنمائی حاصل کی جائے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین

دار العلوم دیوبند ۲۵/۱۲/۹۳ھ

لندن وغیرہ جہاں کا افق ہمیشہ ناصاف رہتا ہے وہاں ثبوت رمضان کا شرعی طریقہ

سوال (۵۰) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرح متین صورت مسئولہ کہ:-

یہاں برطانیہ میں فضا بالدوام ابر آلود رہتی ہے اس لئے کبھی بھی رویت وشہادت ہلال کا امکان ہی نہیں رہتا اس وجہ سے ابتدائے رمضان وعیدین کے تعین میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جب رویت وشہادت ممکن ہی نہیں تو ریڈیو کی اطلاع کا اعتبار ناگزیر ہے اس وجہ سے ایسے لوگ اطلاع ریڈیو پر رمضان وعیدین کا تعین کرتے ہیں۔ شرع مطہرہ نے رویت وشہادت کے جو قوانین وضع کئے ہیں، اس کے معیار پر ریڈیو کی اطلاع رویت ہلال یقیناً غیر معتبر ہے لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ اگر ریڈیو کی اطلاع کا اعتبار نہیں کرتے تو سال کے تمام مہینوں کے پورے تیس تیس دن ہوں گے اور اس طرح برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کا اسلامی سال تین سو ساٹھ دنوں کا ہوگا جو ہندوپاک کے اسلامی سال سے جو عموماً تین سو چون دنوں کا ہوتا ہے چھ دن زیادہ ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہندوپاک میں رمضان کے چھ دن گذر جائیں گے تب یہاں رمضان شروع ہوگا، اسی طرح عیدین میں چھ دنوں کا فرق پڑے گا اور یہ فرق بڑھ کر پانچ سال میں ایک مہینہ کا ہو جائے گا، یعنی جب ہندوپاک میں شوال کا

مہینہ شروع ہو تو یہاں برطانیہ میں رمضان کی آمد ہو، اسی طرح یہ فرق ہر سال میں بڑھتا ہی چلا جائے گا، پھر اطلاع ریڈیو کو بالضرورۃ جائز سمجھنے والے قصر صلوٰۃ وافطار فی السفر احکام معذور امامت و درس قرآن پہ اجرت لینا وغیرہم کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ عند الضرورۃ احکام میں تخفیف شرع مطہرہ کا مزاج ہے، اور یہاں ریڈیو کی اطلاع پر جواز بھی عند الضرورۃ ہے ورنہ شدید اختلاف کا ڈر جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، پھر ایک دلیل ان کی یہ بھی ہے کہ ریڈیو کی خبر کو نامعتبر سمجھنے کا قیاس اس امر پر مبنی ہے کہ زمانہ سلف میں رویت وشہادت کے علاوہ تمام ذرائع میں کذب کا امکان تھا لیکن فی زماننا یہ بات نہایت واضح ہے کہ ریڈیو کی اطلاع میں کذب کا امکان اس معنی میں نہیں کہ بولنے والے کی آواز یقیناً اس ملک سے ہے جہاں سے وہ بول رہا ہے اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ جہاں سے اطلاع مل رہی ہے وہاں ہلال کی چھان بین کمیٹی یا شہر قاضی نے بمطابق احکام شرع کر لی ہے اور اس بات کو نشر کرتا ہے نہ کہ اپنے طرف سے خبر دیتا ہے پس ریڈیو کی اطلاع رویت پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، پس اس تمہید کے پیش نظر حسب ذیل سوالات کے جوابات دے کر ممنون فرمائیں۔

(۱) جس ملک میں فضا ہمیشہ ابر آلود رہتی ہو اور رویت شہادت کا امکان ہی نہ ہو وہاں اثبات ہلال کی کیا صورت ہوگی (الف) کیا اس صورت میں سال کے تمام مہینے تیس دن کے شمار ہوں گے یا صرف شعبان و رمضان و ذیقعدہ کو تیس دنوں کا قرار دے کر بقیہ مہینوں کو اپنی حالت پہ چھوڑ دیں گے۔

(۲) ریڈیو کی اطلاع رویت ہلال پہ اعتماد نہ کرنے کی صورت میں مشرقی ممالک و برطانیہ کے درمیان پانچ سال میں ایک مہینہ کا فرق ہو جاتا ہے تو کیا اس کو

شرعی ضرورت سمجھ کر صرف برطانیہ کے مسلمانوں کے لئے ریڈیو کی اطلاع رویت ہلال کو معتبر سمجھنا درست ہے یا نہیں۔؟

(ب) شرع مطہرہ نے سفر میں قصر صلوٰۃ افطار صوم معذور کے لئے طہارت کے احکام میں تخفیف کی اجازت دی ہے اور زمانہ کی ضرورت کے پیش نظر امامت و درس قرآن پر اجرت لینے کو درست لکھا ہے تو کیا رویت ہلال کے مسئلہ میں بھی ضرورت کے پیش نظر برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کو تخفیف دے کر ریڈیو کی اطلاع کو معتبر سمجھنے کی اجازت ہوسکتی ہے کہ نہیں۔

(۳) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جب متعدد ممالک کا ریڈیو رویت ہلال کی خبر نشر کرے تو یہ خبر مستفیض کے حکم میں ہے، کیا ان کا یہ کہنا شرعاً درست ہے، اگر اطلاع ریڈیو خبر مستفیض کے حکم میں ہے تو کم از کم اور زیادہ سے زیادہ کتنے ممالک کے ریڈیو کی اطلاع درکار ہے۔

امید ہے کہ مندرجہ بالا سوالات کے جوابات بہت جلد دے کر یہاں کے مسلمانوں کو شدید اختلاف سے بچالیں گے۔ یہاں یہ مسائل ہر سال سختی سے زیر بحث آتے ہیں، یہاں تک کہ اخبار میں علماء پر بھی کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔ جواب کے لئے ۲۵ پنس کا پوسٹل آرڈر ارسال خدمت ہے۔ فقط

الجواب:- مذکورہ حالات بیشک پریشان کن ہیں اور بمقتضائے المشقۃ تجلب التیسیر مقتضی تیسیر ہے اس لئے اس کا حکم مندرجہ ذیل ہوگا۔

(۱) جب کسی ریڈیو کے بارے میں یہ علم و یقین حاصل ہو جائے کہ وہ ثبوت شرعی کے بعد ہی رویت کا اعلان کرتا ہے تو اس اعلان پر عمل کرلینا درست رہے گا بشرطیکہ اس پر عمل کرنے سے مہینہ اٹھائیس دن یا اکتیس دن کا نہ ہوتا ہو جیسا کہ دہلی میں کل ہند رویت ہلال کمیٹی قائم ہے اور کمیٹی جو فیصلہ شرعی اصول کے مطابق

کرتی ہے اس فیصلہ کو اسی کمیٹی کے الفاظ میں آل انڈیا ریڈیو اپنی خاص خبروں میں نشر کرتا ہے، اس کی مزید توضیح وتصدیق جناب مولانا قاضی سجاد حسین صاحب شیخ الحدیث وصدر المدرسین مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی سے حاصل ہوسکتی ہے جناب مولانا موصوف اس کل ہند رویت ہلال کمیٹی کے کنوینر ہیں، پس اگر اس ریڈیو کا اعلان پہنچ جاتا ہو یا اسی قسم کا کوئی اعلان کے کسی خطہ سے پہنچ جاتا ہو اور اس پر عمل کرنے سے مہینہ اٹھائیس یا اکتیس دن کا نہ ہوتا ہو تو بے تکلف اس کے مطابق عمل کرلیا جائے۔

۲۔ اور اگر ایسا علم ویقین حاصل نہ ہو لیکن ظن غالب حاصل ہوجائے کہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کرنے کے بعد ہی یہ اعلان ہوا ہے تو اس پر بھی عمل کرلینا درست ہوگا خواہ دنیا کے کسی خطہ سے آئے بشرطیکہ اس پر عمل کرنے سے مہینہ اٹھائیس یا اکتیس دن کا نہ ہو رہا ہو۔

۳۔ اور اگر صحت کا یہ ظن غالب بھی حاصل نہ ہوتا ہو، لیکن مختلف اطراف وممالک سے ثبوت رویت کی اطلاع اتنی تعداد میں آجائے کہ اتنی تعداد میں عادتاً کذب پر اتفاق نہیں ہوتا تو استفاضہ کی صورت بن کر اس کے مطابق بھی عمل کرلینا بھی درست ہے۔

نوٹ:۔ ان سب صورتوں میں عوام کے علم ویقین یا ظن غالب یا استفاضہ قرار دینے کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ مقامی رویت ہلال کی شرعی کمیٹی کے فیصلہ وظن غالب کا اعتبار ہوگا۔ اور اگر مقامی شرعی رویت ہلال کمیٹی نہ ہوگی تو وہاں کے خطیب جامع مسجد وعیدگاہ کا اور وہاں کے معتمد علماء کا فیصلہ جب ظن غالب کے حصول کا یا استفاضہ کے حصول کا ہوگا تو وہ معتبر ہوگا۔

۴۔ اگر ان مذکورہ صورتوں میں کوئی صورت میسر نہ ہو یا فقہ حنفی کے اصول

یہ پوری نہ اترتی ہو اور پریشانیاں وہی ہوں جو سوال میں مذکور بھی ہیں تو ایسی صورت میں یہ کرنا چاہئے کہ اگر اس خطہ میں شافعی یا حنبلی یا مالکی لوگ بستے ہوں تو جو ان کے معتمد مفتی کا فتویٰ ہو اس پر خود بھی عمل کریں بشرطیکہ اس پر عمل کرنے سے مہینہ اٹھائیس یا اکتیس دن کا نہ ہوتا ہو، اور اس صورت میں بھی عوام خود رائی نہ کریں بلکہ علماء احناف سے اس کے بارے میں فتویٰ حاصل کریں۔

۵ اور اگر یہ صورت بھی میسر نہ ہو، یعنی شافعی، حنبلی، مالکی یہ لوگ بھی نہ بستے ہوں یا بستے ہوں مگر مذکورہ معتمد فتویٰ موجود نہ ہو یا ان کے فتاویٰ آپس میں متضاد ہوں تو پھر علماء احناف ہی ان کے معتمد فتاویٰ حاصل کریں یا ان کی فقہ کی معتمد کتابوں سے رجوع کر کے اس مجبوری کی صورت میں ان کا معتمد مسلک تلاش کر کے اس کے مطابق عمل کریں، اتنی گفتگو سے آپ کے سوال کی ہر شق کا جواب ہو گیا۔ اور (۱،۲) کے ضمن (ج) کے بارے میں عرض ہے کہ یہ کہنا کہ اب ریڈیو کی اطلاع میں کذب کا امکان نہیں رہا صحیح نہیں، امکان کیا وقوع بھی ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ حکومت کی خاص اطلاعات جس کو حکومت اپنے خاص اہتمام سے نشر کرتی ہے اس میں اس کا احتمال کم ہوتا ہے اور جو اطلاعات عام خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے ان میں اس کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ پھر ریڈیو کے ذریعہ اعلان کرنے میں اور اس کے ذریعہ خبر دینے میں ان دونوں میں بھی فرق ہے، اعلان تو یہ ہے کہ مثلاً فلاں قاضی یا فلاں شرعی ہلال کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ شرعی ثبوت سے رویت ہلال ثابت ہو گیا، کل سے روزے رکھے جائیں یا کل نماز عید ادا کی جائے اور اس جواب میں اعلان سے اسی قسم کا اعلان مراد ہے اور خبر مثلاً یہ ہے کہ فلاں نے چاند دیکھا یا فلاں سے فلاں شخص نے اپنا چاند دیکھنا بیان کیا اور جو اطلاعات اس درجہ کے بھی نہ ہوں مثلاً اس طرح ہو کر

فلاں جگہ عید ہے یا فلاں جگہ چاند دیکھا گیا تو یہ اطلاع شرعاً نہ معتبر اعلان ہے اور نہ معتبر خبر، اور اگر مزید تفصیل دیکھنا مطلوب ہو تو ماہنامہ البلاغ بمبئی میں ۱۳۸۱ھ کے کسی پرچہ میں ریڈیو و ٹیلیفون وغیرہ کی اطلاع کا شرعی حکم کے نام سے ایک مفصل مضمون شائع ہو چکا ہے، اس کو ملاحظہ فرمالیں، انھیں وجوہ کے وجہ سے یہ اطلاع نہ تو معتبر اور نہ ہر اطلاع بالکل غیر معتبر بلکہ اس میں تفصیل ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین

۳۰/۱/۹۳ھ

شرکت کی ایک خاص صورت کا حکم

سوال (۵۱) کیا حکم ہے شریعت مطہرہ کا دریں صورت میں۔

(۱) کہ زید مقروض نے محمد عمر سے یہ کہا کہ تمہارا میرے ذمہ دو ہزار روپے باقی ہیں۔ میرے پاس مبلغ صرف پانچ سو روپے ہیں اگر تم دو ہزار پورے روپئے کا دستاویز وصولیابی لکھ کر دیدو تو میں تمہیں پانچسو روپے دیدوں، تو کیا محمد عمر کا واقعہ کے خلاف دستاویز جملہ بقائے کی وصولیابی کا لکھ کر محض پانچ سو روپئے لینا درست ہے! جب کہ محمد عمر خود بھی پریشان ہے اور نہ لکھنے پر پانچسو روپئے بھی ضیاع ہیں۔

(۲) جن مدارس کا الحاق گورنمنٹ سے ہیں وہاں کے شیخ الحدیث حضرات بکثرت ایسے طلبہ کو جو دوسرے مدارس تعلیم پاتے ہیں ان کا فارم امتحان سرکاری ان طلبہ کی منظوری پر خود بھر بھرا کر یا ان طلبہ کے والد یا سرپرست کے ذریعہ بھر بھرا کر اپنے یہاں سے واقعہ کے خلاف اس فارم کی تصدیق کر کے گورنمنٹ میں امتحانات کے لئے بھیجدیتے ہیں تو کیا ان حضرات کے لئے ایسے فارموں

کی تصدیق درست ہے؟ جب کہ ایسا کرنے پر طلبہ کے عمر کے لحاظ سے کافی نقصان ہو جائے گا۔

ٰ۳ مدرسین کی تنخواہیں مدارس میں طے رہتی ہیں، اس کے باوجود گورنمنٹ سے بھی کچھ امدادی رقوم ان مدرسین کو مدرسہ کے ذریعہ ملا کرتی ہے تو کیا ایسے مدرسین کو زکوٰۃ کی رقم سے حیلہ شرعی کر کے تنخواہ لینا درست ہے، جبکہ گورنمنٹ سے بھی ضرورت پوری ہو جایا کرتی ہے۔

الجواب:- ۱ محمد عمر مالک ہے چاہے تو بالکل معاف کر دے یا کچھ نہ معاف کرے یا اپنی پریشانی کا اور پانچ سو روپئے کے نقصان کا موازنہ کر کے جو آہون ہو اس کو اختیار کرے، البتہ اگر دل سے معاف نہ کرے گا اور کہدے گا کہ میں محض پانچ سو کے ضیاع کے خطرہ سے یہ بھرپائی لکھ رہا ہوں۔ تو بقیہ عند اللہ معاف نہ ہوگا، اور اس صورت میں زید آخرت میں بقیہ کا دیندار ہوگا

۲ - امتحان تو پرائیوٹ بھی ہوتا ہے پس اگر محض پرائیوٹ امتحان کے فارم کی تصدیق کرتا ہے تو یہ صحیح ہے۔ البتہ اگر یہ لکھتا ہو کہ یہ لڑکا ہمارے یہاں داخل ہو کر باقاعدہ پڑھتا ہے حالانکہ داخل نہ ہو تو یہ کذب صریح ہوگا اور ناجائز ہوگا۔

۳ تنخواہ کا معاملہ اجرت کا ہے جو اہل مدرسہ کے ذمہ واجب الاداء ہے قطع نظر اس سے کہ اس کی ضروریات اس میں پوری ہوتی ہیں یا نہیں؟۔ اور حکومت یہ سمجھتے ہوئے امداد دیتی ہے کہ اسکو مستقل تنخواہ ملتی ہے اور دونوں دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ لہذا حکومت کے اس دینے سے اہل مدرسہ کے ذمہ جو وجوب ہے وہ ساقط نہ ہوگا، جب تک کہ اہل مدرسہ مدرس سے یہ معاملہ نہ کرلیں کہ جس کو حکومت کی یہ امداد ملے گی اس کو ہم یہ سابق تنخواہ نہ دیں گے بلکہ کم کر کے محض اتنی دیں گے اور مدرس اس کو منظور بھی کرے۔ کیونکہ

صحت اجارہ میں رضاء طرفین ضروری ہے اور علم دین کا باقی رکھنا اور اس کا انتظام واجب ہے اور اس وجوب کی بنیاد پر اجرت وتنخواہ کے معاملہ کا جواز اور اجرت کے ادائیگی کا وجوب متفرع ہے، پس اگر اہل مدرسہ کے پاس ایسی رقوم نہ ہوں جن سے اجرت وتنخواہ دی جاسکتی ہو اور بغیر اس کے بقائے تعلیم دین متعذر ہو قطع نظر اس سے کہ حکومت کچھ امداد دیتی ہے یا نہیں۔ حیلہ تملیک کرکے بھی ادائیگی تنخواہ درست رہے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

مشینی ذبیحہ کا حکم

سوال (۵۲) ۱۔ ببمبئی کے اندر میونسپلٹی نے ذبیحہ خانہ توڑکر دوسری جگہ منتقل کردیا ہے، جہاں پر میونسپلٹی نے الکٹرک مشین وغیرہ فٹ کی ہے۔ اور جانوروں کو بھی مشین کے ذریعہ ذبیحہ کرنے کی ہدایت کی ہے، طریقہ یہ ہے کہ پہلے جانوروں کو بجلی کے ذریعہ جھٹکا دیا جاتا ہے، جس سے جانور بے ہوش ہوجاتے ہیں، بعد میں مشین چلادی جاتی ہے، اس طریقہ کار کو مسلمان انجام دیتے ہیں یا پھر غیر مسلم، دونوں صورتوں میں ایسے ذبیحہ کا گوشت کھانا کہاں تک مناسب ہے تحریر فرمائیں، جب کہ بہت سے مسلمان گوشت کھانے سے پرہیز کررہے ہیں۔

۲۔ اسمگلنگ اور بلیک مارکٹنگ، جس کو چوری کا دھندہ کہا جاتا ہے عام طور سے آج کل لوگ کررہے ہیں، یہ اور بات ہے کہ گورنمنٹ کا عملہ بھی شامل رہتا ہے جس کے اندر مسلمان بھی بڑی گرم جوشی سے کام کررہے ہیں، بلکہ اچھے اچھے دیندار، نمازی اور پرہیزگار بھی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ دریافت کرنے پر کہتے ہیں کہ یہ حکومت کا قصور کی ہے، ہمارے ساتھ انصاف نہیں ہے رزق کے معاملہ میں بھی ہمارے ساتھ انصاف نہیں ہے، اس لئے ایسا کرکے روزی

کمانا اور پیٹ بھرنا کوئی جرم نہیں ہے اور نہ خلاف شریعت ہے، اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔

الجواب:- ۱؎ مشینی ذبیحہ سے متعلق ایک مدلل مضمون بصورت جواب استفتاء احقر کی جانب سے تقریباً دو سال پہلے ماہنامہ رسالہ دارالعلوم میں شائع ہو چکا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر مشین کا بٹن دبانے والا مسلمان ہو اور بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر بٹن دبائے، اور بٹن دبانے سے چھری گردن پہ چل پڑے، اسی طرح گردن پہ چھری چلتے وقت جانور کو کنٹرول کرنے والا بھی مسلمان ہو، اور بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر کنٹرول کرے، پھر اسی طرح چھری سے گردن کی چار رگوں میں سے اکثر رگ کٹ کر پورا خون نکل جائے تو ذبیحہ حلال رہے گا، مگر یہ طریقہ خلاف سنت ہونے کی وجہ سے مکروہ رہے گا۔ اور اگر ان پانچ شرطوں میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو گئی تو ذبیحہ حلال نہ رہے گا ماہنامہ دارالعلوم ملاحظہ فرمالیا جائے۔ اگر اپنی تحقیق سے مطلع فرمایا جائے تو کرم ہوگا۔ حضرت مولانا میرک شاہ صاحب نے لاہور سے تیسرے سال اس موضوع پہ ایک مستقل کتابچہ شائع کیا ہے۔ اس میں مخالف و موافق ہر دو قسم کے فقہی و حدیثی مآخذ کا اچھا استقصا کیا ہے، اسی طرح امداد الفتاویٰ میں بھی مشینی ذبح پر اچھا کلام ہے۔

۲؎ یہ بات تو ظاہر و مسلم ہے کہ ہر انسان کو شرعاً اختیار ہے کہ اپنی مملوک شئ کی بیع و شراء حسب قاعدہ شرع جس قیمت پر اور جس وقت چاہے کرے، البتہ حکومت کو بھی یہ اختیار ہوتا ہے کہ مصالح صحیحہ کے ماتحت درآمد پر پابندی یا قیمتوں میں تحدید (تسعیر) کر سکتی ہے اور اس کی نظیر شریعت میں احتکار و تسعیر موجود ہے کہ قوم و عوام کو پریشانیوں سے مثلاً بچانے کے لئے یہ حق حکومت کو

حاصل ہے اور چونکہ اختیار معلل ہے مصالح صحیحہ کی علت سے۔ پس جو پابندی مصالح صحیحہ کے ماتحت و مطابق ہوگی وہ جائز ہوگی، اور اس کے خلاف کرنا ناجائز ہوگا۔ اور جو پابندی مصالح صحیحہ کے ماتحت نہ ہوگی وہ خود ناجائز و ظلم ہوگی۔ اور اس کا خلاف کرنا شرعاً ناجائز اور عنداللہ گناہ نہ ہوگا، اور چونکہ یہ اختیار حکومت شرعاً وقتی اور معلل بعلۃ ہوتا ہے۔ اور منصوص بنص شرع نہیں ہے بلکہ امور مجتہدہ میں سے ہے اور مختلف فیہ ہے، بلکہ بعض نصوص تو اس کے خلاف کا پتہ دیتے ہیں۔ جیسے عن انس قال الناس یا رسول اللہ غلا السعر مسعر لنا فقال ان اللہ ھو المسعر القابض الباسط الرازق (الی قولہ) اسنادہ علی شرط مسلم وصححہ ابن حبان والترمذی (رد المحتار ص ۳۵۲ ج ۵)۔

پس یہ تجزیہ بھی اس حکم میں لازم ہوگا کہ بہت ممکن ہے کہ کلی و عمومی طور پہ کوئی پابندی مصالح صحیحہ کے ماتحت و مطابق ہو مگر ضمنی و جزئی طور پہ مقام و اشخاص کے اختلاف سے اس مقام و شخص کے لئے مصالح صحیحہ کے ماتحت و مطابق نہ ہو، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ حکومتی سطح پر کوئی پابندی مصالح صحیحہ کے مطابق ہونے کی وجہ سے قانون بنجائے، اور قانون بنانا بھی صحیح ہو، لیکن عوامی سطح پر اور عمل کے دائرے میں مصالح صحیحہ کے ماتحت و مطابق نہ رہے اور رفع پریشانی کا ذریعہ نہ بنے بلکہ باعث پریشانی یا باعث ازدیاد پریشانی ہو جائے، ایسی صورت میں بوجہ منصوص بنص شرعی ہونے کے مدار حکم منقح ہو کر دیانت عامل پر ٹھہرے گا، اور ہر پابندی کو مطلقاً نہ تو ناجائز کہہ سکتے ہیں اور نہ جائز ہی کہہ سکتے ہیں، البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو پابندی واقعۃً مصالح صحیحہ کے مطابق و ماتحت ہوگی۔ ان کی پابندی شرعاً بھی لازم و واجب ہوگی اور خلاف کرنا ناجائز و گناہ ہوگا ورنہ شرعاً ناجائز و گناہ نہ ہوگا، مگر چونکہ اس پابندی کا خلاف کرنا شرعاً واجب نہیں

ہے، اور قانون حکومت کی خلاف ورزی میں عزت آبرو، جان، مال سب کا خطرہ ہوگا، اور اس کی حفاظت واجب ہے، اس لئے اجازت نہ دیجائے گی،

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

۱۰/۹/۹۳ھ

جن مقامات میں عشاء کا وقت نہیں ملتا، وہاں نماز پڑھنے کا طریقہ

سوال (۵۲) مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں علماء دین وشرع متین کیا فرماتے ہیں بینوا وتوجروا۔

(الف) دنیا میں بعض مقامات ایسے ہیں کہ وہاں پر بعض موسموں میں ۲۲ر ۲۳ر گھنٹہ کا دن ہوتا ہے، ایک طرف سورج غروب ہوا کہ دوسری طرف سے ایک گھنٹہ ½ ۱ گھنٹہ کے بعد دن ہوجاتا ہے، وہاں پر مغرب تو پڑھ سکتے ہیں عشاء کا وقت نہیں ہوتا، اور فجر پڑھیں گے یا نہیں؟

نیز وہاں پر ظہر وعصر دن کے کونسے حصے میں پڑھیں گے۔ نارتھ شمال میں سیوڈن ناروے اور دوسرے جزیرے ہیں، وہاں پر ایک مسلمان بھائی خود گیا تھا اور اس نے خود وہاں پر دیکھا ہے، نیز وہاں پر ترک مسلمانوں کی مسجد ہے اور وہ لوگ نماز پڑھتے ہیں مگر نہ معلوم کونسے وقت میں۔

(ب) نیز سردیوں میں رات ہوتی ہے ایک دو گھنٹہ کے لئے سورج طلوع ہوجاتا ہے اور غروب ہوجاتا ہے وہاں پر پانچوں نمازیں کس وقت پڑھیں گے۔

(ت) نیز اس سے اوپر شمال میں سائبیریا ایک جزیرہ ہے وہاں پر لوگوں کی آبادی ہے ۶ر مہینہ دن ہی دن اور اس کے بعد ۶ر مہینہ رات ہی رات

ہوتی ہے، وہاں پر نماز کس طرح پڑھیں گے۔

الجواب:- (الف) اگرچہ دن ۲۲/۲۳/گھنٹہ کا ہوتا ہے مگر جب آفتاب کا طلوع، غروب روز ہوتا ہے تو غروب ہوتے ہی مغرب کی نماز پڑھ لیں اور طلوع ہونے سے کچھ پہلے فجر کی نماز پڑھ لیں۔ درمیان میں اگرچہ عشاء کا وقت نظر نہیں آتا، لیکن مغرب و فجر کے درمیان جب موقع ہو عشاء کی نماز بھی بلا لحاظ جمع بین الصلوٰتین پڑھ لینا ضروری ہے۔ اگرچہ وقت کی تنگی و قلت سے سنن و نوافل کا موقع و وقت نہ ملے مگر فرض، وتر پڑھ لینا چاہیے، مفتی بہ قول میں ایسا نہیں ہے کہ عشاء کی نماز ساقط ہو جائے!

(ب) اسی طرح سردیوں میں بھی جب تک آفتاب روزانہ طلوع و غروب ہوتا ہے اگرچہ گھنٹہ دو گھنٹہ ہی کے لئے تو طلوع و غروب کی پوری مقدار کے نصف ثانی کے شروع ہوتے ہی ظہر پڑھ لیں اور غروب ہونے سے کچھ قبل عصر پڑھ لیں، سنن ظہر کا وقت نہ ملے جب بھی فرض ضرور پڑھ لیا کریں اسی قدر کے یہ لوگ مکلف ہیں، اس سے پورے عاید شمار ہوں گے اور ثواب کے مستحق ہوں گے۔

(ت) جہاں مسلسل کئی کئی دن یا کئی کئی ہفتہ یا ماہ آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ یا طلوع نہیں ہوتا وہاں بھی ۲۴/گھنٹہ کا ایک دورہ یومی ولیلی (دن رات کا ایک چکر) متعین کر کے اس کے اجزاء میں پانچوں نمازیں ادا کریں گے اور نمازوں کے درمیان فصل و فاصلہ کا وہی تناسب رکھیں گے جو یہاں متعدل ایام کے ملکوں میں ہوتا ہے یا پھر وہ تفصیل ملحوظ رکھیں گے جو ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں درج ہے۔ ماہنامہ دارالعلوم ہمراہ مرسل ہے۔ تفصیل اس میں دیکھ لیں اور ۲۴/گھنٹہ کا ایک دورہ یومی ولیلی (دن رات کا مجموعہ) معلوم کرنے کے لئے

اس کی ابتدا، کب سے اور کس طرح کریں تو اس کا آسان اور سہل طریقہ یہی ہے کہ جس دن آفتاب غروب ہوکر طلوع نہ ہونا شروع ہو جائے بلکہ مسلسل غروب ہی رہے اس دن کے غروب سے ۲۴ گھنٹہ تک مقدار کو پورے ایک دن ایک رات کی مقدار شمار کر کے اس میں حسب تصریح بالا پانچوں نمازیں ادا کریں۔ اور پھر اس ۲۴ گھنٹہ کے ختم ہونے پر دوسرا ۲۴ گھنٹہ پھر تیسرا ۲۴ گھنٹہ مقرر کرتے جائیں اور ان سب میں مثل اول ۲۴ گھنٹہ کے نصف اول رات قرار دے کر اس میں رات کی نمازیں اور نصف ثانی کو دن قرار دے کر دن کی نمازیں پڑھتے چلے جائیں اور دن بڑا ہوتے ہی جس دن آفتاب طلوع ہوکر مسلسل طلوع رہے غروب نہ ہو تو اس میں پہلا دورہ مکمل کرنے کے لئے صرف ۱۲ گھنٹہ کی مقدار پر ایک دورہ یومی ولیلی مکمل قرار دیدیں اور اس بارہ گھنٹہ میں صرف دن کی نمازیں ادا کریں، اس بارہ گھنٹہ کا دورہ ختم ہونے کے بعد پھر ۲۴، ۲۴ گھنٹہ کی مقدار کا دورہ یومی ولیلی (دن رات کا مجموعہ) مقرر کرتے جائیں اور اس کے نصف اول میں رات کی نمازیں (مغرب وعشاء وفجر) پڑھتے جائیں اور نصف ثانی میں دن کی نمازیں (ظہر وعصر) پڑھتے جائیں۔

فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

(یو۔ پی۔ ہند۔ ایشیاء)

الجواب صحیح
محمود غفرلہ

الجواب صحیح
سید احمد علی سعید
دارالعلوم دیوبند

یورپ میں عیسائیوں یہودیوں کے برتنوں کے استعمال کا حکم

سوال (۵۳) علمائے کرام، مفتیان کرام مندرجہ ذیل کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔

یورپ میں عام طور پر عیسائی و یہودی لوگ بستے ہیں۔ جگہ جگہ ہوٹل، کافی ہاؤس، چاپ خانہ اور شراب خانے بنے ہوئے ہیں۔ ہندو پاک افریقہ وغیرہ سے کافی تعداد میں مسلمان گذشتہ دس برس میں یہاں آکر آباد ہوئے ہیں اور اسی قوم سے واسطہ رہتا ہے، خنزیر کے گوشت اور شراب کا عام رواج ہے، اور اس سے مسلمان اپنی حفاظت کرتا ہے مگر ہوٹلوں اسٹرانٹ میں عیسائیوں، یہودیوں کے برتنوں و چمچہ چھری کانٹے پیالے پلیٹ گلاس وغیرہ برتنوں سے احتیاط کرنا اور بچنا عام طور پر مشکل و محال نظر آتا ہے، کوئی ایک مسلمان کسی ایک شہر میں پہنچا جہاں پر مسلمانوں کا کوئی ہوٹل نہیں ہے بڑے بڑے راستوں پر ریلوں میں ہوائی جہازوں میں مسلمانوں کیلئے کوئی الگ نظام نہیں ہے (حرام کھانے سے پرہیز کرتا ہے) سبزی و بزی پھل وغیرہ حلال چیزیں کھاتا ہے چائے کافی وغیرہ پیتا ہے مگر برتن ان لوگوں کے استعمال کئے ہوئے ہیں اگرچہ ڈھلے ہوئے صاف ستھرے ہوتے ہیں تو کیا؟ مذکورہ صورت میں مسلمانوں کے لئے برتن کا استعمال جائز ہوگا یا نہیں۔ عموم غلبہ ہے ان کے برتنوں کا استعمال عام طور پر مسلمانوں کو اس سے بچنا بہت مشکل ہے آج کل کے حالات میں رواج ہے۔

الجواب:۔ اگر حالات کے ماتحت یہ یقین ہو کہ یہ چمچہ د کانٹا د برتن وغیرہ خنزیر و شراب میں استعمال نہیں ہوئے ہیں یا ہوئے ہیں مگر بالجملہ دھو کر پھر ان سبزیوں وغیرہ میں استعمال ہوتے ہیں اور دستر خوان پر لائے جاتے ہیں تو ان سے سبزیوں کا کھانا اور برتنوں وغیرہ کا استعمال کرنا درست ہے بالخصوص مذکورہ مجبوریوں کی صورت میں ورنہ بغیر اضطرار کے گنجائش نہ ہوگی اور احتیاط

بہر حال عمدہ چیز ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند (ہند) (ایشیار)

الجواب صحیح
محمود عفرلہ

الجواب صحیح
سید احمد علی سعید
دار العلوم دیوبند

واپسی کی شرط سے بیع کا حکم

سوال (۵۴) کیا فرماتے ہیں اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک شخص ایک مکان فروخت کیا ہزار روپیہ میں ایک وقت تعین کر کے مثلاً چار سال میں روپیہ دیدوں گا اس وقت مکان واپس لے لوں گا۔ پھر صاحب مکان اسی مکان میں ٹھہرتے ہیں کرایہ دے کر لیکن یہ روپیہ کے حساب سے کرایہ دیتا ہے نہ کہ مکان کے حساب سے کرایہ دیتا ہے۔ مثلاً مکان کی قیمت ہے دس ہزار روپیہ، اس نے فروخت کیا ایک ہزار روپیہ میں، تو کرایہ ایک ہزار روپیہ کی حساب سے دیتا ہے۔ اس قسم کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں۔ جواب دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرما دیں

الجواب:- اس شرط کے ساتھ خرید و فروخت فاسد ہے، حدیث میں ہے نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن بیعہ و شرط ھکذا فی الھدایہ ج ۳۔ ایسی بیع حکم میں رہن کے ہوتی ہے کما فی الشامی ج ۴ ص ۲۴۶ وحکمہ حکم الرھن وھو الصحیح ۱۲ لہذا یہ کرایہ لینا دینا اور اس سے مشتری کا انتفاع سب ناجائز ہے، اس معاملہ کا استرداد کر کے جائز طریقہ سے معاملہ کرنا دونوں فریق بائع و مشتری پر لازم ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ ۲۲/۲/۹۲ھ

پڑوسی کے بعض حقوق کا بیان، چور بازاری اور بعض سودی کاروبار کا حکم

سوال (۵۴) مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں علمائے دین مفتیان شرع متین کیا فرماتے ہیں۔ ہر چیز پر نظر رکھ کر مفصل جواب سے نوازیں، عین کرم ہوگا۔

۱۔ ایک شخص کے گھر کا پانی باپ دادا کے زمانے سے اپنے بغل والے پڑوسی کے گھر سے ہو کر نکلتا ہے۔ یعنی قدیم زمانے سے اس کے گھر کی نالی پڑوسی کے گھر سے ہو کر سڑک پر نکلتی ہے۔ موجودہ صورت میں اب پڑوسی کو اس پر کچھ اعتراض ہے اور وہ اصرار کرتا ہے کہ آپ نالی کا رخ پھیر لیجئے۔ نالی کے رخ پھیرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے گھر سے ایک نئی نالی نکالیے۔ اس صورت میں ظاہر بات ہے کافی خرچہ بیٹھے گا۔

(الف) سوال طلب امر یہ ہے کہ نالی کا رخ پھیرنے میں جو خرچہ بیٹھے گا شرعاً پڑوسی پر بھی کچھ واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ یعنی اس خرچے میں دونوں نصف نصف شریک ہوں گے یا نہیں۔

(ب) عرف رواج عام میں تو یہ ہے کہ آدھے آدھے کا کچھ رقم کے دونوں ذمہ دار ٹھہرتے ہیں۔ یہ آدھا خرچے برچے لینا کیسا ہے؟ آیا جائز ہے یا شرعاً کوئی قباحت ہے مفصل تحریر فرمائیے۔

۲۔ عام طور سے شہروں میں تمام بازاروں کے ساتھ ایک چور بازار بھی ہوتا ہے جہاں عموماً تمام چیزیں چوری ہی کی رہتی ہیں، یہ جانتے ہوئے وہاں کی چیزیں خریدنا کیسا ہے؟ اس میں کوئی شرعی قباحت ہے یا نہیں؟

(ب) نٹ کی لکڑیاں خریدنا کیسا ہے جب کہ ان کا یہی پیشہ ہے کہ دوسروں کے باغات سے لکڑیاں کاٹ لاتے ہیں اور بیچتے ہیں۔

۳۔ کاروباری سلسلے میں کبھی کبھی مجبوراً بغیر قصد کے سود دینا ہی پڑ جاتا ہے

مثلاً ایک گانٹھ مال خریدا اور ایک ہفتے یا ایک مہینے کا ڈیو (وقت) لیا مشتری کا خیال ہوتا ہے کہ میں رقم وقت پر چکا دوں گا، لیکن کبھی بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہیں چکا پاتا۔ ادھر مہاجن کا اصول یہ ہے کہ ڈیو پورا ہونے کے بعد اگر رقم اس کے ہاتھ میں نہیں آتی تو فٹ سے سود کے دس بیس روپے بڑھا دیتا ہے۔ جس کو مجبوراً دینا ہی پڑتا ہے۔ اس صورت میں کیا کرنا چاہئے آیا سود دینے کی گنجائش اس کے لئے ہے یا نہیں۔ تفصیل جواب سے آگاہ فرما دیں۔

الجواب:- (۱) جب قدیم زمانہ سے اسی طرح چلا آرہا ہے تو ظاہر یہی ہے کہ کسی صحیح معاہدہ یا بنیاد پر قائم ہے، ایسی صورت میں دوسرا پڑوسی مجبور نہیں کر سکتا ہے۔ فی الذخیرۃ عن ابی اللیث سیل سطوحہ الی دار رجل ولہ فیھا میزاب قدیم فلیس لہ منعہ (الی قولہ) والفتوی علی ماذکرہ ابو اللیث ثم.... (الی قولہ) ان القدیم یترک علی قدمہ (شامی ص ۲۸۵/۵ فصل فی الشرب)

ہاں آپس کی مصالحت سے فریقین نصف نصف خرچے جس طرح کا معاملہ آپس میں کرلیں جائز اور بہتر ہے۔

۲ (الف) جس چیز کے بارے میں ظن غالب یہ ہو جائے کہ یہ یقیناً چوری کی ہے اس کو نہ خریدنا چاہئے۔

(ب) نٹ کے بارے میں یہ احتمال غالب ہے کہ مالکان باغ نے اس بات کی اس کو چھوٹ دے رکھی ہو، اس لئے ان سے خریدنے میں گنجائش ہے، ہاں یہ ہے کہ اگر دلیل شرعی سے چوری کی ہونا معلوم ہو جائے تو خریدنا جائز نہ ہوگا۔

۳ ۔ حتی المقدور وقت مقررہ (ڈیو) کے اندر ادا کرے اور مجبوری کی صورت دوسری ہے اس میں گنجائش ہو سکتی ہے۔ فقط کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

حج بدل کرنے والے کے بعض خصوصی احکام **سوال (۵۵)** :- علمائے دین وشرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔

حج بدل میں ایک آدمی جاتا ہے۔ اس کو کونسا احرام باندھنا چاہیے، قران تمتع، افراد، اگر افراد کا باندھا تو وہ عمرہ کرے گا یا نہیں، حج سے پہلے اور وہ اپنے لئے عمرہ حج سے پہلے اور بعد میں کرسکتا ہے یا نہیں ؟

(ب) ایک آدمی اپنا حج فرض ادا کرنے جاتا ہے، ایام حج میں متمتع کا احرام باندھا ہے حج سے پہلے وہ نفلی عمرہ کرسکتا ہے یا نہیں ؟

(ت) آج کل بہت سے حاجی ہوائی جہاز میں حج کرنے جاتے ہیں یا سفر کرتے ہیں اپنے کاروبار کے لئے یا اپنے وطن کو جاتے ہیں دوسرے ملکوں سے وہ ہوائی جہاز میں نماز کس طریقہ سے ادا کریں گے جماعت بھی نہیں کرسکتے ہیں قبلہ کا رخ بھی برابر نہیں ہوتا، اگر قبلہ کا رخ برابر ہو اور وہ اپنی سیٹ پر نماز ادا کرکے رکوع، سجدہ اشارہ سے ادا کرے تو اس کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں ؟ اتفاقاً کسی کونے میں کوئی جگہ مل گئی اور نماز کھڑے ہوکر باقاعدہ پڑھ لی تو صحیح ہوگی یا نہیں ؟ کیا اس صورت میں نماز زمین پر اتر کر پھر سے پڑھنی پڑے گی ؟ ہوائی جہاز میں نماز پڑھنا صحیح ہے یا نہیں۔

(ج) حالات حاضرہ کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ آج کل لوگ چاند پر اتر کر رہنے کی باتیں کرتے ہیں تو کیا یہ ممکن ہے۔ بفرض محال آدمی چاند پر سکونت اختیار کرے تو کیا وہاں پر نماز پڑھنا صحیح ہوگا، اور کس طرف رخ کرکے نماز پڑھیں گے۔

الجواب :- نمبر الف، حج افراد کا احرام باندھنا چاہیے اور اگر آمر نے اجازت دی ہو تو قرآن کا احرام بھی باندھ سکتے ہیں، لیکن دم قران خود اپنی

طرف سے ادا کرنا ہوگا اور حج افراد کا احرام باندھنے کی صورت میں حج سے قبل عمرہ نہ کرے، حج سے فراغت کے بعد اپنے لئے اور آمر کے لئے دونوں کے لئے کرسکتا ہے لیکن زائد خرچے خود برداشت کرنا ہوگا۔

(ب) اشہر حج (شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ) سے قبل قبل جتنا عمرہ چاہے کرسکتا ہے مگر اشہر حج ہونے کے بعد صرف ایک عمرہ تمتع والا کرسکتا ہے زائد نہیں

(ج) اگر جگہ مل جائے جماعت بھی کرسکتے ہیں ورنہ تنہا تنہا پڑھ لیں قضا نہ کریں، قبلہ نما رکھ کر سمت قبلہ معلوم کرسکتے ہیں ورنہ تحری کر کے سمت قبلہ متعین کرلیں، اگر تحری میں غلطی بھی کھاجائیں گے مگر تحری کر کے سمت قبلہ متعین کریں گے تو نماز ادا ہوجائے گی ا‌ینما تولوا فثم وجہ اللہ الآیۃ پر پورا عمل ہوجائے گا۔ سیٹ سے علیحدہ ہوکر کسی خالی جگہ میں قیام ورکوع وسجدہ کے ساتھ ادا کریں تو نماز صحیح ادا ہوجائے گی اور اگر خالی جگہ ایسی نہ ملے کہ رکوع وسجدہ کے ساتھ پڑھی جائے تو سیٹ ہی پر بیٹھے بیٹھے اشارہ سے رکوع سجدہ کر کے پڑھ لیں، پھر زمین پر اتر کر فرض کا اعادہ کرلیں!!۔

چاند کیا زہرہ، مریخ وغیرہ پر جانا رہنا ممکن ہے اس میں کوئی شرعًا مانع نہیں ہے اور وہاں نماز پڑھنا بھی صحیح ہوگا بلکہ وہاں بھی نماز پڑھنے کا حکم اور وجوب اسی طرح باقی رہے گا اور نماز قبلہ رخ ہی پڑھنا ہوگا۔ قبلہ نما رکھ کر یا کسی اور ذریعہ سے ورنہ تحری کر کے قبلہ متعین کریں گے اور جس طرح یہاں نماز فرض ہے اسی طرح وہاں بھی فرض رہے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ۔ دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح — محمود عفرلہ

الاجوبۃ صحیحۃ — سید احمد علی سعید

ترقیاتی منصوبوں میں شرکت کا حکم

سوال (۵۶) ہندوستان اور جنوبی افریقہ میں رہنے والے مسلمانوں کے حالات میں یہ فرق ضرور ہے کہ ہندوستان کے مسلمان یہاں کے مستقل باشندے ہیں، سیکڑوں سال تک یہاں حکمراں رہے۔ اب اگرچہ حکمراں نہیں ہیں، مگر قانون اور دستور ہند نیز حقیقت واقعہ کے لحاظ سے وہ ملک کے حصہ دار ہیں اور ان کو وہی شہری حقوق حاصل ہیں جو دوسرے فرقوں کو حاصل ہیں۔ یہاں ان کے اوقاف ہیں ان کے مدرسے ہیں، عبادت گاہیں ہیں وغیرہ وغیرہ!

لیکن اس بارے میں ہندوستان اور جنوبی افریقہ دونوں مشترک ہیں کہ ایسا اقتدار جس کے ذریعے مسلمان کوئی قانون تنہا اپنی رائے اور صوابدید اور اپنے مذہبی رجحانات کے بموجب بنا سکیں اور اس کو نافذ کرسکیں، نہ افریقہ کے مسلمانوں کو حاصل ہے اور نہ ہندوستان کے مسلمانوں کو،

مالی اور اقتصادی لحاظ سے وہ ایسے نظام میں جکڑبند ہیں جس کی بنیاد اگرچہ سود پر نہیں ہے مگر اس کا پھیلاؤ اور اس کی تمام ترقی سود پر موقوف ہے ممکن ہے مسلمان سود لینے سے احتیاط کرنے میں کامیاب ہو جائیں مگر وہ سود ادا کرنے سے محفوظ نہیں رہ سکتے، کیونکہ جو مختلف ٹیکس ادا کرنے پڑتے ہیں وہ اس لئے مقرر کیے گئے ہیں کہ ان قرضوں کا سود ادا کیا جا سکے جو ترقیاتی منصوبوں وغیرہ کے سلسلے میں لئے گئے ہیں۔

جن مسلمانوں پر کوئی ٹیکس لازم نہیں ہوتا ان کو بھی سود کی ادائیگی میں شرکت کرنی پڑتی ہے کیونکہ وہ گرانی ان کو لامحالہ برداشت کرنی پڑتی ہے جو ٹیکسوں کے اضافہ کے باعث کردی جاتی ہے۔

فقہی نقطۂ نظر سے ایک ضرر اس کو لامحالہ برداشت کرنا پڑتا ہے، انفرادی

کاروبار کی اگرچہ ممانعت نہیں ہے لیکن حالات ایسے ہیں کہ ترقی کے امکانات انفرادی کاروبار میں ختم ہوتے جارہے ہیں۔ ترقیات کے منصوبے جو ہر طرح کے کاروبار حتیٰ کہ زراعت پر بھی حاوی کئے جارہے ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ تمام کاروبار اجتماعی نوعیت اختیار کریں، یعنی سوسائٹیاں اور کمیٹیاں قائم کی جائیں اور ان کے ذریعے کام کیا جائے جن کا نمونہ افریقہ اور یورپ کے ممالک ہیں اس وقت پایا جارہا ہے حکومت اس طریقہ کار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، چنانچہ ان سوسائٹیوں کو قرض دیا جاتا ہے جس کا سود ان کو ادا کرنا پڑتا ہے

اضافہ آبادی، بود و باش کے سلسلے میں بھی مشکلات پیدا کررہی ہے اپنے ذاتی مکانات تنگ ہوتے جارہے ہیں، دوسری جانب نہ صرف یہ کہ کرایہ بڑھ رہا ہے بلکہ "پگڑی" کی وبا نے غیر معمولی مشکلات پیدا کردی ہیں، اس طرح رہائش کا مسئلہ بھی بہت پیچیدہ ہوگیا ہے۔ حکومت اس پیچیدگی کو اس طرح ختم کررہی ہے کہ تعمیر مکان کے سلسلہ میں قرض دیتی ہے مگر سود اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔ بینوا و توجروا انشاء اللہ تعالیٰ۔ فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

۱۔ ترقیاتی منصوبوں کے سلسلے میں اگر مسلمان سوسائٹی قائم کریں یا کسی قائم شدہ سوسائٹی میں شرکت کریں تو کیا ان کے لئے جائز ہوگا کہ برادران وطن کی طرح وہ بھی حکومت سے سود کی شرط پر قرض لیں۔

۲۔ اور کیا یہ جائز ہوگا کہ اپنے انفرادی کام مثلاً کارخانہ یا باغ یا کاشت کو ترقی دینے کے لئے یا مکان کی تعمیر کے لئے حکومت سے سود کی شرط پر قرض لیں۔

۳۔ کیا حکومت کے علاوہ غیر مسلم افراد سے بھی مسلمان سود پر قرض لے سکتے ہیں یا سود پر قرض دے سکتے ہیں۔

۴۔ کیا ہندوستان میں یہ سودی معاملہ خود مسلمانوں کا آپس میں بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمان مسلمان کو سود پر قرض دے یا قرض لے۔

۵۔ بینک کا پورا نظام سود کی بنیاد پر ہوتا ہے، بینک میں اپنا حساب رکھنا سودی کاروبار میں شرکت ورنہ تعاون ضرور ہے، لیکن کاروبار میں عام طور پر بینک واسطہ بنتا ہے۔ مثلاً مطالبات کی ادائیگی بینک کے چیک کے ذریعہ ہوتی ہے، اور بہت سے سرکاری غیر سرکاری اداروں میں ملازمین کی تنخواہیں چیک کے ذریعہ ادا کی جاتی ہیں، کیا ان ضرورتوں کے پیش نظر مسلمانوں کے لئے جائز ہوگا کہ وہ بینک میں اپنا حساب رکھیں۔

چالو (کرنٹ) حساب کے علاوہ ایک شکل ڈیپازٹ کی ہوتی ہے کہ خاص مدت کے لئے اپنی رقم بینک میں جمع کرا دیتے ہیں، ان رقم پر سود بھی ملتا ہے اگر ایک ہزار روپیہ جمع ہے تو سال بھر میں پچاس روپے سود کے ہو جائیں گے اور رقم بجائے ہزار کے ایک ہزار پچاس روپے ہو جائے گی۔

کیا مسلمانوں کے لئے جائز ہے کہ اس طرح رقم ڈیپازٹ کرا کر اس کا سود لیں اگر اجازت دی جاتی ہے تو کیا یہ پچاس روپیہ جو سود کے لئے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لئے حلال وطیب ہیں، ان کو وہ اپنے خرچ میں لا سکتا ہے۔

۷۔ بیمہ کرانے کا رواج بھی عام ہو گیا ہے، اپنی مملوکہ چیز کا بھی بیمہ کرایا جاتا ہے۔ اور زندگی کا بھی بیمہ کراتے ہیں۔ بعض صورتیں ایسی ہیں کہ سرکاری قانون ان میں بیمہ کو لازمی قرار دیتا ہے۔ چنانچہ موٹر گاڑی بلا بیمہ کرائے نہیں رکھ سکتے ہیں۔ بیمہ کرائی ہوئی چیز اگر کسی حادثہ میں تباہ اور ہلاک ہو جائے تو

بیمہ کمپنی ذمہ دار ہوتی ہے کہ اس کی قیمت ادا کرے۔ موجودہ حالات میں جب کہ املاک کے لئے ہر وقت خطرہ رہتا ہے کیا مسلمان اپنی دکان، کارخانہ یا کسی اور چیز کا بیمہ کرا سکتے ہیں، کیا ان خطرات کی بنا پر مسلمان کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی زندگی کا بیمہ کرا دے کہ رقم بیمہ اس کے وارثوں کے کام آئے۔ بینوا

شکی اللہ سعیکم

الجواب:- ۱ ترقیاتی منصوبوں میں مسلمانوں کو بھی شریک ہونا چاہیئے، اور اپنی سوسائٹیاں اس طرح پر قائم کرنا چاہیئے کہ اس میں سود اور سودی لین دین سے حفاظت رہے۔ مثلاً شرکت اور مضاربت کے اصول پر قائم کریں اور قوانین اس طرح وضع کریں جو حدود شرع میں رہیں۔ قانون کے جس موڑ پر شرعی حیثیت سے شبہ ہو معاملہ فہم مفتیوں اور علماء سے رجوع کر کے اصلاح کر لیا کریں۔

اسی طرح قائم شدہ سوسائٹیوں میں بھی شرکت کر سکتے ہیں۔ بڑی بڑی کمپنیوں اور فیکٹریوں میں جس طرح شیرز (حصہ) خرید کر شرکت درست ہوتی ہے، اسی طرح یہاں بھی درست ہو سکتی ہے۔ ہر عقد شرکت کی صحت کے لئے تمام شرکاء کا مسلمان ہونا بھی شرط نہیں ہے۔ بلکہ بعض عقد شرکت میں صرف معاملہ صاف وجائز ہونا شرط ہے، جیسے شرکت عنان اور شرکتیں عموماً اسی قبیل کی ہوتی ہیں،

۲ - حکومت سے کارخانہ قائم کرنے یا باغ لگانے یا کاشت وغیرہ کرنے یا درست رکھنے کے لئے حکومت سے جو اعانتیں لیجاتی ہیں یا جو قرض وغیرہ لئے جاتے ہیں۔ ان کی کچھ نوعیت اس طرح ہوتی ہے کہ ان سب کا سود یا سودی لین دین ہونا لازم نہیں بلکہ بعض صورتیں غیر سودی اور بعض معاملے امدادی اور محض از قبیل اعانت بھی شمار ہو سکتے ہیں اس کے ہر لین دین کو سودی یا سود

کے شرط پر قرض لینا یا سودی معاملہ ہونا نہیں کہہ سکتے بلکہ بعض صورتیں بالکل جائز ہوں گی اور بعض ناجائز اور سودی بھی ہوں گی۔ توضیح کے لئے بعض صورتیں ذرا تفصیل سے بیان کردی جاتی ہیں۔ مثلاً

(الف) اگر محض نقد روپیہ بطور قرض کے لیا جائے اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے یا سامان وغیرہ کے ساتھ ہی نقد بھی لیا جائے۔ مگر نقد کی یہ مقدار سامانوں سے کام چلانے کی مقدار سے بہت زیادہ اور فاضل ہو اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے، اور واپسی کی کل رقم کل رقم یا قیمتی سے زائد ہو جائے تو سود کی تعریف (هو فضل خال عن العوض لاحد المتعاقدين في عقود المعاوضة) صادق آجائے گی اور چونکہ معاملہ نقدین میں اور خالص مبادلہ اور عوض معاوضہ کا ہوگا، اس لئے وہ نفع کم ہو یا زیادہ سود ہی کا ہوگا اور (کل قرض جر نفعا فهو ربوا) بھی صادق آجائے گا اور حتی المقدور اس کے قریب بھی جانا جائز نہ ہوگا، اور مجبوری کا حکم دوسرا ہوگا جو اس جزئیہ (یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح الاشباہ والنظائر ص۱۱۵) سے معلوم ہوتا ہے، اس قاعدہ کے ماتحت احتیاج شدیدہ کی حالت میں فقہائے امت سودی قرض کو بھی بقدر ضرورت لینے کی اجازت دیدیتے ہیں۔

(ب) جو نقد رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لیجاتی ہے اس میں تاویل چل سکے گی اور اس کو کام چلانے کے لئے اعانت میں داخل کر کے اس معاملہ کو غیر سودی معاملہ ہونے کا حکم لگائیں گے اور اس زائد رقم کو سود نہ کہیں گے۔ بلکہ انتظامات کی درستگی کے لئے ایک قسم کی فیس میں داخل کیا جاسکے گا اور اس صورت میں یہ معاملہ جائز رہے گا۔

(ج) کسی نے پروجیکٹ (محکمہ ترقیات کا ایک شعبہ) سے مثلاً چار ہزار روپے کنوں کھودوانے یا مکان بنانے یا کسی اور صنعت وحرفت کے لئے نقد روپے لئے اور محکمۂ پروجیکٹ نے اس میں سے اپنے قاعدہ کے تحت مثلاً ایک ہزار روپے بالکل معاف کردیئے اور فقط تین ہزار رقم رکھ کر دوسال کا موقع دیا اور پھر دوسال بعد سے چھوٹی اور لمبی قسطوں میں ادائیگی کے لئے متعین کیا اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کرکے وصول کیا مگر کل رقم وصولی کی چار ہزار (کل رقم قرضہ) سے زائد نہ ہوئی تو ان قسطوں میں اصل پر جو زیادتی محکمہ نے وصول کیا وہ سود نہ ہوگا اور یہ معاملہ بھی جائز رہے گا چونکہ مجموعہ قرض چار ہزار تھا اور چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا اس لئے سود کی تعریف (فضل خالی عن العوض او یا کل قرض جر نفعا او) صادق نہ آئے گی۔

(۳ و ۴) سود کا ایک شرعی مفہوم ہے اور اسی مفہوم کے اعتبار سے سود کی حرمت منصوص ہے اور بغیر قید کسی ملک و مذہب و بغیر قید کسی زمانہ یا افراد زمانے کے مطلقاً منصوص ہے، اور اس کے مرتکب پر درکنار اس میں کسی حیثیت سے شرکت کرنے والے اور معاونین پر بھی طرح طرح کی وعیدیں و لعنتیں وارد ہیں، اس لئے وہ مفہوم شرعی ربوا (سود) کا جس رقم پر صادق آجائے گا اور جس معاملہ پر سودی معاملہ ہونا صادق آجائے گا وہ چیز یا معاملہ خواہ ہندوستان میں ہو یا کسی اور ملک میں ہو، مسلمان کے ساتھ ہو یا غیر مسلموں کے ساتھ ہو سب حرام و ناجائز رہے گا اور اس کا لینا دینا کچھ بھی درست نہیں رہے گا۔

(۵) بینک کا ابتدائی دور ایسا ضرور تھا کہ اس کا پورا کاروبار محض سود ہی پر ہوتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہے اس کے اصول و مقاصد میں اور طریقہ کار

میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں۔ اب تو بہت سے بینکوں میں مختلف نوع کے مستقل کاروبار تجارتی اصول پر ہونے لگے ہیں، بہت سے بینک شرکت اور مضاربت کے اصول پر چلنے لگے ہیں جیسا کہ خود سوال کے بعض جملوں سے دیگر کاروبار میں عام طور سے بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے، پس جن کاروبار میں مطالبات کی ادائیگی بینک کے چک کے ذریعے ہوتی ہے یا جن ملازموں کی تنخواہیں بینک کے چک کے ذریعہ بر برآمد ہوتی ہیں اس میں اگر بینک اپنے لئے بھی کوئی رقم وصول کرے تو اس کا سود ہونا ہی ضروری نہ ہوگا بلکہ وہ بینک کا محنتانہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ بینک اجیر یا وکیل یا درمیانی واسطہ قرار دے کر اس رقم کو بینک کی اجرت یا عوض کارکردگی بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے اب ہر بینک کا ایک ہی حکم باقی نہیں رہے گا بلکہ ہر بینک کے اصول وضوابط وطریقہ کار وہ معاملات کے اعتبار ولحاظ سے الگ الگ حکم رہے گا اور پھر جب بینک کے علاوہ دیگر ذرائع سے سرمایہ کی حفاظت دشوار یا پریشان کن ہو تو بوجہ احتیاج ومجبوری تو اس مسلمہ سودی بینک میں جو ابتدائی دور میں تھے رقوم کے محفوظ رکھنے کا جواز محققین علماء وفقہاء آج سے بہت پہلے بتلا چکے ہیں، تو اب ان بینکوں میں جن میں محض سودی کاروبار ہونا متیقن نہیں ہے محفوظ رکھنے کی بدرجہ اولیٰ اجازت ہوگی۔

۶۔ چالو (کرنٹ حساب) یا ڈیپازٹ اس فرق سے تو حکم میں کوئی فرق نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو یہ ہوگا کہ جو بینک غیر سودی بینک کاری کے اصول پر کام کرتے ہوں یا شرکت ومضاربت کے اصول پر کاروبار کرتے ہوں ان میں اکاؤنٹ یا سرمایہ رکھنے کو ترجیح ہوگی اور پھر جب تک اس زائد رقم کے بارے میں جو بینک سے سود کے نام پر ملتی ہو، غیر سودی ہونے کا ظن غالب نہ ہو جائے اس کا تصدق

کردینا مسلم غرباء ومساکین پر واجب رہے گا اور خود استعمال کرنا جائز نہ رہے گا جیساکہ اب تک محققین علماء کا یہی فتویٰ تھا، اور ہے۔

۷۔ بیمہ کے اندر قمار اور ربوا ہونے کی وجہ سے تو نفس بیمہ ناجائز وحرام رہے گا، مگر سرکاری قانون کی مجبوری کی وجہ سے یا کاروبار کے یا ملازمت کے بقاء یا معاش ومعیشت کی مجبوری سے یا سوال میں ذکر کردہ خطرہ کے پیشِ نظر فقہاء محققین بیمہ کرالینے کی اجازت دیدیتے ہیں خواہ جان کا بیمہ ہو یا جائداد واملاک کا یا ورثاء کا البتہ بیمہ میں اپنی جمع کردہ رقم سے زائد جو رقم حاصل ہو، اس کو مسلم غرباء ومساکین کو دیدینا ضروری ہے، خود استعمال کرنا جائز نہیں ہے، ہاں اگر اس رقم کے تصدق کرنے سے قبل ہی وہ شخص انتقال کرجائے تو ورثہ میں جو لوگ غریب ومصرف زکوٰۃ ہوں گے وہ اس زائد رقم کو بھی استعمال کرسکیں گے اور جو زائد رقم بیمہ کرانے والے کو اس کی زندگی میں حاصل نہ ہو بلکہ اس کے انتقال کے بعد حکومت اپنے قانون کے تحت ازخود دے رہی ہو اس کو جمع کردہ اصل کی طرح تمام ورثہ بلالحاظ غریب وغیر غریب سب استعمال کرسکتے ہیں۔ فقط

واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند

۷ ۹۱/۸ ھ

محکمۂ اقتصادیات سے مدد لینے کی بعض صورتوں کا حکم شرعی

سوال (۵۷) کیا فرماتے ہیں علمائے دین، مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ:۔

حکومت ہٰذا نے عوام کی بے روزگاری دور کرنے ان کی بحالی اور ترقی کے لئے ایک محکمہ قائم کیا ہے جس کے ذریعے سے صنعتی کارخانہ قائم کرنے والوں

کو صنعت و حرفت اختیار کرنے والوں کو یا جو سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی صنعت و حرفت کو فروغ دینے اور چلانے سے عاجز رہتے ہیں، اور ان لوگوں کو جن کے پاس مکان نہیں مکان بنانے کے لئے ۔ اور کھیتی کرنے والوں کو کھیتی میں ترقی کرنے کے لئے نقد روپیہ دیتی ہے، اور بہت کم شرح کے ساتھ کچھ زیادہ کر کے واپس لیتی ہے، اور واپسی کی مدت بھی بہت لمبی دیتی ہے اور زائد رقم سے اس محکمہ کا نظم درست رکھتی ہے۔ اور جو رقم اس محکمہ کے خرچ سے بچ جاتی ہے اس کو پھر اس قسم کے کاموں میں خرچ کرتی ہے، حکومت کا مقصد اس سے اپنی تجارت یا سرمایہ داری نہیں ہوتا ہے، محض قوم کی بھلائی اور ترقی مقصود ہوتی ہے ۔ کبھی نقد روپیہ کے ساتھ یا بغیر نقد روپیہ کے محض سامان تجارت و حرفت اور آلات زراعت بھی سرکاری نرخ پر بازاری نرخ سے بہت ارزاں ادھار دیتی ہے، جیسے فیکٹریوں کے لئے مشین اور دیگر سامان یا انجن یا ٹریکٹر، کھاد، بیج اور آبپاشی کیلئے ٹیوب ویل اور دیگر سامان تجارت و صنعت اور اس کی قیمت مختلف قسطوں پر وصول کرتی ہے بلکہ بعض بعض لوگوں کو کچھ روپیہ یا سامان مشینری وغیرہ مفت دیتی ہے اور کچھ مذکورہ بالا رعایت و تفصیل کے ساتھ دیتی ہے اس مفت دینے اور لینے کے لئے کچھ قاعدے اور ضابطے مقرر ہیں، اسی قاعدہ میں جو لوگ مستحق ہوتے ہیں صرف ان کو دیتی ہے اور اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے کچھ انسپکٹران (اور ماہرین فن) ماہرین صنعت و حرفت بھی مقرر ہوتے ہیں، جو لوگوں کو طریقۂ استعمال بتاتے ہیں مفید مشوروں کے ذریعہ ہدایت و رہبری بھی وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ اور بسا اوقات اپنی نگرانی میں ان سامانوں کا استعمال بھی کراتے ہیں تاکہ سامان ضائع نہ ہو تاکہ لوگوں کو اس کا ہنر بھی اچھی طرح آجائے ۔ اور مقررہ قسطوں کے

وصولی میں آسانی بھی ہو، اور وہ مقررہ قسطوں کی وصولی کیلئے بھی ضابطے مقرر کئے ہیں مثلاً روپیہ یا سامان دیتے وقت کچھ ضمانت لیتی ہے اور وقت پر قسط ادا نہ ہو تو مہلت بھی دیتے ہیں، لیکن کچھ زائد رقم بڑھا کر وصول کرتے ہیں، اس کی بھی ایک حد مقرر ہوتی ہے، اس حد کے گذرنے پر حکومت سختی بھی کرتی ہے، بسا اوقات عدم ادائیگی کی صورت میں ضمانتیں ضبط ہو جاتی ہے سب کارخانے وغیرہ بلکہ اس کے ذاتی مکان وغیرہ ساری ملکیت بھی ضبط و نیلام ہو جاتی ہے، اور بعض مرتبہ جیل خانہ بھی جانا ہوتا ہے۔

۱ - اب دریافت طلب امور یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایسی امداد لینا اور ایسا سامان ادھار خریدنا جس میں یہ سب خطرات بھی ہیں جس میں اپنے لئے زائد روپیہ واپس کرنا ہوتا ہے، یا مقررہ قسط سے زیادہ دینے کا بھی ہر وقت احتمال رہتا ہے، جائز ہے یا نہیں۔

زائد دینا سود تو نہیں ہوگا، بعض علماء اس کو سود اور ناجائز کہتے ہیں اور بعض علماء ٹیکس میں داخل کر کے جائز کہتے ہیں، بعض اس کو امداد باہمی کا ایک طریقہ کہہ کر جائز کہتے ہیں اور بعض اس کو تجارت کا ایک طریقہ کہتے ہیں، اس کو تجارت کا نفع قرار دے کر جائز کہتے ہیں۔ امید کہ مفصل جواب دیکر مطمئن کریں۔

(نوٹ) واضح رہے کہ اگر مسلمان اس قسم کی امداد نہ لے تو بسا اوقات اپنی کھیتی باڑی اور صنعت و حرفت و تجارت کو باقی نہیں رکھ سکتا، اور بہت سے غریب جو بے گھر اور بے روزگار اپنا روزگار قائم نہیں کر سکتے اپنا گھر نہیں بنا سکتے، بے روزگار، بے گھر ہی رہ جائیں گے، اپنے معاش بھی نہ چلا سکیں گے تو کیا جائز ہونے کی شکل میں ان کے لئے کوئی گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں۔

۲ - بعض علماء کے اقرار کے مطابق اگر یہ طریقہ ناجائز ہو اور یہ دینا

سود ہو تو ہندوستان جیسے ملک میں اس میں کچھ فرق ہوگا یا نہیں، اگر ہوگا تو کیا ہوگا۔

(۳) اگر یہی معاملات کسی ایسے ملک میں ہوں جن میں مسلم اکثریت ہو اور اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو تو کیا حکم ہوگا۔ بینوا وتوجروا۔

الجواب:- اس وقت سود یا سودی کاروبار سے متعلق کوئی اور تفصیلی کلام کرنا مقصود نہیں ہے، اس لئے کہ سود اور سودی کاروبار کی حرمت میں آیات قرآنیہ احادیث صحیحہ وصریحہ اس قدر کثرت سے اور اس طرح ترہیبی انداز میں موجود ہیں کہ سود کا شرعی مفہوم صادق آجانے کے بعد اس کے جواز واباحت کی طرف جانے کی جرأت ذرا بھی نہیں ہوسکتی۔

امامنا الاعظم حضرت ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک آیت ربوا پورے قرآن میں زیادہ خوفناک آیت ہے۔ کان ابو حنیفۃ رضی اللہ عنہ یقول ھی (یا ایھا الذین آمنوا لا تاکلوا الربوا اضعافاً مضاعفۃ الآیۃ) اخوف آیۃ القرآن اوعد اللہ المؤمنین بالنار المعدۃ للکافرین ان لم یتقوہ فی اجتناب محارمہ الخ (مدارک ص ۱۴۱ ج ۱)۔

نیز جس وقت سود (ربوا) کی حرمت نازل ہوئی اس وقت مسلمانوں کے حالات آج سے بہت زیادہ سقیم وخطرناک وقابل رحم تھے۔ پھر بھی کسی قسم کی گنجائش یا کسی قسم کا اشارہ اباحت وجواز کی طرف نہیں دیا گیا اس لئے جتنی صورتیں لوگ سود کی وجہ جواز کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی کافی نہیں، اور نہ مبیح ربوا ہوسکتی ہے، لہذا اس رخ کی طرف کلام کی کوئی حاجت نہیں۔ اور اضطرار ومجبوری میں فقہاء رحمہم اللہ کے کلام سے جو کچھ تغیر احکام کا شبہ ہوتا ہے، اس کا حاصل ومقصود سود

وربوا کو مباح وحلال قرار دینا نہیں ہے، بیش از بیش مواخذہ آخرت سے برأت وسبکدوشی وحفاظت ہے، جیساکہ عنقریب احقر کے کلام سے بھی معلوم ہوگا۔

البتہ چونکہ ربوا (سود) کا ایک مفہوم شرعی متعین ومنضبط ہے کسی فرد یا جماعت کے کسی غیر سودی معاملہ کو سود کا نام دیدینے سے اس کو سود کہنا اور اس پر سود کا حکم لگادینا ضروری نہیں ہے، جیسے پرائیویڈنٹ فنڈ وغیرہ کہ رقم میں سود کے نام سے کچھ رقم دینے سے اس کا سود ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح کسی سودی معاملہ کو کسی فرد یا جماعت کے غیر سودی قرار دیدینے سے وہ سود کے حکم سے خارج نہیں ہوجائے گا۔ اس لئے یہ شق کلام کی باقی رہ گئی کہ آیا یہ نوپیدا معاملات جس میں حکومت وقت قرض کے طور پر عوام کو ان کی ترقی وبہبود کے لئے کچھ سامان یا آلات واسباب کھیتی کرنے کے یا آبپاشی کرنے کے۔ یا کسی اور صنعت وحرفت یا کارخانہ چلانے یا بڑھانے کے لئے (جیسے مشین، انجن، ٹریکٹر یا اس کے اور آلات واسباب بیج، کھاد وغیرہ) ادھار سستے سے سستے داموں پر دے کر کے اس کی قیمت وصول کرنے کے لئے مختلف قسطیں مقرر کردیتی ہے اور قسطوں کے معینہ مدت پر وصول نہ ہونے سے اس قسط کو کچھ بڑھاکر وصول کرتی ہے اور کبھی ان سامانوں کے ساتھ ان سے کام لینے کے لئے کچھ نقد روپیہ بھی دیتی ہے اور کبھی ان ہی عوام کی ترقی وبہبود کے لئے محض نقد روپیہ دے کر پھر اس پر کچھ زیادتی کے ساتھ وصول کرتی ہے تو آیا اس پر سود کی شرعی تعریف صادق آتی ہے یا نہیں۔ اور سمجھنا ضروری ہے کہ یہ معاملہ شرعاً ربوی ہے یا اس کی حقیقت شرعیہ کچھ اور یہ ہوسکتی ہے یا ہے۔ اس وقت یہی پیش نظر ہے اور اس کے

متعلق حکم شرعی مختصر لفظوں میں واضح کرنا مقصود ہے۔

سوالنامہ میں تصریح ہے کہ اس قسم کے اعانت کے طریقوں سے افراد اور ملک کی ترقی اور انھیں زوال سے محفوظ رکھنا اور ان کی بعض پریشانی دور کرنا حکومت کا مقصود ہوتا ہے، جیسا کہ بعض مرتبہ بعض حصہ قرض یا بعض حصہ سامان کے مفت چھوڑ دینے سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے، جس کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ ان طریقوں سے نفع خیزی یا زراندوزی یا کوئی سودی کاروبار کرنا حکومتوں کا مقصود نہیں ہوتا ہے۔ اسی بنار پر سود کے نام سے لی ہوئی جزوی رقم اول تو عام رقم سود سے بہت تھوڑی ہوتی ہے، پھر اس سلسلہ کے اخراجات کے پورا کرنے کے بعد جو رقم بچ جاتی ہے تو اسی کو اس قسم کے اعانتی کاموں میں خرچ کر دیا جاتا ہے۔

کما ھو مصرح فی السوال تو مطابق قاعدہ مسلمہ فقہیہ الامور لمقاصد ھا وفیھا بیان ان الشئ الواحد یتصف بالحل والحرمۃ باعتبار ما قصد لہ (قاعدہ مافیہ فی الاشباہ والنظائر) سوالنامہ کی تصریحات کے بموجب اس زائد رقم کو جو قرضہ کے سلسلے میں وصول کی جاتی ہے ٹیکس قرار دینا جیسا کہ بعض لوگوں کی تحریر سے اخذ کیا گیا ہے صحیح نہ ہوگا، کیونکہ ٹیکس محض قرضہ دینے پر نہیں لیا جاتا بلکہ ٹیکس انسان کی آمدنی اور کاروبار میں اس وقت لاگو اور عائد ہوتا ہے جب کہ اس کی معتد بہ مقدار جو حکومت کے قانون میں مصرح ہوتی ہے۔ موجود ہو کر ایک سال بھی گذر چکا ہوتا ہے، یہاں پر ایسا نہیں ہے اور یہ فرق بدیہی ہے، البتہ اس قسم کے معاملات کا احتیاج اور اس کی ضرورتیں چونکہ عام ہوتی جا رہی ہے بلکہ عموم کا ایک درجہ اختیار کر چکی ہیں جیسا کہ سوالنامہ میں پیش کردہ حالات نیز روزمرہ پیش آمدہ واقعات

جو بشکل استفتاء تحریری و زبانی ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں اس لئے ضرورت داعی ہے کہ اگر کوئی توجیہہ و تاویل معاملہ کے حدود شرع میں لانے کی ہوسکتی ہو تو حفظا للعوام تلاش کرنی چاہیئے۔ کما سیجئ استحسانہ

پس اس معاملہ کی توجیہہ یہ کی جاسکتی ہے کہ اس جزوی رقم کو جو سود کے نام سے لی جاتی ہے حقیقت میں وہ سود نہیں ہے بلکہ اس طریقہ کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت میں اور جو سامان وغیرہ اس پر خرچ ہوتے ہیں یا درکار ہوتے ہیں ان کی قیمت میں لی جاتی ہے جس سے انتظام میں سہولت رہتی ہے اور اعانت لینے والوں اور دینے والوں دونوں کا معاملہ صاف رہتا ہے اور یہ محض ایک قومی و مشترکہ نظام کی صورت و نوعیت ہے کوئی سودی کاروبار نہیں ہے بلکہ قوم کا سرمایہ ہے اور قوم ہی کے کام میں صرف کیا جاتا ہے، اس کے منتظمین و کارکنان قوم کے اجیر و وکیل ہوسکتے ہیں اور غریبوں کی اعانت اور پس ماندوں کو آگے بڑھانے اور ان کے لئے اسباب معیشت فراہم کرنے کی راہیں کھولنے کا ایک انتظام کہا جاسکتا ہے، نیز اس طریقہ کار و محکمہ میں نفع و سہولت بھی دونوں جانب کو قریب قریب یکساں حاصل ہوتی ہے۔ سود تو نام ہے اس نفع اور زیادتی کا جو محض ایک جانب کو حاصل ہو، اور عوض سے خالی ہو۔

کما صرح بہ الفقہاء۔ الربوا ھو فضل خال عن العوض لاحد المتعاقدین فی المعاوضۃ ھذا التعریف یستفاد من الشامی من باب الربوا۔

غرض یہ مفہوم سود کے مفہوم سے جدا کہا جاسکتا ہے، اور یہ توجیہہ قریب قریب ایسی ہی ہوگی جو اس رقم میں کی جاتی ہے جس کو حکومت اپنے ملازمین کو

ختم ملازمت کے وقت اگرچہ سود کے نام پر دیتی ہے مگر ہمارے فقہاء محققین اس کو سود نہیں کہتے بلکہ انعام کہتے ہیں اور اس کو جائز فرماتے ہیں کما فی امداد الفتاویٰ ص۱۲۳ تا ۱۲۵۔ اور نیز یہ توجیہ ایسی ہوگی جیسی منی آڈر کے فیس میں کی جاتی ہے فیس اجرت کتابت اور اجرت روانگی فارم کہا جاتا ہے۔ کما قال بہ العلامہ التھانوی فی حاشیۃ الفتاویٰ (ایک طویل سلسلہ کلام میں فرماتے ہیں، البتہ بہت عرق ریزی سے اس قدر تاویل کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ فیس (منی آڈر) کو اجرت کتابت اور روانگی فارم کہا جاوے۔ اس سے اس کی حرمت تفاضل تو رفع ہو جائے گی مگر کراہت سفتجہ باقی رہیگی (امداد الفتاویٰ ص۱۰۶/۳ جدید ایڈیشن مطبوعہ پاکستان)

ایضاً ثم قال فی مقام آخر اور معاملہ پیش نظر میں جب اشکال حرمت تفاضل کا ختم ہو گیا تو اباحت اصلیہ لوٹ آئے گی وھو المراد۔ پھر اسی امداد الفتاویٰ ص۱۰۹/۳ میں فرماتے ہیں۔ البتہ فیس منی آڈر کو اجرت کتابت و روانگی فارم کی کہہ کر حرمت تفاضل کو رفع کیا جا سکتا ہے، لیکن کراہت سفتجہ کے رفع کی کوئی وجہ خیال میں نہیں آتی گو ابتلاء عام کی وجہ سے دل ضرور چاہتا ہے کہ اس کی بھی کوئی وجہ نکل آئے (الیٰ قولہ) حتیٰ کہ اگر یہ بھی نقل صحیح سے مل جائے کہ سفتجہ کے جواز کی طرف ائمہ اربعہ میں سے کوئی امام گئے ہیں تب بھی بضرورت اس پر عمل کرنے کو کہا جائے گا۔ (ثم قال فیہ) ص۱۰۹/۳ منی آڈر مرکب ہے دو معاملوں سے ایک قرض سے جو اصل رقم سے متعلق ہے، دوسرے اجارہ سے جو فارم لکھنے اور روانہ کرنے پر بنام فیس کے دیجاتی ہے اور دونوں معاملے جائز ہیں پس دونوں کا مجموعہ بھی جائز ہے اور چونکہ اس میں ابتلاء عام ہے اس لئے یہ تاویل کر کے جواز کا فتویٰ مناسب ہے (انتھیٰ بلفظہ) امداد الفتاویٰ کی ان مجموعی

عبارتوں سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے معاملات میں جب ابتلاء عام ہو جائے یا ضرورت صحیحہ داعی ہو جائے تو حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے مہما ممکن توجیہ جواز تلاش کرنا امر مستحسن ہے، نیز عالمگیری کتاب الحیل کی عبارت سے ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے۔

کما قال وکل حیلۃ یحتال بھا الرجل یتخلص بھا عن حرام او یتوصل بھا الی حلال۔ فھی حسنۃ والاصل فی جواز ھذا النوع من الحیل قول اللہ عز وجل وخذ بیدک ضغثاً فاضرب بہ ولا تحنث وھذا تعلیم المخرج لایوب النبی علی نبینا وعلیہ السلام (الی قولہ) وعامۃ المشائخ علی ان حکمھا لیس بمنسوخ وھو الصحیح فی المذھب کذا فی الذخیرۃ (الفتاوی العالمگیریہ کتاب الحیل ج ۶)

حاصل یہ ہے کہ اس قسم کے حل و توجیہات کا مدار ابتلاء عام اور ضرورت صحیحہ معتبرہ پر ہے اور سوالنامہ سے بھی ان دونوں چیزوں کا وجود مترشح ضرور ہوتا ہے اس لئے یہ توضیح مستحسن بھی ہو سکتی ہے، خاص کر ایسے ملکوں میں جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو، وہاں یہ توجیح اور بھی آسان ہو گی۔ علی ما فصلت المحققون من الفقہاء بالتفصیل التام۔

چند شبہات اور ان کا ازالہ

پہلا شبہ: ان تاویلات کا معاملات متعلقہ سے کیا تعلق۔ اگر یہ تاویلیں کی گئیں تو منی آڈر وغیرہ معاملات میں کی گئی ہیں اس معاملہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہ بات محض درجہ نظیر میں یہاں پیش ہے کہ بعنوائے آیات یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر الایۃ لا یکلف اللہ

نفسا الا وسعہا الآیۃ اور الدین یسر کے ہمارے فقہاء کرام و مشائخ عظام نے اس قسم کے نو پیدا مسائل میں جس میں عام ابتلاء ہوا ہے حدود شرع میں رہتے ہوئے توسع سے کام لیا ہے اور قوم کو تنگی میں پڑنے سے بچایا ہے اس ذوق کے ماتحت مسئلہ مبحوثہ منہا میں بھی حدود شرع کے اندر رہتے ہوئے توسع تلاش کرنا منشاء شرع و شارع کے خلاف نہ ہوگا۔ فقط اسی استدلال کے پیش نظر بطور نظیر یہ تفصیلی گفتگو کی گئی ہے، ورنہ یہ تمثیل نہیں ہے کہ باعث اشکال یا اعتراض ہو۔

دوسرا شبہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تاویلات و توجیہات ارباب حکومت یا اس شعبہ کے اصحاب حل و عقد کے پیش نظر نہیں اور نہ اس کے مطابق معاملہ کرتے ہیں تو پھر یہ توجیہات و تاویلات کس طرح مؤثر اور مفید ہو سکتی ہے؟

جواب:- اور جواب یہ ہے کہ یہی اشکالات پرائیوٹ فنڈ اور منی آڈر کی تاویلات میں بھی وارد ہوتے ہیں اور باوجود اس کے علماء اس کو صحیح اور معتبر تسلیم کرتے ہیں کما اشرت الیہ سابقاً۔ پس اسی طرح یہاں بھی معتبر و مفید کہا جا سکتا ہے چونکہ معاملہ اموال ربویہ کا اور حرمت و اباحت کے مقابل کا ہے۔ اس لئے اکابر امت و علماء فحول بطور خود بھی غور فرمالیں۔

اگر ابتلاء عام یا ضرورت صحیحہ و معتبرہ واقع میں متحقق ہے جب تو اس توجیہہ میں کوئی کلام ہی نہیں وھو المراد۔

اور اگر ایسا نہ ہو جب بھی اگرچہ اس قسم کا نفس معاملہ کرنا ناجائز کہا جائے اور نفس معاملہ کرنا گو گناہ ہو مگر مجبوری اور حاجت شدیدہ کے وقت جب کوئی دوسرا ذریعہ معاش معیشت سنبھالنے کا اور ضرورت رفع کرنے کا نہ رہے یا متعذر ہو جائے تو اس وقت اس قسم کا معاملہ کرنے کی گنجائش ہوگی۔

الاشباہ النظائر اور حموی کے تشریح کے مطابق باقی رہے گی کما قال القاعدۃ الرابعۃ والمشقۃ تجلب التیسیر۔ وفی القاعدۃ السادسہ من الحاشیۃ ص۱۱۵ یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح منتھی۔ وایضا یعلم مما تحرر فی الحموی وکذلک نحوہ ان یقرض عشرۃ دنانیر مثلاً ویجعل لربہا شیئاً معلوماً فی کل یوم ربحاً اھ۔

اس صورت میں اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو یا غیر مسلم کے ہاتھ ہی ہو، کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اس تمہید کے بعد اب تحریر کردہ ہر سہ سوالات کے جوابات نمبر وار درج ہیں۔

۱، ۲۔ اس زائد رقم پر جس کو حکومت قرض لینے والوں سے وصول کرتی ہے ٹیکس کی تعریف صادق نہیں آتی، لیکن اس کو علی الاطلاق سود کہنا بھی ضروری نہیں، بلکہ اس میں تفصیل ہوگی وہ یہ کہ اگر محض نقد روپیہ بطور قرض لیا جائے اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے یا سامان وغیرہ کے ساتھ ہی لیا جائے، مگر نقد کی وہ مقدار سامانوں سے کام چلانے کی مقدار سے زائد ہو اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے اور واپسی کی کل رقم کل رقم یا قیمت سے زیادہ ہو جائے تو سود کی تعریف (ھو فضل خال عن العوض لاحد المتعاقدین فی عقود المعاوضۃ) صادق آجائے گی مقدار نفع کم ہو یا زیادہ۔ اور چونکہ معاملہ نقدین میں اور خالص مبادلہ اور عوض کا ہوگا، اس لئے وہ نفع سود ہی ہوگا اور حتی المقدور اس کے قریب بھی جانا جائز نہ ہوگا۔ اور مجبوری کا حکم دوسرا ہے جو اس جزئیہ۔ یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباہ والنظائر ص۱۱۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ احتیاج شدیدہ کی حالت میں فقہاء امت سودی قرض

بقدر ضرورت لینے کی اجازت دیتے ہیں۔

البتہ جو رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جائے۔ اس میں تاویل چل سکے گی اور اس کو کام چلانے کے لئے اعانت میں داخل کر کے اس پر سودی معاملہ کا حکم نہ لگائیں گے بلکہ انتظامات کی درستگی کے لئے ایک قسم کی فیس میں داخل کیا جا سکتا ہے اور اس صورت میں یہ معاملہ جائز رہے گا۔

اسی طرح مثلاً کسی نے پروجیکٹ (محکمہ ترقیات کا ایک شعبہ) سے چار ہزار روپئے کنوئیں بنوانے یا مکان بنوانے کے لئے نقد لئے، محکمہ پروجیکٹ نے اپنے قاعدہ کے ماتحت ایک ہزار نقد بالکل معاف کر دیا اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقعہ دیا، پھر دو سال کے بعد چھوٹی اور لمبی قسطیں ادائیگی کے لئے متعین کیا اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا مگر کل وصولی چار ہزار سے زائد نہ ہوئی تو اب قسطوں کے ساتھ جو زیادتی تھی وہ سود نہ ہوگی، اور معاملہ بھی جائز رہے گا کیونکہ مجموعہ قرض چار ہزار تھا، چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا کہ فضل خال عن العوض (؟) یا کل قرض جر نفعا وغیرہ ربوا کی تعریف صادق آسکے۔

اسی طرح محکمہ اعانت و ترقی میں مشین لگانے کے لئے، فیکٹری قائم کرنے لئے یا کوئی صنعت و حرفت یا کارخانہ چلانے کے لئے سامان لینے کی درخواست کی محکمہ نے اپنے ایک شعبہ سے اس کار مقصود کے مناسب حال، نقد روپئے دیئے اور سامان خریدنے کے لئے اپنے دوسرے شعبہ کا تعین کر کے حکم کیا کہ اس شعبہ سے جو سامان درکار ہو خرید لو، اس دوسرے محکمہ نے ارزاں قیمتوں پر باقساط وصولی کے ساتھ سامان دیدیا یا حسب ضرورت دیتا رہا، اور پہلا محکمہ ان قسطوں کی ادائیگی کے مطابق نقد روپئے قرض کے نام پر دیتا رہا اور اس لینے دینے میں

دیتے ہوئے روپئے سے کچھ زائد وصول کیا تو یہ زیادتی بھی سود نہ کہلائے گی بلکہ انتظام کے درست وصحیح رکھنے کی فیس کہی جاسکے گی اور یہ معاملہ بھی جائز رہے گا۔ اسی طرح ہر معاملہ جو اس قسم کے لین دین کا حکومت کے اعانتی محکموں سے ہو، اس میں غرض ومقصود سامنے رکھتے ہوئے اس زیادتی کی حیثیت پر غور کریں گے جب تک کوئی صحیح تاویل ملتی رہے گی۔ ربوا، سود کہنے سے اجتناب کریں گے۔ اور خاص کر جب بجائے نقد کے محض سامان وآلات ادھار دے کر اس کی قیمت مقررہ قسطوں کے مطابق وصول ہو جائے تو اس میں تو کوئی شبہ کسی کو نہیں۔

اسی طرح وقت پر کسی ایک قسط کے یا تمام قسطوں کے وصول نہ ہونے پر جو رقم زائد وصول ہوتی ہو، اس کو بھی قاعدہ کے مطابق انتظامات کی درستگی باقی رکھنے کے لئے ایک قسم کی فیس میں داخل کر کے جائز کہا جاسکتا ہے، بالخصوص جب اس ہندوستان جیسے ملکوں میں۔

فقہاء محققین کا رجحان اس طرف ہے کہ بہت سے عقود فاسدہ میں بوجہ ابتلاء، کہ کوئی توجیہ وتاویل کر کے حد جواز میں داخل کرنے کا توسع کیا جائے، جیساکہ اوپر کی پیش کردہ عبارتوں سے بھی واضح ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ بھی متعدد جزئیات امداد الفتاویٰ وغیرہ کی اس کی شاہد ہیں، لیکن چونکہ بسا اوقات جب ادائیگی پر قدرت نہیں ہوتی، بڑی خطرناک اور مضرت خیز شکلیں بھی سامنے آجاتی ہیں، جیساکہ بعض شکلیں بھی بسلسلہ بیان نقصانات مذکور ہیں اور بہت سے لوگوں کے تجربہ میں بھی ہیں اور جس کا علم عام ہے اس لئے جہاں تک ہو سکے اس قسم کے معاملات سے پرہیز رکھنا ہی ضروری ہے، بغیر کسی شدید معذوری کے اس کے قریب بھی نہ جانا چاہیئے۔ اور اگر اس کو سود ہی قرار

قرار دیا جائے جب تو اس سے اجتناب اور پرہیز کا حتی المقدور ضروری ہونا ظاہر ہی ہے۔

۳۔ اگر یہ تحقیق وتفصیل صحیح ہے جب تو کوئی اشکال ہی نہیں ہے اور اگر یہ تحقیق وتفصیل صحیح ومعتبر نہ ہوئی تو بھی اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو یا غیر مسلم کے ہاتھ میں ہو، اصل جواب جو ۱ و ۲ میں مذکور ہے کوئی فرق واقع نہ ہوگا، اگر واقع ہوگا تو صرف اس قدر کہ جب اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو تو اس مسلم صاحب اقتدار پر ایسی صورتیں صاف واضح طور پر رائج کرنا ضروری ہوگا کہ جن میں عدم ربوا کا یقین ہو، اور کہیں سے ربوا کا نام بھی نہ آئے اور اگر وہ اعلیٰ صاحب اقتدار اس طرف متوجہ نہ ہو تو اس کے بعد والے صاحب اقتدار افراد حکومت پر درجہ بدرجہ حتی کہ عوام میں بھی جو صاحب اقتدار ہوں، ان سب پر حسب حیثیت وقدرت اس اعلیٰ صاحبِ اقتدار کو اس طرف متوجہ کرنا اور اس پر عمل کے لئے امادہ کرنا اور اس کے رواج دینے میں کوشش کرتے رہنا ضروری ہوگا۔

ھذا ما ظھر لی الاٰن فی ھذا المقام من تعجلہ بتوفیق اللہ تعالیٰ وعلیہ التکلان ؛ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند

۱۱/۲/۸۸ھ

سوال ضمیمہ محکمہ اقتصادیات سے مدد لینے کی بعض صورتیں اور اس کا حکم

سوال (۵۸) کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ حکومت کے ایسے بڑے اخراجات کو جو معاشی ترقی کے لئے ناگزیر ہیں۔

حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل طریقوں سے سرمایہ حاصل کیا جا سکتا ہے ؟

۱- قرض ، اس میں چھوٹی بچتوں کی اسکیم ، بینکوں سے قرض ، لمبی مدت کے داخلی قرض ، ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ شامل ہوتے ہیں ۔

۲ - غیر ممالک سے قرض ۔

۳ - خسارے کی مالیات

عنوانات سوالات مندرجہ ذیل ہیں

قرض لینے میں نفع اندوزی کا عنصر ۔

خسارے کی مالیات

افراد کو حکومت کی جانب سے دیئے جانے والے قرض ۔

افراد کو دیئے جانے والے قرضوں کی قسمیں ۔

حکومت کے ملازمین کو قرض ۔

امداد باہمی سوسائیٹیوں کے ذریعے قرض ۔

مالیاتی ادارے ۔

نوٹ :- سوال ۵۷ جو تفصیل سے ہے ، دیکھ لیں تاکہ جوابات سمجھنے میں دشواری نہ ہو ۔

الجواب :- سوالنامہ مع ضمیمہ بغور پڑھا ، سوالنامہ کا حاصل یہ ہے کہ حکومت وقت ترقیاتی اسکیم کے تحت جو رقم قرض کے نام پر اپنی رعایا کو دیتی ہے ، اس پر زائد رقم یا نفع اتنا کم لیتی ہے جو نفی کے برابر ہوتا ہے ، بسااوقات حکومت کو اس میں خسارہ ہی برداشت کرنا ہوتا ہے ، اس میں کسی قسم کی زرکشی یا زراندوزی یا ذخیرہ خیزی وغیرہ جو عام طور سے مہاجنوں کے یا سودی کاروبار کرنے والوں کے پیش نظر ہوتی ہے نہیں ہوتی ، اس لئے یہ قرض

سودی نہ ہوگا۔ اور مسلمانوں کو بھی اس کا لینا اور درست ہونا چاہیئے۔

اور اگر سود کا احتمال ہو تو ٹیکس شمار کر کے یا حکومت کے حقوق عام جو رعیت پر ہوتے ہیں، یہ ان کے تحت لا کر یا کسی اور فقہی تاویل سے یہ قرض لینا اور ان اسکیموں میں مسلمانوں کا شریک ہونا جائز و درست ہو سکتا ہے؟ تاکہ مسلمان بھی ان سے مستفید ہو کر اقتصادیات میں پیچھے نہ رہیں۔

سوالنامہ سے ان ہی امور کی شرعی تحقیق مقصود ہے کہ آیا واقعی ان امور کی گنجائش شرعاً ہے یا نہیں؟

اصل سوالنامہ کے اندر جواب طلب امور کا جہاں تک خاص تعلق ہے ان سب کا تقریباً مفصل جواب احقر کے ایک فتویٰ مکتوبہ ۲۴ ۱۱/۸۸ھ میں آچکا ہے، جس کا حاصل بحذف تمہید و دلائل فقہیہ یہ ہے کہ سود (ربوا) کا ایک مفہوم شرعی ہے، جس کو حقیقت شرعیہ کہہ سکتے ہیں، اور اس کی حرمت متعدد آیات و احادیث میں نہایت شد و مد سے مصرح و منصوص ہے، اور اس کے ارتکاب کرنے والوں پر بڑی سخت سخت وعیدیں وارد ہیں، اور یہ حرمت ایک ضابطہ و قانون کی شکل میں نازل ہو چکی ہے، اور یہ قانون (حرمت ربوا) اس بادشاہ کا قانون ہے جو تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اور تمام قانون بنانے والے دماغوں کا بنانے والا ہے۔ تمام کائنات عالم کا تخلیق کرنے والا اور مالک ہے۔ اور تمام گذشتہ موجودہ اور آئندہ کے بھی تمام منافع و مضار ہر پہلو و ہر حیثیت سے اس کے سامنے ہمہ وقت مستحضر ہیں۔

دنیا کی کوئی حکومت یا قانون بنانے والی کوئی جماعت بڑے سے بڑا دماغ خواہ کتنا ہی مکمل و منضبط اور اپنے خیال میں کتنا ہی جامع اور مانع قانون بنائے۔ وہ اس احکم الحاکمین اور وحدہ لاشریک لہ کے بتائے ہوئے

قانون جیسا مکمل و مدلل وجامع و مانع و نافع نہیں ہوسکتا۔

جب اس نے یہ مکمل قانون (ربوا کی حرمت مطلقہ کا) بنا کر دنیا کو اس کے خلاف نہ کرنے کا حکم قطعی دیدیا، اور ایسے وقت میں اس کو نافذ بھی کردیا کہ وہ وقت آج کے وقت سے کہیں زیادہ سخت اور قابل لحاظ ورعایت تھا، اور اس کی حرمت بھی ساتھ ساتھ اور کھلے لفظوں میں بیان کردی بلکہ جہالت (زمانہ پیشیں) کے جتنے ربوا تھے سب کو یک لخت ختم و نسیا منسیا کردیا، اور دنیا نے اس قانون کا امتثال کرکے اور بار بار اس کا تجربہ کرکے نافع بھی دیکھ لیا تو اب اس قانون کے مطابق سود (ربوا) کا مفہوم جب کسی معاملہ پر صادق آجائے گا تو اس کو کسی طرح بھی جائز یا مباح نہیں کہا جائے گا۔

اور بالکل اسی طرح جب تک کسی معاملہ پر ربوا (سود) کی شرعی تعریف صادق نہ آجائے گی محض لوگوں کے ربوا کا نام اس پر رکھ دینے سے کبھی اس کو حرام و ناجائز یا ربوا نہ کہا جائے گا۔

بس اس قاعدہ کے مطابق اس زائد رقم یا نفع کے تقریباً ہر شق کا جواب تفصیل کے ساتھ احقر کے سابق جواب (مکتوبہ ۲۴ ۱۱/۸ ۸ھ) میں جو آچکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تمہید و دلائل فقہیہ کو حذف کرکے صرف اس زائد رقم کا تفصیلی حکم یہاں لاحق کردیا جائے۔ پھر ضمیمہ کا جواب لکھا جائے۔ البتہ اصل سوالنامہ میں جو بعض زائد باتیں ہیں، ان کے جواب کا یہاں اضافہ بھی کردیا جائے، تاکہ بات ہر پہلو سے مکمل ہوکر سامنے آجائے اور جن صاحب کو مزید دلائل وغیرہ دیکھنا ہو وہ اس اصل جواب کو بھی دیکھ لیں۔ اس تمہید کے بعد اس زائد رقم کا تفصیلی حکم پیش ہے۔

۱۔ اس زائد رقم پر جس کو حکومت قرض لینے والوں سے وصول کرتی ہے،

ٹیکس کی تعریف صادق نہیں آتی ۔ لیکن اس کو علی الاطلاق سود کہنا بھی ضروری نہیں ، بلکہ اس میں تفصیل ہو گی ، اور وہ یہ ہے ۔

(الف) اگر محض نقد روپیہ بطور قرض کے لیا جائے ، اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے یا سامان وغیرہ کے ساتھ نقد بھی لیا جائے مگر نقد کی وہ مقدار سامانوں سے کام چلانے کی مقدار سے بہت زیادہ ہو ، اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا اور واپسی کی کل رقم یا فنی رقم سے زیادہ ہو جائے تو سعود کی تعریف (ھو فضل خال عن العوض لاحد المتعاقدین) صادق آجائے گی ، اور چونکہ معاملہ نقدین میں اور خالص مبادلہ اور عوض معاوضہ کا ہے اس کیلئے وہ نفع کم ہو یا زیادہ وہ سود ہی ہو گا (کل قرض جر نفعًا فھو ربوا) بھی صادق آجائے گا ۔ اس لئے حتی المقدور اس کے قریب بھی جانا جائز نہ ہو گا ، اور مجبوری کا حکم دوسرا ہو گا جو اس جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے ۔ (ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح) (الاشباہ والنظائر ص ۱۱۵) اسی قاعدہ کے تحت احتیاج شدیدہ کے حالت میں فقہاء امت سودی قرض کو بھی بقدر ضرورت لے لینے کی اجازت دیدیتے ہیں ۔

(ب) ۔ جو نقد رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جائے ، اس میں تاویل چل سکے گی ، اور اس کو کام چلانے کے لئے اعانت میں داخل کر کے اس معاملہ پر سودی معاملہ کا حکم نہ لگائیں گے اور اس زائد رقم کو سود نہ کہیں گے بلکہ انتظامات کی درستگی کے لئے ایک قسم کی فیس میں داخل کیا جا سکے گا ، اور اس صورت پہ معاملہ جائز رہے گا ۔

(ج) ۔ مثلاً کسی نے پروجیکٹ (محکمۂ ترقیات کا ایک شعبہ) سے چار ہزار روپئے کنواں کھدوانے یا مکان بنوانے کے لئے یا کسی اور صنعت وحرفت

کے لئے نقد لئے اور محکمہ پروجیکٹ نے اس میں سے اپنے قاعدہ کے تحت ایک ہزار بالکل معاف کر دیا اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقع دیا۔ پھر دو سال کی تاخیر کے بعد چھوٹی اور لمبی قسطیں ادائیگی کے لئے متعین کیا۔ اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا، مگر کل رقم وصولی کی چار ہزار (کل قرضہ) سے زائد نہ ہوئی، تو اب ان قسطوں کے ساتھ جو زیادتی محکمہ نے وصول کی وہ سود نہ ہوگی۔ اور یہ معاملہ بھی جائز رہے گا۔ چونکہ مجموعہ قرض چار ہزار تھا اور چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا کہ سود کی تعریف (ھو فضل خال عن العوض الخ کل قرض جر الخ) صادق آسکے۔

(د) ۔ مثلاً محکمہ اعانت وترقی میں مشین (ٹیوویل) لگانے کے لئے یا فیکٹری قائم کرنے کے لئے یا کوئی اور صنعت وحرفت یا کارخانہ چلانے کے لئے سامان لینے کی درخواست دی، محکمہ نے ایک شعبہ سے اس کار مقصود کے لئے اس کے مناسب حال نقد روپئے دیدیئے اور سامان لینے یا خریدنے کے لئے اپنے دوسرے شعبہ کا تعین کر کے حکم کیا کہ اس فلاں (دفتر یا شعبہ) سے جو سامان درکار ہو خرید لو، یا لیتے رہو۔ اور اس دوسرے شعبہ یا دفتر نے ارزاں قیمت پر باقساط وصول کئے اور شرط کے ساتھ سامان دیدیا، یا حسب ضرورت دیتا رہا، اور پہلا شعبہ (محکمہ کا) ان قسطوں کی ادائیگی کے مطابق نقد روپئے قرض کے نام پر دیتا رہا، اور اس لینے دینے میں محکمہ نے اپنا دیا ہوا روپیہ وصول کرتے ہوئے اپنے دیئے ہوئے روپئے سے کچھ زائد وصول کرلیا ہے تو اس زیادتی کا سود ہونا بھی ضروری نہیں بلکہ انتظام درست وصولی رکھنے کی فیس میں بھی کہا جا سکے گا، اور یہ معاملہ بھی جائز رہ سکے گا۔

(ہ) ۔ اسی طرح حکومت کے کسی اعانتی محکمہ سے کھاد یا بیج وغیرہ ادھار

لیا۔ محکمہ نے ۶ ماہ میں ہر ماہ دس روپیہ کے حساب سے کل ۶۰ روپیہ وصول کئے اور اپنے رجسٹر میں از خود اصل قیمت کے خانہ میں ۵۰ روپئے درج کئے اور دس روپے خانہ سود یا نفع میں درج کئے تو اس دس روپئے کا سود ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ جزو ثمن قرار پا سکتا ہے، اس لئے کہ سود نام ہے اس فضل خال عن العوض کا جو اموال ربویہ کے اندر عقد معاوضہ کا معاملہ کرنے میں مشروط طریقہ پر طرفین متعین کریں، اور یہاں ایسا نہیں ہوا ہے، خواہ مشتری کو اس اندراج کا علم ہو جائے یا نہ ہو، بالخصوص ایسے ملک میں جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلمین کے ہاتھ میں ہو، مسلمانوں کو قانوناً ایسا معاملہ کرنے سے رد کنے کا یا اس کے اصلاح کرنے کا اختیار نہ ہو، اور خاص کر جب مجموعہ وصولی کی مقدار عام بازار کے نرخ کے اعتبار سے غبن فاحش کی مقدار سے زائد نہ ہو۔

(د)۔ اسی طرح ہر معاملہ جو اس قسم کے لین دین کا حکومت کے ان اعانتی محکموں سے ہو، اس میں غرض و مقصود کو سامنے رکھتے ہوئے اس زیادتی کی حیثیت پر غور کریں گے جب تک کہ کوئی صحیح فقہی تاویل ملتی رہیگی اس کو ربوا (سود) کہنے سے اجتناب کریں گے اور خاص کر جب بجائے نقد کے محض سامان یا آلات وغیرہ ادھار دے کر اس کی قیمت مقررہ متعدد قسطوں کے ذریعہ وصول ہو تو، تو اس میں تو امید ہے کہ کسی کو کوئی شبہ نہیں ہوگا

(س)۔ اسی طرح وقت پر کسی ایک قسط یا متعدد یا تمام اقساط کے وصول نہ ہونے پر جو رقم زائد وصول ہوتی ہو، اس کو بھی قاعدہ کے مطابق انتظامات کی درستگی باقی رکھنے کے لئے ایک قسم کی فیس میں داخل کر کے جائز کہا جا سکے گا۔

بالخصوص جب اس ہندوستان جیسے ملکوں میں فقہائے محققین کا رجحان

اس طرف ہے کہ بہت سے عقود فاسدہ میں بوجہ ابتلائے عام کے کوئی صورت توجیہہ وتاویل کر کے حد جواز میں داخل کر لینے کی ہو تو داخل کر لینے کا توسع کیا جائے جیسا کہ تمہید میں پیش کردہ عبارتوں سے بھی واضح ہوتا ہے اور اس کے علاوہ بھی متعدد جزئیات امداد الفتاویٰ وغیرہ کی اس کی شاہد ہیں۔ جیسے گائے بھینس وغیرہ کو چرائی پر دینے کی جزئی۔

لیکن چونکہ بسا اوقات جب ادائیگی ثمن وقسط پر قدرت نہیں ہوئی تو بڑی خطرناک مضرت خیز شکلیں بھی سامنے آجاتی ہیں، جن سے عزت وآبرو جان ومال سب خطرے میں پڑجاتے ہیں، جیسا کہ بعض شکلیں بسلسلۂ بیان نقصانات خود سوال میں بھی مذکور ہیں اور بہت سے لوگوں کے تجربہ ومشاہدہ میں بھی ہیں جس کا علم عام ہے، اور بعض مرتبہ محررین وکارکنان محکمہ کی بے اعتنائیوں وشرارتوں کی وجہ سے برآمدگی رقوم میں بے حد تعویقیں ودشواریاں پیش آجاتی ہیں۔ یا رشوت خوروں کی وجہ سے حاصل شدہ رقم کا ایک معتد بہ حصہ انہی کی نذر ہو جاتا ہے اور وصول کرنے والا اس قابل نہیں رہتا کہ ترقی کر سکے بلکہ وقت پر ادائیگی ووا پسی بھی بسا اوقات دشوارتر ہو جاتی ہے، اس لئے جہاں تک ہو سکے اس قسم کے معاملات میں پڑنے سے پرہیز ہی رکھنا ضروری ہے بغیر شدید معذوری کے اس کے قریب بھی نہ جانا چاہئے۔

اور اگر اس کو سود ہی قرار دیا جائے جب تو اس سے اجتناب وپرہیز کا حتی المقدور ہونا ظاہر ہی ہے۔ یہ تحقیق وتفصیل صحیح ہے یا غیر صحیح اس کا فیصلہ تو علمائے محققین اور مفتیانِ مدققین کریں گے۔ ان سب حضرات سے درخواست ہے کہ برنگ اصلاح یا بصورت تائید وتصویب مطلع فرمائیں۔ باقی اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو، اس سے اس مسئلہ میں کچھ فرق واقع نہ ہوگا اگر واقع

ہوگا تو صرف اس قدر کے جب اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہوگا، تو اس مسلم صاحب اقتدار پر ایسی صورتیں صاف اور واضح طور پر رائج کرنا ضروری ہوگا، جن میں عدم ربوا کا یقین ہو، اور کہیں سے اس میں ربوا کا نام بھی نہ آنے پائے اور دعوا الربوا والریبہ کا پورا پورا مصداق ہو، اور اگر وہ صاحب اقتدار اس طرف متوجہ نہ ہو تو اس کے بعد والے اور کمتر درجہ والے صاحب اقتدار افراد حکومت پر درجہ بدرجہ حتی کہ عوام میں بھی جو صاحب اقتدار ہوں گے ان سب پر حسب حیثیت و قدرت اس اعلیٰ صاحب اقتدار کو اس طرف متوجہ کرنا اور اس پر عمل کیلئے آمادہ کرنا اور اس کے رواج دینے میں کوشش کرنا واجب ہوگا

نوٹ :- سابق جواب یہاں تک ختم ہوگیا اس کے بعد کا اس وقت کا اضافہ ہے جو سوالنامہ کے پیش نظر لکھا گیا۔

۲ — جس جس چیز پر سود کا مفہوم شرعی صادق آجائے گا، اس کو والی یا حاکم کے حقوق خصوصی کی بنیاد پر مباح و جائز نہیں کہا جاسکتا، خاص کر جن جن چیزوں کا حکم نص میں جس طرح آجائے، اسی طرح اس کو رکھنا ضروری ہوجاتا ہے کہ یہی اصل دین ہے اور دین کے خلاف کسی کا بھی حکم ہو معتبر نہیں لقولہ تعالیٰ ومن یتبع غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ الایۃ۔

اور اسی وجہ سے ایسی تمام چیزیں حکام وشاہان دنیا کے دسترس سے بلند وبالاتر ہوتی ہیں حتی کہ اگر کوئی امیر یا والی یا امام ان نصوص کے خلاف کوئی حکم کر بھی دے تو وہ مداخلت بے جا اور مداخلت فی الدین ہوگی اور کسی بھی مسلمان کو اس کی موافقت یا اتباع درست و مباح نہ ہوگی۔ اس لئے کہ اس کی موافقت و اتباع میں خالق کائنات ورب الارباب کی نافرمانی اور اس کی معصیت کا ارتکاب ہوگا اور یہ جائز نہیں۔ لقولہ علیہ السلام لا طاعۃ لمخلوق

فی معصیة الخالق۔

اور الضرورات تبیح المحذورات میں الف لام عہد کا ہے اور اس سے صرف وہ ضرورتیں مراد ہیں جو ملجی یا منجر ہوں، کیفیت واضطرار مخمصہ کی جانب جیساکہ اس جملہ سے بالکل متصل اگلی عبارت (ومن ثم جاز اکل المیتۃ عند المخمصۃ) اس پر قرینہ ہے، جس کو اسی قاعدہ کی وضاحت کے لئے مثال کے موقع پر خود مصنف (صاحب اشباہ ص۱۱۵) نے ذکر فرمایا ہے اور یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح جو فرمایا گیا ہے اس کا مقصود سود کو جائز کہنا نہیں ہے بلکہ صرف گنجائش دینا ہے بایں معنی کہ اس معذوری میں اس طرح قرض لے لینا جائز ہو جائے گا اور مواخذہ آخرت سے بری رہ سکے گا اور بس۔

نمبر۳ و نمبر۴۔ ان دونوں نمبروں کا جواب ابھی نمبر۱ میں بتفصیل گذر چکا ہے اس کے بعد ضمیمہ کا اصل جواب عرض ہے۔ ضمیمہ میں دو قسم کے قرضوں کا ذکر ہے

پہلی قسم حکومت کا خود دوسروں سے قرض لینا

اندرون ملک کے باشندوں سے خواہ بیرون ملک سے پھر خواہ دوسری حکومتوں سے یا وہاں کے سرمایہ داروں سے اور پھر خواہ نفس حکومت کے استحکام و ترقی پر خرچ کرنے کے لئے لیا جائے خواہ اپنی رعیت کے فلاح و بہبود پر براہ راست خرچ کرنے کے لئے لیا جائے۔

دوسری قسم حکومت کا اپنی رعایا کو قرض دینا۔

قسم اول پر کلام کرنے سے زیادہ مقدم واہم قسم ثانی پر کلام کرنا ہے، اس لئے کہ اسی کا تعلق مسلم عوام سے براہ راست ہے۔ اور انہی کے لئے شرعی راہ تلاش کرنا مقصد سوال ہے۔ علاوہ ازیں قسم ثانی پر کلام کرنے سے قسم اول کی بہت سی

صورتوں کا حکم شرعی خود بخود بھی نکل آئے گا، قسم ثانی کی موٹی موٹی اور اصولی چھ صورتیں ضمیمہ میں ظاہر کی گئی ہیں۔ ہر ایک پر بقدر ضرورت کلام کر کے اس کا حکم شرعی منقح کرنا مقصود ہے۔

نمبر۱۔ بچوں، بوڑھوں، معذوروں کو وظیفہ دینا۔ یہ صورت اگرچہ اب تک ہمارے ملک میں ظاہر نہیں ہے، لیکن اگر عام ہو جائے تو اس کے جواز میں کوئی خفا یا شبہ نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ یہ خالص وظیفہ یا اعانت یا انعام ہو گا بخلاف اور صورتوں کے ان میں بسا اوقات تفتیش و تحقیق کا اور حکم شرع مستنبط کرنے کا احتیاج ہو گا، پس یہ صورتیں نیز نمبر۲ و نمبر۳ و نمبر۵ کے اندر قرض کی قریب تمام صورتوں کا حکم احقر کے سابق جواب میں آچکا ہے۔ اور بعض صورتیں جو رہ گئی ہیں ان کا حکم اس وقت ہر نمبر کے تحت بیان کر دیا جائے گا۔

نمبر۲۔ اس تحریر کا مقصد اگر یہ ہے کہ فنڈ سے لیا ہوا قرض دراصل اسی ملازم کا روپیہ ہے اور اس کی واپسی میں جو رقم زائد سود کے نام پر دی جاتی ہے وہ بھی اصل اسی ملازم کو ختم ملازمت پر واپس دیدی جاتی ہے، اس لئے یہ قرض درحقیقت قرض اور یہ سود درحقیقت سود نہ ہوئی، کیونکہ قرض تو وہ چیز ہوتی ہے جو دوسروں سے لی جائے۔ اور سود اس زیادتی کا نام ہے جو دوسروں کو دی جائے۔ تو یہ توجیہ و تاویل اور یہ مقصد صحیح نہیں ہے اس لئے کہ فنڈ کی اس رقم پر ابھی ملازم کی ملکیت ہی متحقق و ثابت نہیں ہوئی ہے اس لئے کہ ملازم کی حیثیت اجیر کی ہوتی ہے، اور فنڈ کی رقم کا وہ حصہ جو تنخواہ سے وضع نہیں ہوتا بلکہ محکمہ اپنی طرف سے ملاتا ہے، اس کا وصول ہونے سے قبل قبل ملک ملازم نہیں ہوتا تو ظاہر ہی ہے اور فنڈ کا وہ حصہ جو تنخواہ سے وضع ہوتا ہے وہ بھی جزو اجرت ہوتا ہے۔ اور اجرت پر جب

تک اجیر کا قبضہ وتصرف نہ ہو جائے اس وقت تک اجیر کی اس پر ملکیت ثابت ومتحقق نہیں ہوتی، صرف استحقاق ملکیت فی الجملہ ہوتا ہے، اور یہ ثبوتِ ملک کے لئے کافی نہیں ہے۔

اسی وجہ سے جب تک فنڈ کی رقم وصول نہیں ہو جاتی اس پر زکوٰۃ وغیرہ واجب نہیں ہوتی، اور اسی وجہ سے محکمہ جو جزو اضافہ کر کے اور زائد کر کے دیتا ہے اگرچہ سود کے نام پر دیتا ہے، اور اپنے فہم وخیال میں اس پر سود کا اطلاق کرتا ہے اس کو سود نہیں کہا جاتا بلکہ سب کو انعام شمار کیا جاتا ہے اور جائز کہا جاتا ہے، غرض وہ رقم ابھی دراصل محکمہ ہی کی ملکیت ہوتی ہے۔ اور محکمہ کی ملک میں واپس جاتی ہے، اور جب قرض کے نام پر دی جاتی ہے تو قرض ہی شمار ہوگا اور جو نفع اس پر لیا دیا جائے گا وہ قرض پر ہی نفع لینا دینا شمار ہوگا جس کا سود ہونا ظاہر ہے، اور یہ نسبت کہ یہ فنڈ ملازم کا ہے یہ نسبت مجازی ہے مایؤول کے اعتبار سے ہے، اور اگر تسلیم بھی کر لیں کہ وہ زائد رقم (نفع)، پھر اسی ملازم کو واپس مل جاتی ہے جب بھی کچھ مفید نہیں، اولاً تو اس لئے کہ وہ رقم بہ شکل نقد ہوتی ہے۔ اور نقود میں قاعدہ شرعیہ مسلمہ عند الکل ہے کہ تبدل ملک سے تبدل عین ہو جاتا ہے، اور تبدل میں واپسی کہاں۔ واپسی تو بعینہ اسی سابق شئی کے واپسی کا نام ہے اور پھر اگر اس واپسی کو بھی تسلیم کر لیں جب بھی مفید مدعا (عدم ربوا) نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ جب محکمہ اس کو سود قرار دے کر لیتا ہے، اور سود ہی کے درجہ میں رکھ کر ملازم کو ختم ملازمت پر دیتا ہے، جیساکہ سوال سے واضح ہے تو اس واپسی کو استرداد نہیں کہہ سکتے، کیونکہ استرداد میں سابق معاملہ کو فسخ کرنا اور اس کی حیثیت کو مٹانا اور ختم کرنا منوی اور ملحوظ ہوتا ہے اور یہاں ایسا نہیں ہے، اور جب

یہ واپسی استرداد نہیں ہوئی تو سود کی حقیقت وشناعت بھی ختم نہ ہوئی بلکہ قائم ومتحقق رہی۔ لہٰذا یہ زائد رقم قرض کا نفع اور سود ہی کے حکم میں ہوگی، اور بغیر حاجت واقعی ایسا قرض بھی لینا درست نہ ہوگا۔ ہاں اگر بغیر سودی قرض کے چارہ نہ ہو، اور محکمہ کے علاوہ کسی دوسرے سے قرض لینے میں سود زیادہ دینی پڑے گی تو اس صورت میں اشد المفسدین سے بچنے کی نیت سے اس اخف المفسدین کو ہی گوارہ کیا جائے گا۔ اور اس قرض کو دوسرے قرضوں پر ترجیح ہوگی، اور بقدر ضرورت وحاجت لے لینے کی گنجائش ہوگی۔

۳۔ امداد باہمی سوسائٹیوں کے ذریعہ قرض۔

اوران سوسائٹیوں کو بھی حکومت ہی قائم کرتی ہے اور اپنی ہی دی ہوئی یا دلائی رقم اشیاء سے امداد دلاتی ہے، اس لئے ان سوسائٹیوں سے ملی ہوئی امداد (نقد یا بشکل سامان یا دونوں جو بھی ہو) سب کا حکم اور اس پر وصول کردہ رقم بنام سود کا سود ہونا یا سود نہ ہونا ان سب کی تفصیل وہی ہوگی جو اصل استفتاء مکتوبہ ۲۶ ؁ھ کے جواب میں گذر چکی ہے۔ بلکہ اگر ان سوسائٹیوں میں شرکت یا مضاربت کے اصول پر کاروبار کیا جائے تو اس کے نفع کا سود نہ ہونا اور زیادہ آسان اور نمایاں ہو جائے گا بلکہ اس میں شرکت کرنا اور حصہ لینا بھی درست ہو سکے گا۔

۴۔ بالاقساط ادائیگی ثمن کے وعدہ پر خرید وفروخت کا طریقہ

اس بیع کا حکم عام طور سے فقہاء متاخرین کے فتاویٰ میں بہ تفصیل موجود ہے، جیسے امداد الفتاویٰ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر وصولی اقساط کے سلسلہ میں کوئی قید عقد بیع کے منافی نہ ہو تو بے تکلف یہ بیع جائز رہے گی، اور اگر کوئی قید عقد بیع کے منافی بھی لگ جائے لیکن ارکان بیع متحقق میں تو نفس

معاملہ کرنے میں اگرچہ فساد آجائے اور بیع فاسد کہی جائے لیکن یہ بیع بالکل کالعدم اور باطل نہ کہی جائے گی بلکہ مشتری کے حق میں مفید ملک رہے گی۔ اور اس خرید کردہ شئ سے جو انتفاع ہو جائے گا وہ حرام نہ رہے گا اور جو تصرف اس میں کیا جائے گا وہ نافذ وصحیح رہے گا، اور ہندوستان جیسے ممالک میں ایسے توسعات کی گنجائش ملتی ہے، جیساکہ ہم اپنے سابق اصل جواب میں مدلل طور پر بیان کر آئے ہیں۔

۵ - مالیاتی ادارے۔

پہلے عموماً بینکوں میں محض نقد کا لین دین ہوتا تھا، اس لئے اس کے منافع کو علی الاطلاق ناجائز اور سود کہا جاتا تھا۔ لیکن اب بہت سے بینک شرکت اور مضاربت کے اصول پر بھی قائم ہوتے اور چلائے جاتے ہیں۔ اس لئے ان بینکوں میں شرکت کرنا یا ان سے لین دین کرنا جو شرکت یا مضاربت کے اصول کے مطابق ہوں ناجائز نہ ہوگا۔ اسی طرح ان کے منافع کا ہر حال میں سود ہونا ضروری نہ ہوگا۔ بلکہ ان بینکوں کے اصول وضوابط اور ان کے حالات کے اعتبار سے الگ الگ حکم ہوگا، اور جائز بھی ہو سکے گا۔

اسی طرح "انشورنس" کی حقیقت ابتدا ر سود وقمار میں منحصر تھی، لیکن اگر اس کے اصول وضوابط میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے (جیساکہ بعض لوگ کہتے ہیں) تو اس کی تفصیل سامنے آنے کے بعد اس کے مطابق بھی حکم شرعی منقح ہو سکے گا۔ بہر حال یہ مالیاتی ادارے بینک کے امداد سے قائم ہوئے ہوں یا "انشورنس" کی مدد سے یا کسی اور طرح سے قائم ہوئے ہوں ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں ہے۔ اس وقت پیش نظر صرف یہ ہے کہ کسانوں کی زمینیں رہن رکھ کر ان کو جو امداد دی جاتی ہے، خواہ نقد سے بصورت

قرض یا بصورت سامان یا آلات زراعت بیج، کھاد وغیرہ اشیاء سے ادھار فروخت کرکے، غرض ان سب صورتوں میں کون کونسی صورتیں اور کون کونسے معاملے شرعی اصول پر جائز ودرست ہیں، اور کون کونسے ناجائز اور نادرست ہیں۔ ان سب کی تفصیل بھی اصل سوال کے جواب میں گذر چکی ہے وہاں مکمل دیکھ لیا جائے۔

۶ ــ بواسطۂ بینک خرید وفروخت وکاروبار

(۱) ۔ اس طریقہ سے کاروبار کرنے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں ۔

مالک از خود بینک کا واسطہ اختیار کرتا ہے، خریدار اس کو پسند نہیں کرتا۔ مگر وہ مالک بینک کے واسطہ سے مال خریدار کے پاس بھیجتا ہے، اس میں مالک مال کو کئی فائدے ہوتے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ بینک سے قیمت فوراً نقد یا کم سے کم مدت میں اور بہت آسانی سے وصول ہو جاتی ہے، دوسرے مال کے ضائع ہونے یا فریب ودھوکہ کھانے یا ادھار معاملہ میں پڑ کر قیمت کے ڈوب جانے وغیرہ کے احتمالات بہت کم ہو جاتے ہیں۔

(۲) ۔ کبھی مالک مال از خود نہیں بلکہ قانون وقت کے تقاضے سے مجبور ہو کر بینک کا واسطہ اختیار کرتا ہے، اور پھر بقیہ عمل وہی کرتا ہے جو نمبر ایک میں گذر چکا ہے، اور خریدار اگرچہ اس کو پسند نہیں کرتا مگر انکار بھی نہیں کرتا۔

(۳) ۔ کبھی خود حکومت دخیل ہو کر بائع ومشتری کے درمیان میں بینک کو قانوناً واسطہ بنا دیتی ہے اور بینک کے ذریعے سے خرید وفروخت کراتی ہے، یہ دونوں صورتیں پہلی صورت کے اعتبار سے کم ہوتی ہیں۔

(۴) ۔ کبھی بینک خود پیش کش کر کے یہ طریقہ کار جو نمبر ایک میں گذرا مالک مال سے اختیار کرا لیتا ہے۔ کیونکہ اس طریقہ کار میں بینک کو بھی فائدہ پہنچتا ہے

بینک کی آمدنی بڑھتی ہے، یہ صورت پہلی تینوں صورتوں سے کم ہوتی ہے۔

۵۔ کبھی یہ طریقہ کار (بذریعہ بینک کاروبار) خود خریدار بھی اختیار کرتا ہے مگر کم۔ صرف ان صورتوں میں جب خریدار کے پاس اتنا سرمایہ نہیں رہتا کہ ہمیشہ نقد ہی قیمت ادا کرسکے، یا کوئی اور قانونی مجبوری ہوتی ہے یا راستہ وغیرہ کے خطرہ سے حفاظت مقصود ہوتی ہے۔

۶۔ انہی مواقع میں کبھی بینک خود بھی پیش کش کرکے خریدار سے براہ راست یہ طریقہ کار اختیار کرالیتا ہے۔ یہ اخیر کی دونوں صورتیں بہ نسبت پہلی چار صورتوں کے بھی بہت کم ہوئی ہیں، اس لئے کہ اس میں خریدار کو اگرچہ کچھ فوائد بھی ہوتے ہیں مگر کچھ اس پر خرچ کا بار زائد ہو جاتا ہے نیز کچھ ذمہ داریاں و پریشانیاں بھی سوار ہو جاتی ہیں۔

ان چھ صورتوں میں سے پہلی چار صورتوں میں بینک سے خریدار کے قرض لینے یا بینک کو قرض پر نفع دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان صورتوں میں خریدار بینک سے قرض کا کوئی معاملہ ہی نہیں کرتا، بلکہ مالک خود یا دونوں براہ راست بینک سے اپنا معاملہ کر کے اس کو اپنا وکیل یا اجیر بناتے ہیں، یا بینک خود دخیل ہو کر بجائے خریدار کے مالک مال سے اپنا معاملہ کرلیتا ہے، اور ان کی ہدایات کے مطابق جو معاملہ چاہتا ہے کرتا ہے اس میں خریدار بینک سے کہنے نہیں جاتا کہ میری طرف سے اتنا قرض دیدو بلکہ یہ صورت قریب قریب ویسی ہی ہو جاتی ہے، جیسی صورت اصل پرائیوٹ فنڈ میں ہوتی ہے کہ محکمہ خود جو معاملہ چاہتا ہے اپنے ملازم کے ساتھ کرتا ہے مثلاً یہ ہے کہ ملازم کے تنخواہ سے وضع کردہ روپیہ کے مثل خواہ اضافہ کرتا ہے یا مثلاً خود ہی نام نہاد جمع شدہ فنڈ پر سود یا سود در سود وغیرہ کے نام

سے کچھ رقم بڑھاتا رہتا ہے لیکن کوئی اس کو سود نہیں کہتا، پس جس طرح وہاں سود کا تحقق نہیں ہوتا یہاں بھی نہ ہوگا، کیونکہ سود کا تحقق عقود معاوضہ میں ہوتا ہے، اور یہاں سرے سے خریدار کا بینک سے کوئی عقد ہی نہیں ہوتا اور یہ ظاہر ہے۔ اور پانچویں و چھٹی صورت میں (جب خریدار خود بینک کا واسطہ اختیار کرے یا بینک خود براہ راست خریدار سے معاملہ کرے)، بھی چھ مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔

(یہاں الف، ب، ج، د، و کے عنوان سے چھ صورتیں لکھی جاتی ہیں)

الف:- خریدار کا نقد سرمایہ بینک میں داخل و موجود ہے اور از خود مالک مال کو قیمت جمع کرا دیتا ہے تو اس کو بھی خریدار کا قرض لینا نہ کہیں گے۔ بلکہ اس جمع شدہ سرمایہ ادا کرنا یا جمع کرنا محسوب کریں گے اور بینک کو اس کا اجیر یا وکیل کہیں گے، اور جو پیسے بینک خریدار سے مزید وصول کرے گا اس کو عمل کی اجرت قرار دیں گے۔

ب:- خریدار کا کچھ سرمایہ تو بینک میں جمع نہیں ہے، لیکن بینک از خود ادائیگی ثمن کی مقررہ مدت سے قبل ہی مالک مال کو قیمت ادا کر دے، تو بھی خریدار کا قرض لینا نہ کہیں گے اور پھر بینک خریدار سے جو رقم اصل قیمت سے زائد لے گا اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا، اور یہ ظاہر ہے۔

ج:- ادائیگی ثمن کی مقررہ تاریخ ختم ہونے کے بعد بھی اگر بینک از خود قیمت جمع کر دے لیکن خریدار سے کوئی معاملہ نہ کرے، جب بھی قرض لینا صادق نہ آئے گا۔ اور پھر اس پر بینک اصل ثمن سے زائد لے گا اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا۔

د:- اسی طرح اگر خریدار کا کچھ سرمایہ بینک میں جمع نہ ہو، لیکن بینک

مال کو اپنے قید اور نگرانی میں لے کر قیمت مالک مال کو جمع کر دے، پھر جب خریدار قیمت ادا کرے اس کے بعد مال پر قبضہ ہونے دے تو اس صورت میں بھی قرض لینے کا معاملہ خریدار سے نہ ہوگا اور جو پیسے بینک سے لے گا وہ بجائے سود کے اجرت عمل شمار ہوگی۔

ط:- ان تمام صورتوں میں خواہ پہلی نمبر وار چھ صورتیں ہوں (یا الف ب، ج، د وغیرہ کی پانچ صورتیں ہوں) سب میں اگر بینک اپنے پاس سے قیمت مال ادا نہ کرے بلکہ خریدار جس جس طرح قیمت ادا کرتا جائے باقساط یا بہ قسط واحد بینک وصول کر کے محض وہ قیمت مالک مال کو دیتا جائے تو اس صورت میں بھی جو پیسہ خریدار سے یا مالک مال سے بینک طے کر کے خود لیگا وہ سود نہ ہوگا، بلکہ وہ اس کی اجرت اور حق المونت ہوگی، اور یہ دینا لینا جائز رہے گا۔

ی:- البتہ اگر خریدار بینک سے واقعی قرض لے کر خود مالک مال کو قیمت ادا کرے یا بینک سے قرض لینے کا معاملہ کرے مثلاً اس طرح معاملہ کرے کہ تم مالک مال (بائع) کو میری طرف سے قیمت ادا کر دیا کرو بیس بعد میں تم کو ادا کر دیا کروں گا۔ تو بیشک یہ دونوں معاملہ قرض کے ہوں گے۔ پہلا خالص قرض کا اور دوسرا قرض اور وکالت دونوں کا ہوگا۔ اور ان دونوں صورتوں میں بینک اپنے دیئے ہوئے روپیہ سے زائد رقم جو خریدار سے وصول کرے گا۔ وہ بلاشبہ سود ہوگی، اور اس صورت میں بیشک سود دینے کا ارتکاب خریدار سے ہوگا جس کی اجازت بغیر شدید حاجت کے نہ ہوگی، مثلاً بغیر قرض لئے ہوئے کام نہ چلتا ہو، اور بینک کے علاوہ کہیں سے قرض نہ ملتا ہو یا ملتا ہو مگر باعتبار بینک کے سود زیادہ دینا پڑتا ہو، الغرض اس جواب ضمیمہ میں جن جن صورتوں

میں نفع کو سود کہا گیا ہے وہ شرعی مفہوم و مصداق کے اعتبار سے کہا گیا ہے اس کی حرمت ہر ملک اور ہر زمانہ کے اعتبار سے علی الاطلاق ہے، اخیر ضمیمہ میں ان سرکاری قرضوں کو جن جن صورتوں میں بانٹا گیا ہے، ان میں سے کوئی صورت بھی ہو، جب اس پر سود کا شرعی مفہوم صادق آجائے گا تو اس کو ربوائے محرم سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے، اسی طرح حضرت مولانا جعفر شاہ صاحب نے اس ربوا کو جس کی حرمت قرآن پاک میں منصوص ہے، یوزری کے ساتھ خاص فرمایا ہے۔ اگرچہ سوالنامہ پورا حاصل نہ ہونے کی وجہ سے نیز آکسفورڈ ڈکشنری بھی سامنے نہ ہونے کی وجہ سے حضرت موصوف کی مراد متعین نہیں ہوئی۔ لیکن دوسری اس فن کی معتبر کتاب ڈآوٹ لائن آف اکنامکس) مصنفہ منی موہن سین ودیا ساگر کالج کلکتہ مطبوعہ ۱۹۲۷ء میں یوزری (USURY) کے یہ تین معنی لکھے ہیں۔

۱؎ سود خوری۔ ۲؎ مروجہ قانونی شرح سے زیادہ سود لینا۔

۳؎۔ بہت بھاری سود لینا (عموماً)

یوزری کے انہی تین معنی میں سے کوئی معنیٰ مراد لینا یا اس کے علاوہ کوئی بھی معنی لینا آیات حرمت ربوا میں ربوا کو اس کے ساتھ مخصوص کر لینا اس وجہ سے صحیح نہ ہوگا کہ جب کہ شارع علیہ السلام نے خود ربوا کے معنی کی تشریح یا نشاندہی اس انداز سے فرمادی جس میں ہر طرح کا اطلاق ہے تو اب کسی دوسرے شخص کو اس کے تقیید یا تخصیص کا حق نہیں پہنچتا۔ چنانچہ مشہور حدیث کے جسکو مسلم شریف و ابوداؤد و نسائی و ترمذی و ابن ماجہ سبھی نے نقل کیا ہے، الفاظ یہ ہیں۔

عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم

الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواءً بسواء یداً بید (ای) والفضل ربوا۔ (فتح القدیر ص۲۷۵ ج۵)۔

علت حکم جو چیز بھی ہو، اتنی بات تو ظاہر ہے کہ ان چھ چیزوں میں سے جب کوئی چیز اپنی جنس کے عوض میں بیچی جائے یا بدلی جائے یا بطور قرض لیجائے یا دی جائے تو کسی قسم کی زیادتی بھی ہو وہ مطلقاً ربوائے محرم ہوگی خواہ وہ مبادلہ (قرض) پیداوار کی صلاحیت بڑھانے کی نیت سے ہو یا کسی انسانی بنیادی ضرورت کی تکمیل کے لئے ہو، خواہ قرضدار کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا مقصود نہ ہو بلکہ نفع پہنچانا مقصود ہو، خواہ بھاری سود یا سودخوری وغیرہ سے بالکل خالی و صاف ہو، غرض ہر حال میں وہ زیادتی ربوا ہی شمار ہوگی اور دائرۂ حرمت سے باہر نہ ہوگی۔ ہاں اگر دربار رسالت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کی اتنی صاف تصریح اور وضاحت نہ ہوتی، اور پھر کوئی مناسب تاویل قائم ہوجاتی تو گنجائش بھی ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کا حکم شارع علیہ السلام اطلاق وعموم کے ساتھ صاف و واضح لفظوں میں بیان فرمادیں تو کسی بشر کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ اس میں بغیر کسی نص کی مدد کے کوئی تقیید یا تخصیص یا کسی قسم کی تغیر وغیرہ کرسکے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب اشکال یہ ہے کہ جب شارع علیہ السلام نے ربوا کا مفہوم اس طرح اطلاق اور عموم کے ساتھ صاف اور واضح بیان فرمادیا ہے تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمانے کا کیا مقصد ہے ان آخر ما نزلت آیۃ الربوٰ وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قبض ولم یفسرھا لنا فدعوا الربٰو والریبۃ۔

(ابن ماجہ والدارمی مشکوٰۃ)

جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آیت ربوا مجمل ہے یا اس کے مفہوم و مصداق میں گنجلک ہے، جس کی وجہ سے تقاضائے آیت پر عمل کرنے میں دشواری ہے، یہ مفہوم تو ایک معمولی انسان بھی نہیں لے سکتا چہ جائیکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (نعوذ باللہ من ذٰلک) جیسا جلیل القدر اور قوی الایمان صحابی۔ اس لئے کہ اس میں کھلا اعتراض اسلام و تعلیمات اسلام پر ہوتا ہے اور اس کی زد ذات باری عز اسمہ پر پہنچتی ہے، وتعالی اللہ ذٰلک علوا کبیر۔

بلکہ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ آیت ربوا آیت محکمہ ہے، اس میں نسخ و تغیر وغیرہ کسی چیز کا احتمال نہیں ہے، اور نہایت واضح اور مفسر ہے اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر نہیں فرمائی، اور اتنی اہم ہے اور خوفناک ہے کہ جو چیزیں صریح ربوا ہیں ان کو تو چھوڑنا ہی ہے، جن چیزوں میں شبہ ربوا ہو ان کو بھی چھوڑ دینا ہے۔

چنانچہ علامہ طیبیؒ اسی مفہوم کو ان لفظوں میں ادا فرماتے ہیں۔

ان ھذہ الاٰیۃ ثابتۃ غیر منسوخۃ غیر مشتبھۃ ولذٰلک لم یفسرھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاجروھا علی ماھی علیہ ولا ترتابوا فیھا واترکوا الحیلۃ فی حل الربوا۔

اور خود حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس جملہ فدعوا الربوا والریبۃ سے بھی اسی مفہوم کا پتہ لگتا ہے۔

اسی طرح الامور بمقاصدھا میں امور سے وہ امور مراد ہیں جن کا

حسن و قبح یا جن کا حکم حلت و حرمت منصوص نہ ہو تو اس کا حسن و قبح یا حکم ان کے مقاصد سے نکل سکتا ہے نہ یہ کہ سارے ہی امور و احکام کا مدار ان ہی مقاصد پر ہو، اگر ایسا ہو تو دین کی اور حدود اللہ کی ساری ہی عمارت منہدم ہو کر رہ جائے گی۔

اسی طرح الضرورات تبیح المحظورات میں بھی الف و لام عہد کا ہے اور وہ ضرورتیں مراد ہیں (الاشباہ ص۱۰۰) جو ملجی اور منجر ہو جاتی ہیں، اضطرار اور مخمصہ تک، نہ کہ تمام ہی ضرورتوں کا یہی حکم ہو، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ اس سے اگلا جملہ (ومن ثم جاز اکل المیتۃ عند المخمصۃ) جو بالکل اس قاعدہ سے متصل اور اسی کی تمثیل ہے۔ اس کی وضاحت کر رہا ہے، جیسا کہ سابق جواب میں بھی ہم اس کی وضاحت کر آئے ہیں۔

الغرض جس معاملہ پر سود کا مفہوم شرعی صادق آجائے جس طرح اس کو غیر سود یا مباح و جائز کہنا درست و جائز نہیں ہوگا، اسی طرح جس معاملہ پر سود کا مفہوم شرعی صادق نہ آوے اس کو سود یا حرام کہنا درست و مباح نہ ہوگا، بلکہ ان فروق کا واضح کرنا ہمیشہ اور ہر زمانہ کے علماء و مشائخ پر ضروری رہے گا تاکہ دین متین کی جامعیت اور جاذبیت و ہمہ گیری و ہر دلعزیزی نیز الحلال بین و الحرام بین اور الدین یسر ہمیشہ ہمیشہ نمایاں و غالب رہے۔ اس تمام تر گفتگو سے قرض کی قسم اول (حکومتوں کا خود قرض لینا) کا حکم بھی خود بخود نکل آیا، اور اسی تفصیل پر جو اوپر گذری اس کو منطبق کر لینا کافی ہو سکتا ہے، اس لئے فقط ایک بات اس کے متعلق عرض کر کے جواب ختم کرتا ہوں۔

اور وہ یہ ہے کہ اگر حکومت کو اندرون ملک کے باشندوں سے قرض لینا ہو تو سود پر نہ لینا چاہئے، بلکہ جہاں تک ہو سکے باشندگان ملک کے سامنے مکمل ضروریات رکھ کر ہمدردی کی ترغیب وتحریض دلاکر بطور قرض حسنہ (غیر سودی قرض) لینا چاہئے۔ افراد ملک پر بھی اخلاقاً ضروری ہے خاصکر صاحب سرمایہ وصاحب حیثیت اصحاب پر کہ وہ ملک کی مضبوطی وترقی کے لئے حکومت کو قرض حسنہ (قرضہ غیر سودی) دیں کہ ملک کی اور اہل ملک کی ہمدردی وبہی خواہی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

۲۷/۷/۹۱ھ

ملکی ترقی کی سرکاری اسکیموں میں مسلمانوں کی شرکت

سوال (۵۹) عرض یہ ہے کہ چند امور قابل استفسار ہیں، اس کا جواب جس قدر بہ سہولت تمام ممکن ہو عنایت فرمادیں!

(۱) سرکار ہند نے ملک کی ترقی کیلئے اسکیمیں کھولی ہیں، اور ان کے واسطے روپیہ کی فراہمی کے لئے سرٹیفکٹ ایجاد کرتے ہیں۔ جو لوگ سرٹیفکٹ خریدتے ہیں، ان کو سود ہر سال مل سکتا ہے، ان کا راس المال تین سال یا سات سال پر واپس مل سکتا ہے۔ یہ روپیہ سرکار اسکیم میں لگاتی ہے، لوگ روپیہ کی حفاظت کی نیت سے اور اس نیت سے بھی کچھ اضافہ بطور سود ہو جاوے گا۔ روپیہ دے کر سرٹیفکٹ خریدتے ہیں، روپیہ فوراً نہیں مل سکتا۔ اور نہ تین سال کے پہلے مل سکتا ہے۔ آیا ایسے روپیہ پر زکوٰۃ فوراً ہر سال ادا کرنے کا حکم ہے یا کس طرح اسکی ایک زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم ہے۔

م ۲ ۔ آیا غیر مسلم حکومت ہونے کی حیثیت سے سود لیا جا سکتا ہے اور وہ سود ہر کام میں لگا سکتے ہیں ۔ سرکار ججوں سے وکیلوں سے اور زمینداروں سے آدمی پر زمینداری پر و مکان پر ٹیکس لیتی ہے ۔

م ۳ ۔ م ۴ ۔ کئی کمپنی چھٹی ڈالنے کی کھلی ہے، جو غیر مسلم کی نہیں، آیا چھٹی ڈالنا ایسی کمپنی میں شرعاً جائز ہے؟ چونکہ کچھ لوگ اس ملک کو دار الحرب کہتے ہیں، آیا اب چھٹی ڈالنا یا عشر بند کرنا شرعاً جائز ہے، گھر میں لڑکی و داماد سلام عرض کرتے ہیں ۔

م ۵ ۔ ایک بات کہنا بھول گیا، میری نوری صبیحہ سلام کہتی ہے جب وہ ہائی اسکول کا امتحان دے رہی تھی تو وہ منت مانگا کہ میں ۵۵ روزہ رکھوں گی پاس ہونے پر وہ پاس ہوگئی، مگر اس نے صرف اب تک ۸ روزے رکھی اور روزے پاس ہونے کے بعد اب تک پورے نہیں ہوئے صرف ۸ روزے رکھی ہے اتنے میں وہ اونچے درجے پوزے مینا پہنچ گئی ۔ اور ۲ سال پوزے مینا پڑھتی رہی، مگر اس مدت ہی میں وہ منت کے روزے پورے نہ کر سکی، پوزے مینا کا آخری امتحان دیا، مگر اس میں فیل ہو گئی اب تکمیل کے روزے ہائی اسکول کے باقی ہیں، اس میں اس کی نیت روزے کی تکمیل کی ہے ۔ مگر شاید پورے نہ کر سکے، چونکہ پوزے مینا کا امتحان ۶ اپریل ۱۹۷۱ء سے شروع ہے ۔ آیا صدقہ اور خیرات سے تلافی ان باقیماندہ روزہ کی ہو سکتی ہے، خیرات دینے کے بعد بھی اس کی پکی نیت منت روزہ رکھنے کی ہے ۔ اگر تلافی ہو جائے تو کس قدر اور کس طرح تلافی ہو سب مکمل تحریر فرما دیں کہ فی روزہ کتنا خیرات کر دے کہ تلافی ہو جائے ۔ اور گناہ نہ ہو، اور اللہ کی رضامندی کامل حاصل ہو جائے ۔ اور اس خیرات کے

بعد اس منت کے روزے پورا کرنے کی ہے۔ دعا رکریں کہ پوزے بینا ہیں پاس ہو جائے۔ فی روزہ کتنا خیرات کرے۔ آیا نقد صدقہ وخیرات سے مساکین کو کھانا کھلانا بہتر ہے کہ مساکین کو کھلا دے۔

اور فی مسکین کس قدر صدقہ وخیرات دے اور فی مسکین کو دو وقت کھانا کھلا دے یا صرف ایک وقت، غور فرما کر جواب عنایت فرما دیں۔

الجواب:- ۔ سرکار ہند نے ملک کی ترقی کے لئے جو اسکیمیں کھولی ہیں۔ ان میں مختلف کاروبار و بزنس کیا کرایا جاتا ہے اور عوام سے بذریعہ سرٹیفکٹ جو رقمیں لی جاتی ہیں، ان ہی کاروباروں میں اور بزنسوں میں خرچ کیا جاتا ہے، اس طرح یہ روپے بمنزلہ شیر (حصوں) کے ہو سکتے ہیں اور دینے والے شیر دار کہلائے جا سکتے ہیں۔ جس طرح دیگر کمپنیوں میں شیر اور شیر دار (حصہ اور حصہ دار) ہوتے ہیں۔ پھر ان کاروباروں بزنسوں سے جو نفع ہوتا ہے، نفع ان شیر داروں کو دیتی ہے یہ تاویل کی جا سکتی ہے، لہٰذا سود کا نام رکھنے سے اس کا سود ہونا ضروری نہیں جس طرح پرائیوٹ فنڈ وغیرہ میں سود کا نام رکھنے سے سود نہیں ہوتا۔

امداد الفتاویٰ میں حضرت تھانویؒ بھی اس حق میں ہیں کہ سود کا نام رکھنے سے سود ہونا ضروری نہیں اور یہ صحیح بھی ہے۔ اس لئے کہ سود (ربوا) شرعی لفظ اور شرعی اصطلاح ہے شرعی مفہوم رکھتا ہے۔ جب تک وہ مفہوم شرعاً صادق نہ آئے گا، کسی کے سود کہنے سے سود نہ ہوگا، پس جن علماء کے نزدیک یہ تاویلات و توجیہات صحیح ہیں، وہ ان اسکیموں میں حصہ لینے اور اس کے نفع کو جائز کہتے ہیں، اور جن علماء کے نزدیک تاویلیں صحیح نہیں وہ ناجائز فرماتے ہیں۔ اور احقر کا رجحان بھی بحالت موجودہ جواز کی طرف ہے۔

اور جب وہ شخص وہ روپیہ حقیقت میں کاروبار و بزنس میں لگاتا ہے یا لگانے کے لئے دے سکتے ہیں، اس لئے اس کو زکوٰۃ بھی اپنے اور سرمایہ کے اندر لگے ہوئے روپیوں کی طرح دینی ہوگی۔

۲ ۔ جو نفع شرعی مفہوم کے اعتبار سے سود (ربوا) ہے اس کا لینا دار الحرب میں اور غیر مسلم سے ہر ایک سے لینا ناجائز ہے اور حرام ہے۔ سود لینے پر بڑی سخت وعیدیں احادیث پاک و قرآن پاک میں وارد ہیں امام صاحب فرماتے ہیں کہ پورے قرآن پاک میں مجھے اس سے اور کوئی آیت معاصی کے سلسلے میں خوفناک نظر نہیں آتی۔ کما فی احمد احکام تحت آیت الربوا۔ اور اسی وجہ سے ان محکموں میں جو علماء شرکت جائز فرماتے ہیں، غایت احتیاط کا حکم دیتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے بچا جائے، ایسے کاموں میں بدرجہ مجبوری ہی شرکت کی جائے۔

۳ ۔ چھٹی ڈالنے کی کمپنیوں کی ذرا وضاحت فرمایئے — بہرحال اگر ان کمپنیوں میں بزنس اور کاروبار ہوتا ہے تو اس کی نوعیت اور حکم دوسرا ہوسکتا ہے، اور بالکل لاٹری والا معاملہ ہو تو دوسرا ہوسکتا ہے۔

۴ ۔ رہ گیا عشر کا مسئلہ ختم زمینداری کے بعد سے جہاں کا زمیندارہ حکومت نے ختم کردیا۔ وہاں حکومت ارضیات کاشت کی مالک ہوگئی۔ مسئلہ استیلاء کے ماتحت وہ زمین مثل اراضی محوزہ سلطانی ملک سرکار ہوگئیں اور عشر ختم ہوگیا۔ باقی جس قدر بھی کوئی شخص بطور خیر خیرات نکالدے گا۔ باعث خیر و برکت ہی ہوگا اور نکالنا بھی چاہیئے۔ مگر وجوب عشر نہ ہونے کی وجہ سے عدم ادائیگی میں گناہ نہ ہوگا اور ادائیگی میں ثواب ہوگا۔

۵ ۔ منت کے روزوں کا بدل فدیہ نہیں ہوتا وہ تو ادا ہی کرنا ہوگا۔

چونکہ کسی زمانہ یا مدت کے ساتھ محدود نہیں کیا، اس لئے موت سے پہلے جب بھی روزے رکھ لیں گی، ادا قرار دیا جائے گا۔ بے وجہ شرعی تاخیر سے بُرائی اور اسارت طاری ہوگی۔ فدیہ تو صرف فرض رمضان کے روزوں کے بارے میں شیخ فانی کیلئے ہے اور ان لوگوں کے لئے ہے۔ جو حکم میں شیخ فانی کے ہوں۔ اس پر دوسرے روزوں کو قیاس نہیں کر سکتے، لہذا منت کے ان روزوں کے بدل میں قیمت وغیرہ کوئی چیز کافی نہ ہوگی۔ خیرات وغیرہ کرنے کے بعد بھی اس منت کا پورا کرنا اور روزہ ہی رکھ کر پورا کرنا بہر نوع واجب رہے گا۔ ہاں اب سے حسب موقع واستطاعت روزہ رکھنا شروع کر دیں اور آئندہ حسب موقع واستطاعت روزہ رکھنے کا عزم وتہیہ کر لیں۔ پھر بیماری وغیرہ عوارض کی وجہ سے جو تاخیر ہوگی وہ قابل معافی اب بھی ہو سکے گی۔

فقط والسلام مع الاحترام

بندہ نظام الدین عفرلہ دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح ۱۳ ۱۲/۹۰ ھ

سید احمد علی سعید ۔ دارالعلوم دیوبند ۔

قرآن مجید ہندی رسم الخط میں

سوال (۶۰) کسی شخص نے قرآن مجید کو ہندی رسم الخط میں اس طرح لکھا ہے کہ لکھنے اور پڑھنے میں عربی الفاظ و کلمات مسخ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً قرآن عربی ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے اس آیت کو ہندی رسم الخط میں یوں لکھا گیا ہے کہ اگر ہندی تحریر کو عربی میں لکھیں تو یوں آیت ہوگی (بسم ل للٰہ ہ رَرحمان ررحیماہ)۔

جو تحریراً بھی غلط اور قراءۃً بھی غلط ہے۔ اور عربی بسم اللہ میں لفظ اللہ کا الف اور الرحمٰن کا ال اور الرحیم کا ال کم ہے۔ اس طرح ہندی

بسم اللہ میں پانچ حروف کم کئے گئے ہیں، اور الرحمٰن کی (ر) اور الرحیم کی (ر) ڈبل لکھی گئی ہیں، جس کے معنی یہ ہوئے کہ دو (ر) کی زیادتی اور اضافہ کیا گیا ہے گویا ایک آیت مذکورہ میں سات غلطیاں ہیں، پورے قرآن مجید میں تو ہزاروں حروف کی کمی اور اضافہ ہے۔ اس طرح پورا قرآن مجید عربی میں ترمیم و تنسیخ کرکے قرآن مسخ کیا گیا ہے۔

اور اس کو ہندی قرآن نام دیا گیا ہے، کیا ایسی صورت میں اس ہندی قرآن کا لکھنا اور پڑھنا جائز ہے یا کہ ناجائز؟ اور لکھنے الا ماسخ قرآن ہے یا کہ نہیں؟ اور یہ حرکت تمسخر قرآن میں داخل ہے کہ نہیں؟ ادر لکھنے والے کو اور پڑھنے والے کو اور پڑھنے والے کو مؤمن اور مسلمان کہا جا سکتا ہے یا کہ نہیں۔؟ بینوا و توجروا۔

(نوٹ) اس کی تحسین و تعریف کرنے والے کو شرعاً کیا کہا جائے گا؟

الجواب:- قرآن کریم نام یعنی عَلَم خاص ہے اس کلام الٰہی کا جو عربی زبان میں بذریعہ جبرئیل علیہ السلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر منجانب خدا نازل کیا گیا ہے، اور اس کے تمام کلمات و حروف و زیر و زبر و پیش، جزم و تشدید وغیرہ سب ہی چیزیں متعین و معلوم ہیں۔ اس کا رسم الخط بھی علیحدہ و متعین ہے۔ ایک خاص انداز سے مکتوب ہے، اس کا نطق و تکلم بھی نرالی شان رکھتا ہے اور ان تمام کیفیات و خصوصیات کے ساتھ لوح محفوظ میں موجود و محفوظ ہے۔ اور اس کے تمام احکام الگ اور ممتاز ہیں، کسی کے لئے اس کا بغیر طہارت چھونا بھی جائز نہیں ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔ الٓر تلك آیات الکتب المبین ٥ انا انزلناه قرآنا عربیا لعلکم تعقلون (پ ۱۲ سورہ یوسف) اور ایک مقام پر

اس طرح مذکور ہے۔ انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون لایمسہ الا المطھرون تنزیل من رب العلمین (سورہ واقعہ پ ۲۷) اور ایک جگہ اس طرح ارشاد ہے بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ (سورہ بروج پ ۳۰) اور تفسیر روح المعانی کے مصنف (ص ۱۱ ج ۱ میں) قرآن کریم کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں والقرآن کلام اللہ تعالیٰ المنزل بھذہ المعنی فھو کلمات غیبیۃ مجردۃ عن المواد مترتبۃ فی علم اللہ تعالیٰ ازلاً غیر متعاقبۃ تحقیقا بل تقدیرا عند تلاوۃ علی الالسنۃ من غیر کونیۃ الزمانیۃ (الی قولہ) وھنا قال السلفون۔ القرآن کلام اللہ تعالیٰ غیر مخلوق مکتوب فی المصاحف محفوظ فی الصدور مقروء بالالسن مسموع بالاذن غیر حال فی شیٔ منہا وھو فی جمیع ھذہ المراتب قرآن حقیقۃ شرعیۃ معلوم من الدین بالضرورۃ وھکذا الی غایۃ تفسیر المحققین؎

ان آیات کریمہ و عبارات نیز دوسرے مفسرین محققین و روایات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں توقیفی ہیں ان میں ایک زیر یا زبر بلکہ ایک نقطہ کی بھی کمی بیشی جائز نہیں ہے۔ اور ان قراتوں کے علاوہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں کسی نوع کا تغیر و تبدل جائز نہیں ہے اگرچہ عربی زبان اور عربی عبارت باقی کیوں نہ رہے۔ پھر ایسی تبدیلی و تغیر جس میں عربی زبان یا عربی رسم الخط وغیرہ تک متغیر و متبدل ہو جائیں کب اور کیوں کر درست و مباح ہو سکتا ہے ففی الاتقان للسیوطی لم یجوز احد من الائمۃ الاربعۃ کتابۃ القرآن بغیر العربی بمیراہ

پس سوال میں جو جو خرابیاں لکھی ہوئی ہیں ان کے ساتھ تو لکھنا یا پڑھنا

یا اس کو قرآن کریم کہنا کسی طرح درست نہیں ہے سخت گناہ اور قطعی حرام ہے اور بڑی خطرناک قسم کی جرآت ہے اگر دیدہ و دانستہ کوئی شخص اس طرح لکھے یا پڑھے تو اس کے محرّف قرآن و ماسخ قرآن کریم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اسی طرح اس کو جائز سمجھنا یا اس کی رعایت کرنا بھی شدید جرم اور حرام ہے، مذکورہ طریقہ پر ہندی رسم الخط یا انگریزی یا بنگلہ یا برمی یا چینی الغرض کسی بھی دوسری زبان کے رسم الخط میں قرآن کریم کو لکھنا جس میں قرآنی رسم الخط و تلفظ و اداکی خصوصیات محفوظ نہ رہیں۔ اور پھر اس کو اس زبان کی طرف منسوب کرکے ہندی قرآن یا انگریزی قرآن یا بنگلہ یا برمی یا چینی قرآن کہنا قرآن کریم و کلام الٰہی کی توہین و تحقیر ہے اور تحریف کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس قسم کی خرابیوں کی روک تھام کریں۔ اور اس کی اصلاح کرنے کی ہر مناسب تدبیر اختیار کریں اور پوری کوشش کریں۔

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جو لوگ عربی رسم الخط سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ناظرہ بھی نہ پڑھ سکتے ہوں اور وہ تلاوت کلام الٰہی کرنا چاہتے ہوں۔ ان کی تعلیم و تلقین کے لئے ازلی قرآن کریم سرخوض یعنی سرصفحہ نمایاں کرکے اس طرح لکھا جائے کہ اس کا اصل ہونا اور اس کی متبوعیت و عظمت اور اس کا پورا ادب و احترام محفوظ و ملحوظ رہے اور اس کے نیچے تابع بناکر کسی بھی زبان کے رسم الخط میں اتنی ہی عبارت قرآن کریم کی اس طرح پر لکھیں کہ قرآن کریم کے تمام خصوصی حروف مثلاً س، ص، ث اور ز، ذ، ظ، ض اور ہمزہ عین وغیرہ اور اس کے تمام فروق اور امتیازات نیز تمام خصوصیات کتابت و ادا، وغیرہ مثلاً حروف زوائد (الف، لام، میم)، اور مد و جزم تشدید

واسکان وغیرہ کی پوری پوری رعایت موجود وملحوظ رہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ صورت اسی وقت ممکن ہوگی جب پہلے ان تمام خصوصیات کے لئے جامع مانع اصطلاحات وضع کرکے اس زبان کو مکمل کرلیا جائے پھر لکھا جائے ورنہ بغیر اس کے جواز واباحت نہ ہوگی، اور ان باتوں کے ساتھ ایک بات اور بھی ضروری اور لازمی رہے گی کہ اس عبارت کو قرآن کریم کا نام یا ہندی رسم الخط میں قرآن کا نام یا انگریزی یا بنگلہ وغیرہ کسی بھی رسم الخط میں قرآن کا نام ہرگز نہ دیا جائے بلکہ اصل قرآن کریم سے امتیاز اور تعارف کی غرض سے اور خلط وتلبیس وتحریف سے حفاظت کی غرض سے سرخی میں صرف یہ لکھا اور رکھا جائے مثلاً ہندی رسم الخط میں یا انگریزی، بنگلہ وغیرہ رسم الخط میں قرآن کریم کی تعلیم کا ذریعہ یا مثلاً ہندی رسم الخط میں یا فلاں رسم الخط میں قرآن کریم کا تعارف اور بس۔

قرآن کریم کا اس کو ہرگز نام نہ دیا جائے اگر ذرا بھی کسی عمل یا فعل سے قرآن کریم سے التباس ہوگا تو پھر اس کی اباحت وجواز کے لئے کوئی صورت نہ رہے گی۔ ان تمام احتیاطوں کے ساتھ اس زیر متن عبارت کی حیثیت وہی ہوجائے گی جو قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر کی ہوتی ہے جو عربی زبان یا غیر عربی زبان میں متن قرآن کے ساتھ تابع بناکر لکھ دی جاتی ہے اور جسے قرآن کا نام نہیں دیتے، صرف ترجمہ قرآن کریم یا تفسیر قرآن کریم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ هٰذا ما عندی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

الجواب صحیح۔	الجواب صحیح	دارالعلوم دیوبند
محمود غفرلہ	سید احمد علی سعید	۱۰/۷/۹۰ھ

ذبیحہ کا مشینی طریقہ

سوال (۶۱) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ یہاں بلاد عرب میں یورپ، بلغاریہ، کنیڈا وغیرہ ملکوں سے و نیز چین سے ذبح شدہ مرغیوں وغیرہ کا گوشت آتا ہے، یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہاں مشینوں کے ذریعہ ذبح، سلخ، تصلیح ہوتا ہے، انسان صرف بٹن دبا کر مشین کو چالو کرتے ہیں۔ اب خدا جانے کہ "بسم اللہ، اللہ اکبر" مشین چلاتے وقت یا ذبح کرتے وقت کہتے ہیں یا نہ۔ البتہ بعض پر لکھا ہوتا ہے کہ بطریق اسلامی ذبح کیا ہوا ہے، لیکن سوائے اس تحریر کے اور کوئی شہادت اس بات کی نہیں ہے کہ واقعی اس پر اسم اللہ لیا ہوا ہے یا نہیں، یہاں عرب ملکوں میں سب لوگ یہ گوشت کھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علماء نے حلت کا فتویٰ دیا ہوا ہے، علماء دین کھاتے ہیں مگر کچھ لوگ اس گوشت کے کھانے سے پرہیز کرتے ہیں، یعنی پاکستانی و ہندوستانی مسلمان اس سے شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں، وہ بھی شاذ و نادر لوگ۔

آیا اس مسئلہ میں تحقیقی حکم کیا ہے؟ دلائل و براہین واضحہ سے جواب تحریر فرمائیں، اگر سوال کا ترجمہ (خلاصہ) اور جواب عربی میں ہو تو بہتر ہے۔ بینوا و توجروا۔

الجواب:- یہ مسئلہ مصرح و مسلّم ہے کہ کسی حلال جانور پر بھی جب تک بوقت ذبح محض اللہ کا نام بغیر شرکت غیرے نہ لیا جائے حلال نہیں ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے کہ جو عیسائی بوقت ذبح اللہ کے نام کے ساتھ حضرت مسیحؑ کا نام بھی لے لیتے ہیں۔ ان کے اہل کتاب ہونے کے باوجود ان کا ذبیحہ حلال اور جائز نہیں کہا جاتا۔ اور جو یہودی اللہ کے نام کے سوا کسی اور کا نام نہیں لیتے ان کا ذبیحہ حلال و جائز کہا جاتا ہے،

حتیٰ کہ اگر کوئی مسلمان بھی بوقت ذبح اللہ کے نام کے ساتھ یا اللہ کے نام کے سوا کسی اور کا نام لے لے تو اس کا ذبیحہ بھی حلال نہیں رہتا۔

اس قاعدہ کے سمجھنے کے بعد یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ جس بٹن کے دبانے سے جانور کے گردن پر چھری چلتی ہے، اس بٹن کا چھری چلانے کے لئے دبانے والا "بسم اللہ اللہ اکبر" محض (اللہ کا نام) لے کر بٹن دبائے اور مسلمان ہو یا اہل کتاب (مثلاً یہودی) ہو، اسی طرح جو لوگ چھری چلنے کے وقت جانور پر کنٹرول کرتے ہیں کہ چھری بھکنے نہ پائے جانور کی گردن ہی پر چلے وہ لوگ مسلمان یا اہل کتاب (مثلاً یہودی) ہوں اور کنٹرول کرتے وقت "بسم اللہ اللہ اکبر" محض اللہ کا نام) لے کر کنٹرول کریں تو یہ طریقہ اور عمل اگرچہ ذبح کے مسنون طریقہ (طریق مسنون) نہ ہونے کی وجہ سے مکروہ مگر اس عمل سے اگر ذبیحہ کی اکثر رگیں کٹ کر سارا خون نکل جاتا ہو تو ذبیحہ حلال ہو جائے گا اور اس کا کھانا بھی درست رہے گا ذبح کی رگیں چار ہیں حلقوم، ودجین، مری۔ ان میں سے کم از کم تین رگوں کا کٹ جانا ضروری ہے۔

تیسری بات یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ جملہ (بطریق اسلامی ذبح کیا ہوا ہے) کا ظاہر و متبادر مفہوم یہ ہے کہ اسلامی حکم کے مطابق ذبیحہ کا حلال و جائز ہونے کی جو شرائط و قیود ہیں اس کے مطابق ذبح کیا ہوا ہے۔ پس اگر اس جملہ (بطریق اسلامی الخ) سے اس کے لکھنے والے بھی یہی مفہوم مراد لیتے ہوں اور قرائن اس مفہوم کا سچ و صحیح ہونے پر شہادت دیتے ہوں تو چونکہ مسلمان ان مذکورہ مقامات (یورپ وغیرہ) میں بھی شرعی احکام جاننے والے ملتے ہیں۔ اور حکومت بھی اس کا انتظام کر سکتی ہے اور فریب و دھوکہ دینا خود اصول تجارت کے بھی خلاف ہے۔ پس اگر قرائن سے سچ ہونے کا ظن غالب ہو جائے تو جن پیکٹوں پر یہ جملہ

(بطریق اسلامی الخ) لکھا ہوا ہو، اس کو کھانے کی گنجائش ہوگی، جب تک کہ شہادت یا ثبوت شرعی سے اس کے خلاف ثابت نہ ہو جائے، لیکن احتیاط بہرحال اس سے بھی اجتناب و احتیاط کرنے ہی میں ہوگی۔

اور جن پیکٹوں پر یہ جملہ (بطریق اسلامی) یا اس کے ہم معنی کوئی جملہ یا چیز موجود نہ ہو، جس سے شرعی اصول و ضابطہ کے مطابق اس کے جائز و حلال ہونے کا ظن غالب ہو جائے کھانا درست نہ ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

مفتی دارالعلوم دیوبند

مرتد مسلمان کے ترکہ کا وارث نہیں

سوال (۶۲) کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ ایک لڑکی نہایت متقی حنفی المذہب مسلمان (مرحوم) کی بیٹی ہے، اسلامی قانون وراثت کے تحت مرحوم کی متروکہ جائداد میں سے کچھ غیر منقولہ جائداد لڑکی کو حصہ میں مل سکتی ہے، اگر یہ خاتون اپنے خاوند کے مرزائی قادیانی ہونے کی وجہ سے خود بھی قادیانی ہو جائے یا قادیانی نہ ہو مگر اپنے مرتد خاوند کا ساتھ نہ چھوڑے تو کیا وہ بموجب شرع محمدی بدستور جائداد کی وارث بن سکتی ہے اور کیا ایک مسلمان کی متروکہ جائداد ایک مرتد کو منتقل ہو سکتی ہے؟ جب کہ مرحوم کی اور اولاد نرینہ اہل السنت والجماعت موجود ہو؟ بینوا توجروا۔

الجواب:- جو شخص (مرد یا عورت) پہلے مسلمان تھا پھر قادیانی ہو گیا وہ مرتد ہے اور جو شخص (مرد یا عورت) پیدائشی طور پر قادیانی ہو وہ غیر مسلم (کافر) ہے اور جب وارث اور مورث میں دین کا اختلاف کفر و اسلام سے ہو تو وراثت نہیں ملتی، پس کوئی وارث مرتد ہو یا کافر (غیر مسلم)

وہ وارث نہیں ہوسکتا، سراجی موانع الارث میں مانع وراثت و اختلاف الدین لکھا ہے وھکذا فی عامۃ کتب الفقہ اور یہ اجماعی مسئلہ ہے بقولہ تعالیٰ ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا الایہ ولقولہ علیہ السلام لا یتوارث اھل ملتین شئی (رواہ ابوداؤد والدارمی وغیرھما) پس یہ لڑکی جو قادیانی کے ساتھ کی وجہ سے خود بھی قادیانی ہوگئی اور تائب ہوکر اسلام میں لوٹ کر نہیں آئی وہ اپنے باپ کے ترکہ میں ہرگز وارث نہیں ہوسکتی قطعاً محروم رہے گی، نیز مرتدہ تو شرع اسلامی میں کسی سے وراثت نہیں پاسکتی ھکذا فی الشامی

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین
مفتی دارالعلوم دیوبند

مرتد سے نکاح فسخ ہوگیا

سوال (۶۳) زید نے جو اہل السنت مسلمان تھا یا اپنے آپ کو سنی مسلمان ظاہر کرتا تھا، کئی سال پہلے ایک سنی لڑکی سے شادی کی۔ نکاح حنفی المذہب عالم نے پڑھایا، کچھ عرصہ کے بعد مختلف اثرات کے ماتحت زید پکا مرزائی قادیانی ہوگیا۔ اس عرصہ میں اس کی اولاد بھی ہوئی جس میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں بقید حیات ہیں۔ اس کی بیوی بدستور سنی رہی اور ہے، کئی دفعہ اسے ربوہ جاکر مرزائی خلیفہ سے بیعت کرانے پر مجبور کیا مگر اس نے انکار کر دیا۔ اب ملک کی نمائندہ جماعت اور جمہور اہل اسلام کے فیصلہ کے بعد جب مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دیا جاچکا ہے زید کو توبہ کرنے کا مشورہ دیا گیا مگر وہ اپنے مرتد رہنے پر مصر ہے۔ کیا اس کے بعد زید کا نکاح مسلمان خاتون سے قائم رہے گا

اور کیا یہ ضروری ہے کہ زید اسے طلاق دے یا طلاق خود بخود واقع ہوجائیگی بینوا و توجروا۔

الجواب: - حاصل سوال یہ ہے کہ بوقت نکاح زوجین مسلمان تھے بعد میں شوہر قادیانی ہوکر مرتد ہوگیا، اس کا حکم شرع اسلام میں یہ ہے کہ شوہر کے مرتد ہوتے ہی اس کا نکاح ٹوٹ گیا اور منکوحہ مسلمہ اس کے نکاح سے خود بخود بالکل خارج ہوگئی۔ طلاق وغیرہ کے دینے کی حاجت یا شرط نہیں رہی بلکہ منکوحہ اس کے نکاح سے نکل کر آزاد ہوگئی اور نفقۂ عدت اور کامل مہر کی بھی مستحق رہی۔ فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ص ۳۹۲ ج ۲ ای ارتداد احدهما فسخ عاجل بلا قضا فللموطوءة کل مهرها و بغیرها نصفه لو ای ارتد و علیه نفقة العدة۔ بالخصوص جبکہ سمجھانے اور توبہ کا مشورہ دینے کے بعد بھی وہ مرتد (قادیانی) رہنے پر مصر رہا تو یہ حکم اور بھی واضح ہوگیا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین

مفتی دار العلوم دیوبند

سوال (۴۴) سینما کے جواز پر ایک استدلال کا جواب

ایک صاحب کہتے ہیں کہ سینما میں تصاویر نہیں ہوتی بلکہ عکس اور سایہ ہوتا ہے، جیسے دھوپ یا روشنی میں کسی کا سایہ پڑتا ہے۔

الجواب: - سینما کی تصاویر کو عکس و سایہ قرار دینا اور دھوپ و روشنی کے عکس پر قیاس کرنا قطعاً درست نہیں ہے اور اس توجیہ سے سینما کے جواز پر استدلال کرنا بھی بے محل اور بے معنیٰ ہے، عکس اور سایہ صاحب عکس کا ایک عرض ہے جو اس کے ساتھ قائم رہتا ہے مستقل اس کی

کوئی حیثیت نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ ذی عکس جب روشنی یا دھوپ میں ہوتا ہے تو سایہ بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے اور جب وہاں سے چل دیتا ہے تو سایہ بھی اس کے ساتھ چل دیتا ہے۔ پس اگر سینما میں بھی یہی بات ہوتی کہ ایکٹر کی موجودگی میں اس کے عکس اور سایہ کو دکھایا جاتا اور محض سینما کا نام رکھ دیا جاتا تو اس کے ممانعت کی کوئی وجہ نہیں تھی مگر بات ایسی نہیں ہے بلکہ سینما میں ایکٹر کی تصویر اس کی ایکٹنگ اور اس کے پارٹ ادا کرنے کو فلمایا جاتا ہے۔ پہلے ان تمام پارٹوں کی تصویر لے لی جاتی ہے، پھر اس تصویر کو ریل میں مقید کر دیا جاتا ہے اور سینما دکھانے کے وقت اس مقید کردہ تصاویر اور ایکٹنگ کرنے والوں کی تصویر، ان کی شکل وصورت ان کے لباس کی وضع قطع اور ان کے پارٹ ادا کرنے کی ہیئت بجنسہٖ موجود ہوتی ہے، حالانکہ وہاں بذات خود ایکٹر کا وجود نہیں ہوتا۔ پس اسے عکس وسایہ قرار دینا کیسے درست ہوگا؟ اور اس کے ذریعہ سینما کے جواز پر کیسے استدلال قائم کیا جائے گا؟ عکس وسایہ اسی وقت تک عکس ہے جب تک اسے مستقل اور پائدار نہ بنایا جائے۔ مگر جب اسے کسی طرح سے پائدار بنا دیا گیا اور اس کی مستقل حیثیت ہوگئی تو پھر وہ عکس کے حکم سے نکل کر تصویر کے حکم میں داخل ہوگیا۔ اور جس طرح تصویر کا بنانا، اس سے تلعب اور تلذذ حرام ہے، اسی طرح سینما کا دیکھنا اس سے تلذذ حاصل کرنا بھی حرام ہوگا بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی محرمات اور مفاسد ہیں جن کی وجہ سے سینما کا دیکھنا حرام ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند

عرش، لوح، قلم، کرسی، نور مادی ہیں یا کیا ہیں؟

سوال (۶۵) عرش، لوح، قلم، کرسی، نور وغیرہ کیا ہیں؟ مادہ سے ان کا فرق بتایئے؟

الجواب:- یہ سب چیزیں جواہر مجردہ میں ہیں اور مادہ کا تعلق صرف عالم ناسوت تک محدود رہتا ہے، اور یہ سب چیزیں عالم ناسوت سے ورے کی ہیں، اس لئے مادی چیزوں پر ان کو قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے اگر قیاس کیا جائے تو غلطی ہوگی جیسے عقل کہ اس کے وجود سے انکار نہیں مگر مادی نہیں اور مادی اشیاء پر اس کو قیاس کرنا غلطی ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۲۱/۹/۹۱ھ

حجراسود اور اس کی اہمیت

سوال (۶۶) کہتے ہیں کہ حجراسود کو حضرت آدم علیہ السلام اپنے ساتھ جنت سے لائے تھے اگر یہ سب درست ہے تو پھر جنت میں مادی اشیاء موجود ہیں؟ اگر یہ دنیاوی سنگ ہے تو پھر ہمارے رسول ؐ نے اسے اتنی اہمیت کیوں دی؟ کوئی مسلمان اگر اسے ایک معمولی سا پتھر سمجھ کر اس کا بوسہ نہ لے تو کیا اس کا حج درست ہوگا۔

الجواب:- ممکن ہے کہ جواہر مجردہ میں سے ہو۔ اور جب دنیا میں اتارا گیا تو متصف بالمادہ کر دیا ہو، کیونکہ دنیا عالم مادیات سے ہے۔ اور جواہر مجردہ کا اتصاف بالمادہ ممکن ہے۔ جیسے روح جواہر مجردہ میں سے ہے، لیکن اس کا اتصاف باجسام الحیوان ہوتا ہے حالانکہ اجسام کا مادی ہونا ظاہر ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ (حجراسود) دنیاوی سنگ نہیں ہے کہ اس کو اس پر قیاس کیا جائے بلکہ یہ جنت کی ایک محبوب و معظم شئ ہے۔ اس لئے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایسی اہمیت دی ہے، پھر آپ کو حکم خداوندی

اسی طرح کا تھا۔ اور ایک امر تعبدی ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں، اور جب اس کا شئ محترم ہونا عقلاً ممکن ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملۂ احترام کا حکم دیا ہے تو اس کی تحقیر کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اصل احکم الحاکمین کے حکم کی نافرمانی ہوگی جو اپنے اندر شان بغاوت رکھے گی اس لئے یہ حرکت جائز نہ ہوگی۔ اور اس کا تقاضہ بیشک یہ ہے کہ ایسا کرنے سے حج ہی ادا نہ ہو، لیکن حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحیمی کا ظہور ہے کہ اس کا بوسہ نہ لینے سے کفارۂ جنایت بھی لازم نہ آئے گا، اور فریضہ حج ادا ہو جائے گا۔ فقط واللہ اعلم کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ۔

کیا ابلیس کی بیوی ہے

سوال (۶۷) جنت سے آدمؑ، حواؑ اور ابلیس کو نکالا گیا۔ آدمؑ اور حواؑ تو نر اور مادہ تھے، اس لئے ان کی نسل پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ لیکن ابلیس تو اکیلا تھا، پھر اس کی اولاد اس دنیا میں کیوں کر پھیلی؟

الجواب:۔ افزائش نسل کے لئے نر و مادہ کا اختلاط علت تامہ نہیں ہے بلکہ صرف امور عادیہ میں سے ہے، ورنہ خود حواء علیہا السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہاں سے پیدا ہوئے بلکہ خود آدم علیہ السلام کہاں سے پیدا ہوئے خود ابلیس کہاں سے پیدا ہوا۔ پس جس طرح سے یہ لوگ پیدا ہوئے ہیں، اس طرح بھی افزائش نسل ہو سکتی ہے، لہٰذا یہ اشکال تو ختم ہوا۔ پس جس طرح نسل انسانی کی افزائش کے لئے اللہ نے انسانوں میں مادہ پیدا فرمایا ہے اور ان سے ان کی نسل اور ذریات چل رہی ہے کہیں اسی طرح اس میں بھی کوئی مادہ پیدا فرما دیا ہو تو اس میں بھی کوئی اشکال نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ۔

ابلیس کو کتنا اختیار ہے

سوال (۶۸) ابلیس نے اولاد آدمؑ کو بہکانے کے لئے اللہ تعالیٰ سے کتنے اختیارات مانگے تھے؟ اور اسے ان کی اجازت کیوں مل گئی؟۔

الجواب:- مانگے جتنے بھی ہوں، لیکن ملے اتنے ہی جتنے کہ اگر انسان چاہے تو اپنی عقل سے بھی رد کر سکتا ہے اور اگر انبیاء علیہم السلام اور بالخصوص نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر صدق دل و اعتقاد سے عمل کرے اور یقین رکھے تو بالکل محفوظ بھی رہ سکتا ہے کما قال اللہ تعالیٰ

فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند

معراج میں سواری کیا تھی؟

سوال (۶۹) شب معراج میں جب ہمارے رسول آسمانوں میں تشریف لے گئے تو آپ نے بُراق (ایک اچھی سواری) چھوڑ کر سیڑھی پر چڑھنا کیوں پسند فرمایا۔ کیا یہ بات اللہ تعالیٰ کے محبوب کے شایان شان تھی۔؟

الجواب:- مکہ معظمہ سے بیت المقدس تک براق پر تشریف لے گئے اور وہاں سے رفرف پر، اور یہ تقسیم و تحدید خود اللہ رب العزت کی جانب سے تھی، سیڑھی والی روایت کہاں ہے اور اس سے کیا مراد ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند

۲۱/۹/۹۱ھ

جنات کا سلسلۂ نسب

سوال (۷۰) انسانوں کا سلسلہ آدمؑ اور حواؑ سے شروع ہوا، جناتوں کا شجرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ جنات کس قسم کے گناہ کرتے ہیں؟ ہمارے رسول کے علاوہ جنوں کے اور کتنے رسول ہوئے ہیں

الجواب:۔ جناتوں کا شجرہ ابوالجن سے شروع ہے۔ اس میں اگرچہ اختلاف ہے کہ وہ ابوالجن کون ہے؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابلیس ہی ہے۔ اور مسئلہ چونکہ موقوف علیہ نجات نہیں ہے اور نہ عقیدۂ ضروریہ سے متعلق ہے، اس لئے یہ اختلاف مضر نہیں۔ گناہ نام ہے حکم خداوندی کی نافرمانی کا، اور یہ مفہوم ہر حکم کے خلاف کرنے سے آجائیگا لہٰذا یہ سوال بے محل ہے۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کتنے رسول ان میں اور ہوئے اس کی تحدید منقول و مصرح نہیں۔ اور موقوف علیہ نجات نہ ہونے کی وجہ سے اس کا بتلانا یا جاننا بھی ضروری نہیں بلکہ اتنا کافی ہے کہ اللہ نے جتنے رسول ان کی ہدایت کے لئے مناسب قرار دیئے بھیجے ان میں ہمارے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ضرور شمار ہیں

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند

جنات اور انسانوں میں مناکحت

سوال (۷۱) جنات اور اہل کتاب میں مناکحت جائز ہے؟

الجواب:۔ اگر ان کی عورتیں بالشکل انسان ہوں تو بھی جائز نہ ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ۔ دارالعلوم دیوبند۔

سوال (۷۲) انسانی جسم خاک اور روح سے مل کر بنا ہے، جنات کو بھی موت آتی ہے۔ وہ کن دو چیزوں سے ملا کر بنایا گیا ہے۔

جنات کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟

الجواب:- جسم ناری ہے نار اور روح سے ملکر بنے ہیں اور اسی کے اعتبار سے ان پر موت بھی طاری ہوتی ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

سوال (۷۳) بہت سی بے اولاد مسلمان عورتیں ڈاکٹروں سے دوائیاں لے کر اس لئے کھاتی ہیں کہ ان کی گود ہری بھری ہو جائے۔

بانجھ عورت علاج کرا سکتی ہے؟

الجواب:- جائز ہے، اس لئے کہ وہ تکثیر امت کا اور منشاء ترغیب رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل کا ذریعہ ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔ تزوجو االودود او کما قال اور فرمایا گیا ہے تناکحوا دتباشروا وتناسلوا فانی مکاثر بکم الامم یوم القیمۃ وا دفخر او کما قال

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

سوال (۷۴) کچھ مسلمان نمازی بھی ہیں اور دوائیاں اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ ان کے گھر کوئی اولاد نہ ہو، بینوا و توجروا۔

اولاد کی پیدائش روکنے کیلئے دوا استعمال کرنا

الجواب:- ناجائز اور حرام ہے بچند وجوہ اول اس لئے کہ منشاء رسول وخدا کے خلاف ہے۔ دوسرے اس لئے کہ کمی رزق کے خطرہ سے ایسا اکثر کیا جاتا ہے جو ومامن دابۃ فی الارض الا علی اللہ

رزقہا و ہو یعلم مستقرہا و مستودعہا کی تعلیم کے خلاف ہے، نیز اس آیت کریمہ کے منشاء کے خلاف بھی ہے وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم ان یکونوا فقراء یغنیہم اللہ من فضلہ الآیۃ کے بھی خلاف ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۲۱ $\frac{9}{91}$ ھ

سوال (۷۵) | کیا عورت کی تخلیق مرد کی پسلی سے ہوئی ہے؟

حضرت حواء علیہا السلام کی پیدائش حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے ہوئی یا نہیں؟ اگر ہوئی تو برائے کرم حدیث کا وہ ٹکڑا مع عربی عبارت و حوالہ کتب نقل کریں۔

الجواب:- عن ابی ھریرۃ ؓ انہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استوصوا بالنساء خیرا فان المرأۃ خلقت من ضلع وان اعوج شئ فی الضلع اعلاہ الخ وعلی ہامش البخاری ص$\frac{469}{1}$ تحت قولہ النساء قیل ای اد ان اول نساء ھی حواء خلقت من ضلع من اضلاع آدم الخ وتحت قولہ من ضلع قیل فیہ اشارۃ الی ان حواء خلقت من ضلع آدم الایسر والی انہا لا تقبل التقویم بخاری ص$\frac{469}{1}$ - مذکورہ بالا حدیث اور اس کے تحت کی جانے والی تشریح سے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ حضرت حواء علیہا السلام کی پیدائش حضرت آدم علیہ السلام کے بائیں پسلی سے ہوئی تھی - فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دارالعلوم دیوبند

مجتہد کے لئے کیا شرائط ہیں ؟

سوال (۷۶) مجتہد ہونے کے لئے کیا کیا شرائط ہیں ؟

الجواب :- وشرطہ انہ لا بد لہ ان یعرف من الکتاب والسنۃ ما یتعلق بالاحکام ومواقع الاجماع وشرائط القیاس وکیفیۃ النظر وعلم العربیۃ والناسخ والمنسوخ وحال الرواۃ الخ (العقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید ص۲)۔

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ مجتہد کے لئے چند شرائط ہیں، پہلی شرط یہ ہے کہ اسے کتاب وسنت کے ان تمام حصوں سے جن سے احکام متعلق ہیں کماحقہ واقفیت ہو، (۲) مواقع اجماع سے واقف ہو کہ کہاں اور کن مواقع پر اجماع ہوا ہے تاکہ وہ اجماع کی موجودگی میں قیاس سے کوئی حکم مستنبط نہ کرے (۳) شرائط قیاس سے اچھی طرح واقف ہو تاکہ قیاس مع الفارق نہ کرے (۴) کیفیت نظر سے واقفیت رکھتا ہو تاکہ مسائل کے استنباط میں غلطی نہ کرے۔ (۵) لغت عربی پر کافی عبور رکھتا ہو تاکہ قرآن کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر اس سے مسائل مستنبط کرسکے، (۶) ناسخ اور منسوخ کو جانتا ہو، اور رواۃ کی حالت سے واقف ہو جن کے اندر مذکورہ بالا شرائط پائی جائے گی وہ مجتہد ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ الاحقر نظام الدین عفی عنہ

دارالعلوم دیوبند

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ پڑتا تھا

سوال (۷۷) نبی صلعم کے جسد مبارک کا سایہ تھا یا نہیں ؟ -

الجواب :- حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

جسد مبارک کا سایہ تھا جس حدیث سے سایہ کے نہ ہونے کا پتہ چلتا ہے محدثین نے اس کی تضعیف کی ہے عن انس بن مالکؓ قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوحی الی ان استاخر فاستاخرت ثم رأیت السماء فیما بینی وبینکم حتی رأیت ظلی وظلکم الحادی الارواح الی بلاد الافراح لابن القیم ص۲۰۳ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند

اللہ تعالیٰ کا جسم ہے یا نہیں ؟ اور آیات صفات کا کیا مطلب ہے ؟

سوال (۷۸) کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ مجسّم ہے یا غیر مجسّم ؟

۲۔ اگر غیر مجسم ہے تو سورۂ القلم تبٰرک الذی میں یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود فلا یستطیعون ہ (ترجمہ) جس دن کے کھولی جائے گی پنڈلی اور بلائے جائیں گے سجدہ کرنے کو پھر نہ کرسکیں ساق کے معنی پنڈلی صاف لکھے گئے، جس سے ایک تخیل پیدا ہو جاتا ہے ایسا کیوں ؟۔

۳۔ اگر خدا مجسم ہے تو یہ کہنا کہ اللہ دیکھتا ہے مگر آنکھ نہیں، اللہ سنتا ہے مگر کان نہیں ہے وغیرہ غلط ظاہر ہوتا ہے (نعوذ باللہ)

۴۔ اللہ تعالیٰ کو مجسم کہنے والا کافر ہے یا غیر مجسم کہنے والا۔؟

۵۔ اللہ تعالیٰ کا جہنم میں قدم رکھنے سے کیا مراد ہے، جیساکہ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھ دیں گے)۔

الجواب :- ۱۔ اللہ تعالیٰ جسم وجسمانیات سے پاک ہیں

تمام نقائص وعیوب سے منزّہ ہیں غیر مجسّم ہیں، آیت کریمہ ہے۔ اللّٰہ نور السمٰوات والارض (الآیہ) اور نور کے معنیٰ آتے ہیں ظاہر لنفسہٖ ومظہر لغیرہ۔

۲ و ۳۔ یوم یکشف عن ساق الآیہ میں یوم سے مراد یوم قیامت ہے اور ساق کے معنیٰ لغت میں مافوق القدم (پنڈلی) کے آتے ہیں اور کشف ساق اور تشمیر ساق (کپڑے اوپر کھینچ کر پنڈلی کھول لینا) یہ عرب کے محاورہ میں ایک مثل ہے، اس وقت بولتے ہیں جب کہ کام کی انتہائی شدت، اور حالات کی انتہائی سختی وصعوبت ظاہر کرنی ہوتی ہے، چنانچہ جاہلیت عرب کے امثال میں یہ کلام دائر سائر ہے کہ قامت الحرب علیٰ ساق (روح المعانی) اور یہ اشعار بھی اسی معنیٰ میں ہیں۔ شعر

اخو الحرب ان عضت بہ الحرب عضھا

وان شمرت عن ساقھا الحرب شمرا

فی سنۃ قد کشف عن ساقھا

حمراء تبری اللحم عن عراقھا

اس محاورہ کے اعتبار سے بیان فرمایا گیا ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ جس دن تمام حالات ومعاملات کی حقیقت منکشف ہو جائے گی، اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا (تمہیں اس دن سے ڈرنا چاہیے) پھر وہ حال بعد میں مذکور ہے، اور غرض اس آیت سے یوم قیامت کے اہوال سے ڈرانا ہے نہ کہ کوئی عضو مثل اعضاء انسانی کے ثابت کرنا ہے بلکہ انسانی فہم سے قریب کرنے کے لئے اس طرح بیان فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ روح المعانی میں بھی ہے۔ ساق الشئ اصلہ الذی بہ قیامہ کساق الشجر و

ساق الانسان والمراد بہ یوم یکشف عن اصل الامر فیظہر حقائق الامر واصولہا بحیث تصیر عیاناً۔ اور سب کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے دن باری عزاسمہ کی تجلیات ذاتیہ ظاہر ہوں گی اور سب کے حالات وواقعات اور سب کی حقیقتیں اور سب کے کردار واعمال اس طرح ظاہر ہو جائیں گے جس کا مشاہدہ تمام لوگ اس طرح کریں گے جس طرح آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، اور پھر کسی کو بات بنانے اور کسی قسم کی تلبیس وتغیر وغیرہ کرنے کی جرأت وہمت نہ ہوگی۔

اور اگر ساق کے معنیٰ پنڈلی ہی کے لیں تو یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ کے لئے ساق ہے لیکن ایسی نہیں جیسی ہماری۔ بلکہ ایسی جو اللہ کی شان کے مناسب ہے، اور اسی طرح آنکھ، پیر وغیرہ والی تمام آیات میں ان اعضاء اور ان اعضاء کے اثرات اور احوال کے مناسب حال تجلیات ربانی مراد ہیں۔ اور اگر کوئی ان اعضاء کو ذات باری عزاسمہ کے لئے مراد لے تو کہے گا وہ اعضاء ایسے نہیں جیسے ہمارے لئے ہیں، بلکہ جو جناب باری سبحانہ کے مناسب ہوں، ورنہ کفر ہوگا۔ اور اس صورت میں یہ سب آیات کریمہ آیات متشابہات میں شمار ہوں گی۔

م ۴۔ اللہ تعالیٰ کو مجسم کہنا کفر ہے، غیر مجسم کہنے والا کافر نہیں۔

م ۵۔ اس سے بھی مراد وہی ہے جو م ۲ و م ۳ میں گذری۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دار العلوم دیوبند

۹/۵/۹۳ھ

سوال (۷۹) پاس شدہ اسقاطِ حمل بل کا نچوڑ مع شرائط (جموں وکشمیر) رنبر پینل کورڈ میں اسقاطِ حمل سے متعلق تفصیلات اور سفارشات ایک سو سال پرانے ہیں۔ اس وقت اسقاطِ حمل ایک جرم تھا، اس سلسلے میں حاملہ اور حمل گرانے والے معالج دونوں کو سزا دی جاسکتی تھی۔ البتہ اس میں استثناء اسوقت پیدا ہوتا جب عورت کی جان خطرے میں تصور کرکے حمل گرایا گیا ہوتا۔

اسقاط حمل بل کے مطابق۔

۱۔ کوئی بھی رجسٹرڈ معالج حمل گرانے کا مجاز ہوگا۔ جب کہ

(۲) I مدت حمل بارہ ہفتوں سے زیادہ نہ ہو۔

(۳) II مدت حمل بارہ ہفتوں سے زیادہ اور بیس ہفتوں سے کم نہ ہو

اول الذکر صورت میں ایک معالج اور مؤخر الذکر صورت میں دو معالج کی ایماندارانہ رائے ضروری ہوگی۔

شرائط۔ ۱۔ حمل کی موجودگی سے حاملہ عورت کی زندگی یا اس کی ذہنی یا جسمانی صحت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوگا۔

۲۔ اس بات کا اندیشہ کہ پیدا ہونے والا بچہ جسمانی یا دماغی بے اعتدالی کا شکار ہوگا۔

۳۔ کوئی (شادی شدہ یا غیر شادی شدہ) حاملہ عورت یہ شکایت کرے کہ اس کا حمل زنا بالجبر سے ٹھہرا ہے۔

الجواب:- عرض یہ کہ جب تک پورا بل سامنے نہ ہو، اس کے بارے میں کوئی حتمی ویقینی بات نہیں کہی جاسکتی، البتہ جن چیزوں کا ذکر آپ حضرات نے سوال میں کیا ہے اس کا شرعی حکم نمبر وار لکھ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر اس کو شائع کرانا ہو تو اس جواب کو اُس بل کا جواب قرار دے کر

شائع نہ کیا جائے بلکہ اگر شائع کرنے کی ضرورت ہو تو پورا بل یا دستور یا اس کی بعینہ نقل بھیجی جائے، اس پر جواب میں جو کچھ لکھا جائے اس کو جواب میں شائع کیا جائے، البتہ بطور مسئلہ اس کو شائع کر سکتے ہیں۔

۱ - ہر رجسٹرڈ معالج کی رائے اسقاط حمل کے بارے میں علی الاطلاق معتبر نہ ہوگی بلکہ ماہر و تجربہ کار طبیب یا ڈاکٹر جو اس معاملے میں اسپشلسٹ ہو، اور حدود شرع کے اندر رہ کر تشخیص و حکم کرے اس کا اعتبار رہوگا اس لئے کہ حمل متیقن ہو جانے کے بعد اس کا بغیر شرعی عذر کے گرا دینا مکروہ تحریمی و ناجائز ہوتا ہے۔ اور حرام و ناجائز فعل کے ارتکاب کی اجازت یا حرام و ناجائز چیز کے استعمال کی اجازت بغیر اضطراری اندازکی حاجت کے اور بغیر کسی شدید ضرورت کے نہیں ہوتی۔ تداوی بالحرام اور احکام المعذورین کے مسائل سے بھی اس مسئلے پر کافی روشنی پڑسکتی ہے، اور کچھ تفصیل آئندہ نمبروں میں بھی آجائے گی۔

۲ - الرد المحتار ص ۲۷۶ قوله ویکره ان تسقی لاسقاط حملها ای مطلقاً قبل التصور و بعده۔

وایضاً فیه ج ۵ ونقل عن الذخیرة لو ارادت الالقاء قبل مضی زمن ینفخ فیه الروح (الی قوله) یکره فان الماء بعد ما وقع فی الرحم ماله الحیاة فیکون له حکم الحیاة۔

وایضا فیه قوله جاز لعذر کالمرضعة ظهر بها الحبل وانقطع لبنها ولیس لابی الصبی ما یستاجر به الظئر ویخاف هلاک الولد وفی کراهة الخانیة۔ ولا اقول بالحل اذ المحرم لو کسر بیض الصید ضمنه لانه اصل الصید فلما کان یؤاخذ بالجزاء فلا اقل من ان یلحقها اثم هنا اذا اسقطت بغیر عذر۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا حمل خواہ بارہ ہفتوں سے کم کا ہی کیوں نہ ہو اس میں کسی عضو کی تخلیق بھی اگرچہ نہ ہوئی ہو، لیکن حمل کے تیقن کے بعد اس کو بغیر کسی شرعی عذر کے گرا دینا کسی طرح جائز نہیں ۔

۳ ۔ حمل پر جب بارہ ہفتے پورے ہو جاتے ہیں تو عموماً بعض اعضاء کی تخلیق ہو چکی ہوتی ہے کما فی البدائع وغیرہا اور جب بعض اعضاء کی تخلیق ہو چکی ہو تو بغیر شرعی وجہ کے ساقط کرا دینے میں اگرچہ شوہر کی اجازت سے ہی ساقط کرائے گناہ عظیم کے ساتھ ساتھ تعزیر و ضمان و عقر وغیرہ بھی واجب ہو جاتا ہے ۔

فی الدر و ما استبان بعض خلقہ کظفر و شعر عام فیما ذکر من الاحکام (و تحتہ فی الشامی ص۳۷۹ ج۵) و لو القت مضغۃ و لم یتبین شئ من خلقہ (الی قولہ) یجب عندنا حکومۃ ۔

و ایضاً فی ص۳۷۹ ج۵ قولہ فاذن لہ اولم یتعمد لا غرۃ لعدم التعدی الخ و قال فی الشرنبلالیۃ اقول ھذا یمشی علی الروایۃ الضعیفۃ لا علی الصحیح ۔

اور جب حمل پر سترہ ہفتے پورے ہو جاتے ہیں تو جنین میں عموماً روح (جان) پڑ جاتی ہے کما فی الرد و قدروا تلک المدۃ بمائۃ و عشرین یوما و ھکذا فی البحر وغیرہ ۔

اور جان پڑ جانے کے بعد بغیر کسی شرعی وجہ کے ساقط کرا دینے میں قتل کر دینے کا گناہ ہوتا ہے اور مستوجب سزا و عقر ہوتا ہے کما فی الرد ص۳۷۹ ج۵ و لا یخفی انھا تأثم اثم القتل لو استبان خلقہ و مات بفعلھا ۔ ۱۲

یہ (شرط اول) معالجین میں اگر وہ شرائط وقیود موجود ہوں جو نمبر ایک میں لکھی گئی ہیں، اور وہ معالج حدود شرعی کے اندر رہتے ہوئے تشخیص کر کے حکم کرے کہ اگر اسقاط نہ کرایا گیا تو حاملہ کی زندگی خطرے میں ہے تو گرانا درست ہوگا ورنہ درست نہ ہوگا، جسمانی یا ذہنی صحت کے نقصان کے محض احتمال پر گرانا درست نہ ہوگا کما فی الرد ص ۱۴۰/۴ یرخص اذا علم فیہ شفاء ولم یعلم دواء آخر - ۱۲ وایضاً فی الرد ص ۲۴۹/۵ وکذا کل تداو لا یجوز الا بطاهر وجوزه فی النهایۃ بمحرم اذا اخبره طبیب حاذق مسلم ان فیہ شفاء ولم یجد مباحا یقوم مقامہ (هٰذه العبارۃ ایضا یشعر الی ما قلنا)

(شرط دوم) یہ اندیشہ محض احتمال کا درجہ ہے، یہ اسقاط کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتا (کما قلنا آنفاً)

(شرط سوم) یہ شرط بھی شرعاً صحیح نہیں، اس لئے کہ غیر شادی شدہ عورت کے حمل کو اگرچہ حمل بالزنا کہدیں اور زانی وزانیہ کو جتنا چاہیں قصوروار قرار دیں جو سزا مناسب ہو دے دیں۔ اس حمل کا خواہ زنا بالجبر سے ہو یا زنا بالرضا سے ہو کوئی قصور نہیں۔ اس کو ضائع کرنا ظلم ہوگا، اس کے ساقط کرنے اور کرانے میں بھی وہی تفصیل وقیودات ہیں جو ابھی اوپر مذکور ہوئیں۔ فان الماء بعد ما وقع فی الرحم مآله الحیاۃ فیکون له حکم الحیاۃ (الخانیہ) اسلئے جب تک وہ شرائط وقیود متحقق نہ ہوجائیں گرانے کی شرعاً گنجائش واجازت ہرگز نہ ہوگی اور شادی شدہ عورت سے اگر زنا کا صدور متحقق وثابت بھی ہوجائے خواہ زنا بالجبر کی صورت میں ہو یا زنا بالرضا کی شکل میں ہو، اور خواہ اس کی سزا غیر شادی شدہ عورت سے کتنی ہی زیادہ اور سخت ہو مگر اس

کے اس حمل کو زنا سے کہنا یا اس کو حرامی کہنا درست نہیں، حدیث شریف میں ہے الولد للفراش وللعاهر حجر (الحدیث)

حتیٰ کہ اگر عورت اس حمل کے بطریق لعان بالزنا ہونے کا اقرار کرے جب بھی جب تک خود شوہر بھی اس کے بارے میں اپنا ہونے سے انکار نہ کرے اور بحلف انکار نہ کرے حرامی نہ کہا جائے گا۔ اور بغیر ان اعذار و مجبوریوں کے اور بغیر ان شرائط و قیود کے جن کا ذکر تفصیل سے پہلے آچکا ہے، گرانا شرعاً کسی طرح جائز نہ ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ،

دارالعلوم دیوبند

کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کدورت تھی؟

سوال (۸۰) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کدورت تھی، کیونکہ ایک موقعہ میں حضرت وحشیؓ کو آپ نے یوں ارشاد فرمایا تھا کہ میرے سامنے نہ آیا کرو، اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کدورت تھی، اگر آپ کے دل میں کدورت نہ ہوتی تو آپؐ حضرت وحشیؓ کو ایسا کبھی نہ فرماتے کہ میرے سامنے نہ آیا کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے دل میں کدورت تھی، اگر واقعی یہ بات تھی تو کیا حضرت وحشیؓ کا ایمان معتبر اور صحیح ہو سکے گا، اور کیا وہ صحابی کہلانے کے مستحق ہوں گے۔ علاوہ ازیں جس کی طرف سے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کدورت ہوگی وہ شفاعت کے مستحق ہوں گے۔ الا کل شئی من امر الجاهلیة تحت قدمی موضوع ودمنا الجاهلیة موضوعة وان اول دم اضع من دمائنا دم ابن ابی ربیعة بن الحارث وکان مسترضعا فی بنی سعد فقتله هذیل۔ واقعہ مذکورہ کے ساتھ

یہ قول معارض تو نہ ہوگا۔ نیز ہندہ کی طرف سے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کدورت نہ ہوگی۔ حالانکہ اس نے ساتھنوں کے ساتھ جاکر میدان جنگ میں شہداء احد کا مثلہ کیا تھا، اور ناک، کان کاٹ کر گلے میں ہار اور ہاتھوں میں کنگن پہنے تھے اور حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبایا تھا، اور فتح مکہ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر ماسبق کی تلافی کی استدعا کی اور مغفرت کی دعاء بھی کرائی، آپ نے اس کو معاف بھی کر دیا اور مغفرت کی دعاء بھی کی، اور کسی مفتی کا یہ جواب کہ کدورت کی دو قسمیں ہیں۔ کدورت اختیاری، اور کدورت غیر اختیاری، نعوذ باللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کدورت غیر اختیاری تھی؟۔

نیز کدورت اور کینہ کی تعریف بیان فرماکر یہ بتلایئے کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ (۲ تا ۹) یہ سوالات جواب سے ظاہر ہیں۔

الجواب:- (۱) کدورت خواہ بمعنی کینہ ہو خواہ کسی ایسے معنی میں ہو جس میں کسی رذیلۂ بشری کی نسبت جناب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم (روحی فداہ وقلبی) کی جانب ہوتی ہو تو درست نہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قلب مبارک بالکل مجلیٰ و مصفیٰ تھا، دونوں معنیٰ سے آپ مبرا و منزہ تھے۔ حضرت وحشی رضی اللہ عنہ سے آپ کا یہ فرمانا کہ میرے سامنے نہ آیا کرو، یہ ان کی بہی خواہی و ہمدردی کے جذبہ سے تھا کہ تمہارے سامنے آنے سے وہ المناک منظر سامنے آجاتا ہے، اور تم تائب ہوکر مومن صادق ہو چکے ہو، اور میرا قلب تم سے منشرح ہو چکا ہے۔ مبادا اس انشراح میں کوئی فرق نہ آجائے اور تم کو فائدہ پہنچنے میں کمی نہ ہو جائے کیونکہ افادہ کے لئے مفید کا قلب مستفید کی جانب سے جتنا ہی زیادہ منشرح رہے گا اتنا ہی زیادہ اس کو نفع پہنچے گا۔

لہٰذا آپ کے اس فرمانے سے حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کے صحابی کہلانے میں یا ان کے مستحق شفاعت ہونے میں ذرہ برابر بھی شبہ نہ ہوگا، اور نہ تو الخ کل شئی من امر الجاھلیۃ الخ کے معارض ہی ہوگا، اور نہ تو حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں توبہ وصداقت ایمان کے بعد کسی کدورت وغیرہ کا شبہ ہی ہوگا۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے باب تربیت میں ایک موقعہ پر جو اس واقعہ سے استدلال فرمایا ہے، اس سے آپؐ کے لئے کسی رذیلۂ بشری کا ایہام تک نہیں ہوتا۔

رہ گیا اس شبہ کا جواب کہ حضرت ہندہؓ کے بارے میں سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کیوں نہیں ہے۔ سو اس کے مختلف وجوہ اسباب ہو سکتے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ وہ پردہ میں رہتی تھیں سامنے آتی ہی نہ تھیں کہ اس جملہ کے کہنے کا موقع آئے، اور آپ نے شروع سوال میں جو یہ (مدعی عالم دین الخ) کہہ کر سوال قائم کیا ہے تو اس نے کب اور کس موقع پر کہا یا کس کتاب میں لکھا ہے، تفصیل سے پوری بات لکھئے یا کتاب کا حوالہ دیجئے، تاکہ اس سے مراجعت کرکے پوری بات سمجھی جا سکے، کدورت کے معنی ہیں کسی کی جانب سے دل میں کچھ میل آجانا جس سے خوش خیالی بدخیالی سے بدل جائے خواہ بدگمانی تک نوبت نہ پہنچے۔

اور کینہ کے معنیٰ ہیں کسی کی جانب سے دل میں میل اس طرح آجائے کہ انتقام لینے کا جذبہ قلب میں پیدا ہو جائے گو مستور رہے۔

(۲ تا ۹) یہ تمام سوالات جب ایسے شخص سے متعلق ہیں جو خود عالم دین ہیں تو خود انہی سے بطور استفسار دریافت کیا جائے کہ آپ کے بارہ میں لوگ

اس طرح کہتے ہیں، اس کا جو جواب وہ تحریر فرمائیں، اس جواب کو مع اس سوال کے یہاں بھیجیں تو کچھ کہا بھی جاسکے۔ فقط

الاحقر نظام الدین عفرلہٗ

دارالعلوم دیوبند

۲۴/۵/۹۵ھ

لائف انشورنس کا شرعی حکم

سوال (۸۱) پہلے یہ واضح ہو کہ پہلے پہل انشورنس کا شعبہ الگ تھا، اس کے قوانین وضوابط جدا تھے۔ اب محکمۂ وشعبہ کو حکومت نے اپنے تحت لے کر اس کے قواعد کو بدل دیا اور اب حکومت جو رقم اس سے وصول کرتی ہے اس کے مصارف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ملک کی ترقی کے لئے پانی کا نظم دواخانے تعلیم وتربیت کے لئے مدرسے سڑکوں کی سہولت وغیرہ۔

(۲) - بڑی بڑی تجارتوں صنعت وحرفت میں خرچ کرنا۔

(۳) - عمارتوں کو تعمیر کرکے کرایہ وصول کرنا۔

(۴) - حکومت اپنی خاص خاص ضرورتوں پر بطور قرض لیتی ہے۔

غرض ان سارے مصارف کے لئے حکومت رقم دے کر ان سے سود وصول کرتی ہے اور سود کی اس رقم سے کارپوریشن اپنے سارے اخراجات خود برداشت کرتی ہے۔ جن لوگوں کی انشورنس پالیسیاں ہیں ان کو بطور وظیفہ کچھ دیدیتی ہے مگر سود کی غرض سے یہ رقم نہیں دی جاتی۔ اب انشورنس دو قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) - رنڈریبنٹ پالیسی یعنی وہ انشور ہے جس کی حکومت خود پوری طرح ذمہ دار ہوتی ہے۔ اگر کوئی چند ہزار روپے اور چند سال پہلے انشورنس

کرتا ہے، اگر وہ بقید حیات ہے تو پوری رقم اور بونس دیدیتی ہے دونوں قسم کے فائدے ہیں، اور اگر وہ مرجائے تو جتنی رقم کے لئے انشورنس کیا ہے اتنی اس کے وارث کو لوٹا دیتی ہے اس کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں۔ مگر اس طرح کے انشور کے لئے ان لوگوں کی پالیسی محکمہ لائف انشورنس حق شرکت عطار نہیں کرتی جو لوگ معذور اور مجبوریوں جیسے اندھے، لنگڑے بوڑھے ذیابیطس کے مریض بلیڈ پریشر کے مریض وغیرہ، ساٹھ سال والوں کے لئے بھی اس میں کوئی حصہ نہیں۔

دوسری قسم بیوراِنڈوبینٹ پالیسی کا کہلاتا ہے، اس میں عمر کی کوئی قید نہیں اور نہ صحت کی ہی شرط ہے مگر اس انشور میں حکومت کسی کے موت وحیات کی ذمہ دار نہیں ہوتی، اگر وہ باحیات ہے تو جو رقم جتنی مدت کے لئے جمع کیا ہے وہ اور تھوڑا سا بونس دے کر اس کی پالیسی ختم کردی جاتی ہے اور اگر مرجائے تو اس کے مرنے تک جتنا پیسہ جمع کیا ہے اتنا اس کے وارث کو لوٹا دیا جاتا ہے، غرض اس انشور میں کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں ہے، موجودہ حکومت نے چونکہ اپنے رعایا پر جہاں ٹیکس لگایا ہے وہاں ایک رعایت یہ رکھی ہے کہ اگر کوئی بیوپاری انشورنس کی پالیسی لیلے تو اس کا انکم ٹیکس کم کردیا جاتا ہے اب جب کہ مذکورہ بالا قانون حکومت پیش کرتی ہے تو از روئے شرع ایک مسلمان کے لئے یہ چند سوالات پیدا ہوتے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ اگر کوئی بیوپاری یا کوئی اور شخص لائف انشورنس کی پالیسی محض اس غرض سے لیتا ہے کہ اس کے ٹیکس میں کمی ہو تو آیا جائز ہے یا نہیں؟۔

۲۔ اوپر جو دو قسم کی پالیسیوں کا ذکر کیا گیا اس میں دوسری قسم کی پالیسی انشور میں جو بونس دیا جاتا ہے وہ چھوڑ دیا جائے یا نہیں، یا اس کو لے کر ثواب

کی نیت اور عام لوگوں کی سہولت کے لئے خرچ کیا جا سکتا ہے؟

۳۔ پہلی انشورنس میں جب کہ دونوں طرح کے فائدوں سے ملنے والی رقم کے لئے اپنے بعد کسی وارث کو وصیت کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

۴۔ اگر انشورنس کی پالیسی لینے کی اجازت ہو تو پہلی قسم کی انشورنس لی جا سکتی ہے یا دوسری قسم کی؟۔

۵۔ حکومت کی عطا کردہ سہولت سے فائدہ اٹھانے میں کیا حرج ہے؟

۶۔ اگر دونوں انشورنس کی پالیسی والا حیات ہو، اور اس کو اصل رقم اور بونس ملے تو کیا نیک کاموں میں خرچ کر سکتا ہے؟

ہماری غرض صرف یہ ہے، حکومت ٹیکس زیادہ لیتی ہے اس سے بچنے کے لئے حکومت کی سہولت سے فائدہ اٹھایا جائے علاوہ بریں کوئی اور نیت غرض نہیں ہے، جواب سے نوازیں۔

الجواب:۔ مرسلہ استفتار کا ہر جزو بغور پڑھ کر حکم شرعی لکھا جاتا ہے۔

لائف انشورنس خواہ کسی قسم کا ہو، اس میں سود (ربوا) تو ضرور ہی ہوگا اور اکثر میں قمار (جوا) بھی ہوگا، اور سود و قمار دونوں شریعت مطہرہ میں حرام و ناجائز ہیں۔ اس لئے لائف انشورنس کو جائز نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ شدید مجبوری کی بات دوسری ہے، مثلاً قانوناً لازم ہو جائے یا مثلاً کسی مقام کے حالات ایسے خراب ہو جائیں کہ بغیر انشورنس کے جان و مال کی حفاظت مشکل ہو جائے یا مثلاً ملازمت نہ ملے یا ملازمت برقرار و بحال نہ رہے اور بغیر ملازمت کے گذارہ مشکل ہو یا معاشرہ قائم نہ رہے تو بوجہ مجبوری کے محض مجبوری کے بقدر گنجائش نکل سکے گی، مگر شرط یہ ہوگی کہ جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم جو ملے اس کو ثواب کی

نیت کئے بغیر بلکہ اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے محتاج غربار ومساکین کو دیدیا جائے اور استغفار ودعار کا معمول رکھا جائے کہ اے اللہ ہمارے گناہوں کو معاف کیجئے اور ہمارے حالات ایسے کر دیجئے کہ ان حرام وناجائز چیزوں سے ہم محفوظ رہتے ہوئے اطمینان سے کسب حلال کرسکیں۔ اس تمہید کے بعد اب ہر سوال کا جواب نمبر وار درج کیا جاتا ہے بغور مطالعہ فرمائیں

نمبر۱۔ بیجا اور غلط قسم کے دباؤ سے بچنے کی غرض سے مجبوری وضرورت کے بقدر گنجائش ہے۔

نمبر۲۔ وہ بونس وہاں نہ چھوڑا جائے وصول کر کے بغیر نیت ثواب محض اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے محتاج غربار ومساکین کو دیدیا جائے۔

نمبر۳۔ اگر بوجہ مجبوری ایسا انشورنس کرائے تو یہ وصیت کرنی ضروری ہوگی کہ میری جمع کی ہوئی رقم سے جو زائد رقم ملے اس کو محتاج غربار ومساکین دیدیا جائے

نمبر۴۔ مجبوری کے تحت پہلی قسم کا انشورنس بھی کرا سکتے ہیں۔

نمبر۵۔ حدود شرع میں رہتے ہوئے کوئی حرج نہیں ہے۔

نمبر۶۔ دونوں پالیسیوں میں اپنی اصل رقم تو اپنے جس مصرف میں چاہے خرچ کر سکتا ہے، البتہ اصل رقم سے زائد جو رقم یا بونس ملے اس کا حکم وہی ہے جو نمبر۲، نمبر۳ میں گذرا، یعنی صرف محتاج غربار ومساکین کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے دیدے، اور کہیں خود خرچ نہ کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند

۲۰ ذی ۹۵ھ

بینک سے سود نکالنے پر اشکال اور اس کا جواب

سوال (۸۲) ایک ضروری امر یہ کہ سارے علماء ومفتیان کرام بینک سے سود کے اٹھا لینے کو جائز کہتے ہیں، چاہے مجبوری کی وجہ کچھ بھی ہو، اس پر ایک زبردست اشکال یہ ہے کہ یہ تو قرآن پاک کی نص صریح پر قیاس سے زیادتی لازم آتی ہے کہ صرف اسوجہ سے کہ یہ پیسے عیسائیت کی تبلیغ پر خرچ ہوں گے۔ اس کو بنیاد بنا کر قرآن پاک کی نص صریح پر زیادتی کیسے جائز ہے؟ جب کہ قرآن پاک کی نص صریح ربوٰا کی حرمت پر دال ہے، تو محض اس بناء پر کہ اسلام کو ان پیسوں سے نقصان پہنچے گا اسلامی صریح حکم میں تبدیلی کیسے جائز ہے؟ اس لئے کہ لے کر اس کو چاہے صدقہ کر دیا جائے مگر لینا گویا کہ قرآنی حکم صریح کی مخالفت ہے اس کے جواز کی دلیل کیا ہے؟ اسی طرح دار الحرب میں حربی سے سود لینے کا جواز بھی اس نص صریح پر زیادتی نہیں ہے؟ جب کہ قاعدہ ہے کہ قرآنی نص صریح کے مقابلہ میں اگرچہ حدیث صریح ہو تو وہ رد ہوگی۔ لہٰذا ہمارے علمائے زمانہ نے موجودہ حالات سے متاثر ہو کر قرآنی نص کے مقابلہ میں بینک سے سود لینے کو فرمایا اس کے اصولی دلائل کیا ہیں؟ مفصل مدلل تحریر فرمائیے۔

الجواب:- سود لینا قطعاً حرام ہے بینک سے بھی لینا حرام ہے، یہ جو کہا گیا ہے کہ سود کے نام پر جو رقم بینک سے ملے اس کو بینک میں نہ چھوڑے وہاں سے نکال کر مسلم غرباء ومساکین کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے دیدے تو یہ سود لینا نہیں ہے بلکہ وہاں چھوڑ دینے پر چونکہ وہ لوگ سود کی رقم روپیہ رکھنے والے ہی کے نام سے الگ کر کے ایسے کاموں میں خرچ کر سکتے جس سے اسلام اور مسلمانوں کو ضرر پہنچتا ہے اور ظلم ہوتا ہے۔ اور ضرر اور ظلم سے بچنا اور بچانا بھی منصوص حکم ہے۔ جیسا کہ لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام سے اور آیت کریمہ وما ربک بظلام للعبید o الآیۃ اور وما أنا بظلام للعبید o الآیۃ سے

بھی اشارہ ملتا ہے۔ اسی طرح کی اور بھی متعدد آیات ہیں جن سے اشارہ ملتا ہے اسی طرح احادیث بھی ہیں کہ ان سے بھی اشارہ ملتا ہے۔ اس لئے اس ظلم وضرر سے بچانے کے لئے انہی آیات ونصوص کی مدد سے اس حیلہ کی جرأت ہے، یہ سود کے جواز کا فتویٰ یا قول ہرگز نہیں ہے کہ اشکال وارد ہو فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند - ۲/۵/۹۵ھ

ذبح مشینی پر اشکال اور جواب

سوال (۸۳) یہاں کے مذابح دو طرح کے ہیں ایک وہ ہیں جن میں ہمارے یہاں کی طرح سے بھیڑوں کو پکڑ کر ذبح کیا جاتا ہے۔ دوسرے وہ ہیں جہاں بھیڑ کے دماغ میں پستول سے گولی ماری جاتی ہے۔ اور گولی مار کر پھر اس کو ذبح کیا جاتا ہے تو گولی لگنے کے بعد وہ بھیڑ قریب المرگ ہو جاتی ہے، اگر پانچ منٹ اس کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ جان دیدے تو جس طرح ایسے لنگڑے جانور کی قربانی جائز نہیں جو مذبح تک چلنے کے قابل نہ ہو چاہے وہ کتنا ہی موٹا کیوں نہ ہو۔ اسی طرح اس بھیڑ کی اب قربانی جائز ہے؟ جو کہ گولی لگنے کی وجہ سے موت کے قریب پہنچ گیا ہے؟۔

الجواب :۔ مشینی ذبح کے بارے میں جناب مولانا میرک شاہ صاحب کا ایک تفصیلی سوال آیا تھا، اس میں جانور کو چوٹ دینے اور بیہوش کرنے اور ذبح کرنے کے سب طریقے نہایت تفصیل سے لکھے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس گولی مارنے سے جانور کو زخم نہیں ہوتا بلکہ صرف چند منٹ کے لئے بیہوش ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اگر ذبح نہ کیا جائے تو چند منٹ کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

اور اس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ذبح نہ کیا جائے تو مر جائے گا۔ لہٰذا اُس سوال کے مطابق وہ جواب تھا اگر چھری چلنے کی بٹن دبانے والے اور جانور کو

کنٹرول کرنے والے سب مسلمان ہوں اور "بسم اللہ اللہ اکبر" کہہ کر بٹن دبائیں اور کنٹرول کریں اور چھری چلنے سے گردن کے ذبح کی کم از کم تین رگ کٹ کر سارا خون نکل جائے تو اگرچہ سنت کے طریقہ کے خلاف ذبح کرنے سے خلاف سنت عمل کرنے کا گناہ ہوگا مگر ذبیحہ حلال رہے گا اور قربانی بھی درست رہے گی، مگر آپ کے سوال کے مطابق کر اگر پانچ منٹ کے اندر ذبح نہ کیا جاوے تو جانور مر جاوے گا۔ اگر یہ صحیح ہے تو سارا خون ذبح سے نکلنا مشکوک ہو رہا ہے اور ایسی صورت میں حکم بھی بدل جاوے گا، لہٰذا اس کی پوری تحقیق لکھ کر سوال کرنا چاہیئے۔ باقی اس جانور کو لنگڑے جانور یا لاغر و دبلے جانور پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا بلکہ خود ذبیحہ کے حلال ہونے یا نہ ہونے کا سوال پیدا ہو جائے گا

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند ۹۵/۲/۲ھ

قتل خطا میں قربانی کی ادائیگی

سوال (۸۴) ایک شخص اپنی چراگاہ میں شکار کھیل رہا تھا کہ غلطی سے بندوق کی گولی چرتے ہوئے ایک بھیڑ کو لگ گئی اور گولی اس کے سر میں لگی اور وہ قریب تھا کہ دم توڑ دے کہ اس نے اس کو پکڑ کر ذبح کیا اور قربانی کے ایام تھے تو ذبح کرتے وقت اس نے اس میں قربانی کی نیت کر لی تو آیا اس شدید زخمی جانور کی قربانی جائز ہے؟ جس کے سر میں گولی لگی ہے؟

الجواب:- اگر اس کی عمر پوری تھی قربانی کے لائق تھی اور ذبح کرنے سے خون نکلا تھا تو قربانی کی نیت کر لینے سے قربانی ادا ہو جائے گی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند ۹۵/۲/۲ھ

نوٹوں سے قرض کی ادائگی میں نزاع کا فیصلہ

سوال (۸۵) ایک آدمی نے دوسرے کے پاس سے دس ہزار روپے بطور قرض لئے۔ اب وہ آدمی اس کا قرض دس سال بعد ادا کرتا ہے۔ اس درمیان میں سرکاری طور پر روپیہ کی قیمت آدھی گھٹا دی گئی ہے۔ یعنی آج سے دس سال پہلے روپیہ کی جو قیمت تھی آج اس سے آدھی رہ گئی جس کا سرکاری طور پر اعلان بھی ہو چکا ہے جس کو سرکاری اصطلاح میں ڈی ویلیوئیشن کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ قرض لینے والا آج دس ہزار روپے ادا کرتا ہے لیکن ان کی قیمت جن روپوں میں قرض لیا تھا اس کے مقابلہ میں پانچ ہزار ہی ہے تو کیا قرض دینے والا اسی بنیاد پر اس سے بیس ہزار کا مطالبہ کر سکتا ہے؟ اور کیا یہ شرعاً سود کہلا سکتا ہے؟ قرض کی یہ لین دین نوٹوں کی شکل میں ہوئی تھی، اور قیمت کی تقلیل بھی نوٹوں میں ہوئی ہے۔

الجواب:- اس قرض میں لئے ہوئے نوٹوں کی قرض لینے کے زمانہ میں جتنی چاندی ملتی یا جتنا سونا ملتا اتنی چاندی میں یا اتنے سونے میں جتنے نوٹ آج (بوقت ادا) ملیں اتنے ہی نوٹ دینے ہوں گے۔ کیونکہ نوٹ اصلی سکہ نہیں ہوتا اصلی سکہ نقدین ہوتے ہیں۔ پس نقدین میں سے جو زیادہ رائج ہوگا اس کا اعتبار ہوگا اور نوٹ اس کے تابع ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند ۹۵/۲/۲ھ

قنوت نازلہ کا ایک حکم

سوال (۸۶) (الف) اگر امام حنفی ہو اور تمام مقتدی یا اکثر مقتدی یا بعض مقتدی شافعی ہوں تو کیا حنفی امام کے لئے جائز ہے کہ وہ شوافع مقتدیوں کا لحاظ کرتے ہوئے فجر کی نماز میں رکعت ثانیہ میں قنوت نازلہ پڑھ دے؟

(ب) یا قنوت نازلہ پڑھنے کے بجائے امام کے لئے رکوع کے بعد اتنی دیر خوش

کھڑے رہنا جائز ہے جتنی دیر میں شوافع حضرات قنوت نازلہ پڑھ سکیں ؟

الجواب :- (الف و ب) قنوت نازلہ حنفیہ کے نزدیک بھی منسوخ نہیں ہوا ہے بلکہ جائز ہے البتہ افضل یہ ہے کہ جب کوئی حائلہ پیش آجائے کچھ دنوں یا کچھ ماہ کے لئے پڑھ کر بند کر دیا جائے۔ اسی طرح قومہ (قیام بعد الرکوع) میں بھی چھوٹی بڑی ہر قسم کی دعائیں پڑھنا جو ماثورہ منقول ہیں، ان میں سے جس کو پڑھنے کا جی چاہے فرضوں کی جماعت کے اندر امام کو پڑھنا جائز ہے۔ مقتدیوں میں صرف مرضیٰ وضعفاء و اہل ضرورت و حوائج کی رعایت کے پیش نظر امام کو بحالت امامت مختصر دعاء (ربنا لك الحمد) پڑھنا افضل ہے، پس جب تمام مقتدی لمبی دعا پڑھنے پر راضی ہوں تو لمبی سے لمبی دعا مثلاً " اللهم ربنا لك الحمد حمداً كثيراً طيبا مباركاً فيه ملؤ السموات وملؤ الارض وملؤ بينهما وملؤ ما شئت من شئ بعد وانت اهل الثناء المجد ولا مانع لما اعطيت ولا معطى لما منعت ولا ينفع ذا الجد ومنك الجد " بھی پڑھ سکتے ہیں۔

پس جب تمام مقتدی لمبی دعاء (مثل دعاء قنوت) پر راضی ہوں تو امام کو اختیار ہوگا کہ چاہے دعاء قنوت کچھ دنوں تک کسی حائلہ کے مطابق پڑھ لیا کرے اور باقی دنوں میں دیگر ماثورہ دعاؤں میں سے کوئی لمبی دعاء پڑھ لیا کرے، اور اسی اثناء میں شوافع حضرات اپنی دعاء قنوت پڑھ لیا کریں۔ البتہ امام کا مقتدیوں کے دعاء قنوت پڑھنے کی مقدار تک بالکل خموش و ساکت کھڑے رہنا اور کچھ نہ پڑھنا یہ صحیح نہ ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۵/۲/۹۵ھ

غیر عربی میں خطبہ کا حکم

سوال (۸۷) جمعہ کے دن خطیب کا منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ سے پہلے مقتدیوں کو سلام کرنا درست ہے اور اردو میں یا کسی اور لوکل زبان میں خطبہ پڑھنا درست ہے؟

الجواب:- حنفیہ کی ظاہر روایت یہی ہے کہ جب امام خطبہ کیلئے منبر پر جائے تو قوم کو سلام نہ کرنا چاہئے کما فی نور الایضاح ولا یسلم الخطیب علی القوم اذا استوی علی المنبر (وفی شرحہ المراقی) لانہ یلجئھم الی ما نھوا عنہ والمروی من سلامہ عندنا غیر مقبول (مراقی الفلاح علی ھامش الطحطاوی ص۲۵۳) البتہ طحطاوی علی المراقی میں بعض فقہاء متاخرین سے سلام کر لینے کی کچھ گنجائش بھی معلوم ہوتی ہے، اس لئے حاصل یہ نکلے گا کہ اگر کوئی خطیب سلام کر دے تو اس پر نکیر نہ کی جائے گی۔ لیکن اس کو لازم و ضروری سمجھنا اور جو منبر پر پہنچ کر سلام نہ کرے اس پر نکیر کرنا یا اس پر طعن کرنا یا برا سمجھنا جائز نہ ہوگا۔ اور افضل سلام نہ کرنا ہی رہے گا۔

رہ گیا عربی زبان کے علاوہ اردو میں یا کسی اور لوکل زبان میں (مثلاً عربی کے علاوہ انگریزی وغیرہ کی زبان میں) خطبہ جمعہ دینا درست نہیں ہے زمانہ خیر القرون زمانہ رسالت و صحابہ و تابعین میں اس کا کہیں ثبوت نہیں ملتا اس لئے اس کو شرعی حکم سمجھنا غلطی ہوگی، صحابہ کرام و تابعین رضی اللہ عنہم تبلیغ و جہاد کے سلسلہ میں عرب سے باہر فارس و روم میں تشریف لے گئے اور فتحمند ہو کر جمعہ بھی قائم فرمایا اور خطبہ بھی دیا، اور ان میں فارسی و رومی زبان جاننے والے حضرات بھی موجود تھے۔ جو خطبہ مخاطب کی زبان میں دے سکتے تھے، اور وہ حضرات تبلیغ دین اور تبلیغ کا مقصد ہی لے کر تشریف لے گئے اور احکام اسلام پہنچانے میں ہم سے زیادہ

شوق و ذوق و ہمت بھی رکھتے تھے اور مزاج رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ہم سے زیادہ سمجھتے بھی تھے، اور آج کل کے اعتبار سے زبان مخاطب میں خطبہ دینے کی ضرورت بھی زیادہ تھی، آج کل کی طرح احکام اسلام پہنچانے اور تبلیغ کے ذرائع بھی متعدد و مختلف نہ تھے۔ مگر اس کے باوجود خطبۂ جمعہ غیر عربی میں نہ دیا اور نہ دلایا۔ اور نہ ہی یہ کیا کہ کچھ خطبہ تو عربی میں ہو، اور کچھ مخاطب کی زبان میں یا لوکل زبان میں ہو، بلکہ پورا کا پورا خطبہ بعینہ اسی طرح اور اسی ہیأت پر باقی رکھا جس طرح اور جس ہیئت پر سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اور دیکھا۔ کیونکہ یہ خطبہ بھی قبل نماز کے امر تعبدی ہے۔ عالمگیری میں بھی ہے "الخطبۃ کالصلوٰۃ"۔ پس جس طرح نماز غیر عربی میں نہیں ہو سکتی اسی طرح یہ خطبہ بھی غیر عربی میں نہیں ہو سکتا۔ امر تعبدی میں قیاس کو دخل نہیں ہوتا

پس آج بھی یہ خطبہ بالکل اسی طرح پر محض عربی میں برقرار رکھنا ضروری ہے، اسی میں شریعت کی، منشاء رسالت کی، ذوق صحابہ کی، بلکہ ذوق خیر القرون کی اتباع ہوگی، اور اسی میں کامیابی کا راز بھی مضمر ہوگا۔ علاوہ ازیں خطبہ میں شعائر کی شان بھی ہوتی ہے، اور شعار کی بھی حفاظت واجب ہوتی ہے۔

ہاں اگر مخاطب کی زبان میں خطبہ کا ترجمہ کرنا یا وعظ وغیرہ کہنا مصلحت ہو تو نماز کے بعد اس کا سلسلہ رکھا جا سکتا ہے، جس کو ذوق و طلب ہوگی وہ سنیں گے اور نفع بھی حاصل کریں گے۔ یا پھر اس طرح کر لیا جائے، کہ اذان اول کے بعد مخاطب کی یا لوکل زبان میں جو ضروری احکام و مسائل ہوں بیان کر دیئے جائیں، اور خطبہ شروع ہونے کے مقررہ وقت سے دس بارہ منٹ قبل اس کو بالکل بند کر کے سنتوں کے پڑھنے کا موقع دیدیا جائے، کیونکہ یہ وقت اصل میں سنتوں کا ہے، اس سے سنتوں میں خلل ڈالنا جائز نہیں، پھر خطبہ ٹھیک وقت مقررہ پر شروع کر دیا جائے،

تاکہ نظم جماعت صلوٰۃ جو مطلوب ہے وہ بھی محفوظ رہے، اور خطبہ پورا کا پورا محض عربی میں رہے گو مختصر ہی رہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

مفتی دارالعلوم دیوبند۔ ۹۵/۲/۲۵ھ

امداد باہمی کی ایک صورت کا شرعی حکم

سوال (۸۸) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں۔

فرض کرو کہ میونسپل کمیٹی مالیر کوٹلہ کے بیس ملازمین اپنی تنخواہ میں سے ہر ماہ ایک صد روپیہ کٹوا کر مبلغ دو ہزار روپے جمع کئے ہیں، اور روپیہ اکٹھا ہونے پر اس روپئے کو انھیں ممبران میں کم قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں، یعنی جس ملازم ممبر کو ضرورت ہوتی ہے دوسرے ضرورت مند ملازم کے مقابلہ میں دو ہزار کی لاٹری ہزار یا بارہ صد میں لے لیتا ہے اور جو فالتو رقم ہوتی ہے باقی ممبران حصہ کے مطابق منافع سمجھ کر بانٹ لیتے ہیں، یہ سلسلہ اسی طرح ہر ماہ چلتا رہتا ہے جب تک کہ تمام ممبران پورے نہ ہو جائیں۔

کیا یہ فالتو فروخت کی گئی رقم جو کہ بانٹی جاتی ہے کسی غریب ملازم سے ضرورت کے پیش نظر فائدہ اٹھا کر بانٹنا کسی بیاج کی زد میں آتی ہے یا کہ نہیں، شرعی طور پر یہ سسٹم جائز ہے یا کہ نہیں۔

الجواب:۔ یہ سسٹم شرعی طور پر کئی وجوہ سے ناجائز و غلط ہے مثلاً۔

(الف) تنخواہ کا یہ جزو نقدین ہوتا ہے۔ نقدین کا تبادلہ (بیع) زیادتی کمی کے ساتھ ناجائز ہے، حدیث شریف میں مثلاً بمثلٍ یداً بید ہونا ضروری ہے اس کو شرعی اصطلاح میں بیع صرف کہیں گے۔ اس میں جو نفع ہو گا یا زیادتی ہو گی وہ سود ہو گی والفضل ربوا۔

(ب) اس معاملہ میں (ربوا) سود کے ساتھ قمار (جوا) بھی ہے مثلاً ربوا تو یہی کہ دو ہزار کو بارہ سو یا تیرہ سو میں فروخت کر کے آٹھ سو یا سات سو نفع کے نام پر وصول کئے، یہ سات سو یا آٹھ سو بھی الفضل ربوا کا مصداق ہے اور سود ہے اور بیاج ہے۔ اور قمار مثلاً یہ ہے کہ جو لوگ ۲۰ قسطیں دینے سے پہلے نمبر آجانے کی وجہ سے دو ہزار وصول کر کے ۲۰ قسطیں پوری کرنے سے پہلے ہی مر جائیں تو حسب حصہ بقیہ تمام ممبروں کا حصہ ضائع ہوا۔ اور مثلاً کوئی آدمی چند قسطیں دینے کے بعد وصولی کا نمبر آنے سے پہلے مر جائے تو اسکا داخل کی ہوئی رقم ضائع ہوئی، اور ۲۰ قسطوں کی ادائیگی میں ہر شخص کا زندہ رہنا ضروری نہیں بلکہ ضیاع کے ایسے واقعات بعید از وقوع بھی نہیں۔ لہٰذا اس طرح سے مال کا دینا موضع خطر میں مال کا ڈال دینا ہوا، اور یہ بھی قمار کی ایک شکل ہے۔

(ج) یہ معاملہ مفضی الی النزاع بھی ہوگا، اس لئے کہ جو رکن چند قسطیں دینے کے بعد اور دو ہزار وصول کر کے درمیان سے نکل جانا چاہے گا تو بقیہ ارکان اس کو نکلنے نہ دیں گے جبر ہوگا یا دی ہوئی رقم کی واپسی کا مطالبہ کریں گے۔ اگر واپس کرے گا تو اپنی دی ہوئی رقم کا وہ مطالبہ کرے گا۔ اگر واپس نہ کرے گا یا واپس کرنے کے لائق نہ ہوگا، اور وہ مطالبہ جاری رکھیں گے تو نزاع کا ظن غالب ہوگا۔

اسی طرح اگر چند قسطیں دینے کے بعد دو ہزار کی رقم وصول کرنے سے قبل الگ ہوگا تو اپنے دیئے ہوئے روپیوں کی واپسی کا مطالبہ کرے گا اور یہ صورت بھی مفضی الی النزاع ہوگی۔ اور جو معاملہ اپنے نوعیت کے اعتبار سے مفضی الی النزاع ہو۔ فاسد و ممنوع ہوگا۔

ہاں اگر ایثار و ہمدردی اور نفع رسانی کا جذبہ صحیح ہے اور بطور امداد باہمی جائز طریقہ سے کرنا چاہتے ہیں تو اس طرح کر سکتے ہیں، یہ دو ہزار کی رقم جس کو دیجائے

بذریعہ قرعہ اندازی کے جس کا نام نکلے اس کو پوری رقم بطور ہبہ کے دیدی جائے۔ ہر رکن بطور ہبہ اس کو دیدینے کی تصریح کردے۔ اور جس کا نام ایک مرتبہ قرعہ میں نکل کر رقم اس کو مل جائے دوبارہ قرعہ اندازی میں اس کا نام نہ رکھاجائے۔

اور جو رکن قرعہ میں نام نکلنے اور روپیہ پانے کے بعد الگ ہو جائے اس سے واپسی کا مطالبہ بقیہ ارکان نہ کریں اور نہ اس پر کوئی گرفت کریں۔

اسی طرح جو رکن کچھ قسطیں دینے کے باوجود قرعہ میں آنے کے قبل نکل جاوے وہ اپنے دیئے ہوئے روپیہ کا مطالبہ نہ کریں اور نہ کوئی گرفت کریں۔ اور ان سب باتوں کا ضابطہ وقاعدہ پہلے تسلیم کرلے تو اس طرح یہ معاملہ درست رہے گا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

مفتی دارالعلوم دیوبند ۵/۴/۹۵ھ

حکومت کی ایک اسکیم کا حکم

سوال (۸۹) یہاں پر یعنی سنگاپور گورنمنٹ مکانات بناکر کرایہ پر دیتی اور بکری بھی کرتی ہے۔ جو مکان کہ کرایہ پر دیتی ہے اس کو بھی کچھ مدت کے بعد اس آدمی کو بکری کردیتی ہے جو کہ گھر میں رہتا ہے۔ اور اگر وہ نہ خرید سکا تو اس کو نکال دیتی ہے۔ اور یہ مکان جو بن چکے ہیں اور بن بھی رہے ہیں سب فلیٹ میں کافی اونچے ہوتے ہیں اور بہت تلے ہوتے ہیں تو جو مکان کے سرکاری بکری ہوتی ہے خواہ نیا ہو شروع میں بکری کرنے والا ہو یا کہ جو کہ کرایہ دار پہلے جس گھر میں کرایہ پر رہ چکا ہے اور بعد میں بکری کررہی ہو تو اس کی بکری کی شکل یہ ہے کہ نقد اور ادھار کی قیمت ایک ہوتی ہے۔ مگر ادھار والے میں پوری قیمت کا چوتھائی پیسہ پہلے ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور باقی رقم قسطوار ادا کرنی پڑتی ہے جس میں کہ سود شامل کی جاتی ہے۔ اور قسط ادا کرتے کرتے اصل رقم سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ فلیٹ میں مکانوں

کی قیمت دس ہزار سے لے کر پینتیس ۳۵ ہزار ڈالر تک ہوتی ہے۔ عام طور سے اسی شکل میں یہ فلیٹ چھوٹے بیوپاری یا سرکاری ملازم کو بکری ہوتے ہیں۔ اور یہاں سب مکان سرکار کے ہوتے جارہے ہیں اور اوپر کی تدبیر کے مطابق سرکار بکری کرتی ہے آیا یہ جائز ہے یا ناجائز۔

اس طرح ایک سوال اور یہ ہے کہ اکثر یہاں عام طریقہ سے زیادہ گاڑی یعنی موٹر خود کی رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو اس کی خرید کی شکل یہ ہے کہ نقد اور ادھار کی قیمت یکساں ہوتی ہے مگر ادھار جو کہ موٹر گاڑی لی جاتی ہے۔ اس کی قیمت کا ایک چوتھائی پہلے جمع کرنا پڑتا ہے۔ اور باقی رقم قسطوار ادا کرنی پڑتی ہے جو کہ اخیر میں اصل رقم سے زیادہ ہو جاتی ہے اور جب تک کہ گاڑی کی پوری قسط ادا نہیں ہو پاتی اس وقت تک خریدنے والا کرایہ دار شمار ہوتا ہے اور کمپنی والا مالک شمار ہوتا ہے۔ اور سارے کاغذات موٹر کے خریدنے کی کمپنی کے پاس رہتے ہیں جو پوری رقم ادا ہونے پر واپس کرتے ہیں تو آیا اس شکل میں ادھار موٹر گاڑی خرید نا جائز ہے یا کہ ناجائز ہے۔

الجواب:- (۱) جب حکومت یہ کرتی ہے کہ جو نہ خرید سکے حکومت اس کو نکال دیتی ہے، تو یہ بڑی مجبوری ہے کہ اگر نکال دے تو کہاں رہے، نقد خریدنے کی طاقت نہیں پردیس کا معاملہ ہے۔ پس اس مجبوری کی وجہ سے تو اگر خریدنے والے کے پاس رہنے کے لائق اپنا ذاتی مکان نہ ہو تو سوال میں لکھے ہوئے ادھار خریدنے کے طریقہ کے مطابق ادھار بھی خرید سکتا ہے۔ اسی طرح اگر نقد خریدنے میں کسی قانونی خطرہ کا اندیشہ ہو جب بھی بطریق مذکور ادھار خرید سکتے ہیں۔ اور اگر بیچنے والے محکمہ کے کسی ذمہ دار سے اس طرح بات کرلیں کہ آپ جتنی قیمت ادھار کی قیمت رکھتے ہیں اتنی ہی نقد کی قیمت بھی رکھتے ہیں۔ اور چوتھائی

پہلے لے کر پھر قسطوار جو وصول کرتے ہیں اس میں نقد کی قیمت سے اتنا زیادہ وصول کرتے ہیں۔ مثلاً نقد کی قیمت دس ہزار ہے۔ اور ادھار میں کل وصولی ۱۲ ہزار ہوتی ہے تو اگر آپ ہم سے اس طرح معاملہ کرلیں اور اس طرح بات کرلیں کہ ادھار کی کل قیمت بارہ ہزار ہے اور ایک چوتھائی قیمت ڈھائی ہزار تو ابھی لیں گے اور باقی ساڑھے نو ہزار قسطوار لیں گے۔ پس اگر وہ اس بات کو آپ کی مان جائے اور اسی طرح بات و معاملہ کرلے تو اگرچہ زبانی ہی اس طرح معاملہ کرے اور کاغذ میں اپنے قانون کے مطابق نقد کے برابر ہی قیمت دکھلائے جب بھی نقد خریدنے کی قوت رہتے ہوئے بھی ادھار خرید نادرست ہوجائے اور نقد سے بڑھ کر زبانی بتائی ہوئی کل رقم بھی اصل قیمت ادھار کی ہوجائے گی، اور سود کا شبہ ختم ہوجائے گا۔ کیونکہ نقد کی قیمت سے ادھار میں قیمت زیادہ لینا جائز ہے۔

۲۔ نقد خریدنے کی طاقت نہ ہونے کی صورت میں یا نقد خریدنے میں کسی قانونی پریشانی میں مبتلا ہوجانے کے اندیشہ کی صورت میں موٹر کو بھی ان کے ذکر کردہ قانون کے مطابق خریدنے کی بوجہ مجبوری گنجائش ہے۔ لیکن اگر سوال ۱ میں لکھے ہوئے طریقہ کے مطابق محکمہ کے کسی ذمہ دار سے معاملہ و بات کرلیں تو اگرچہ وہ معاملہ اور بات زبانی ہی ہوگی مگر سود کے خرابی سے محفوظ رہیں گے۔ البتہ خریداری کے معاملہ اور کرایہ داری کے معاملہ کے تداخل کی خرابی میں پھر بھی ابتلا رہے گا، مگر اس سے بچنے کی کوئی تدبیر اختیار میں نہیں ہے، اس لئے بوجہ مجبوری اس کی بھی گنجائش رہے گی۔ اور برداشت کریں گے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

مفتی دارالعلوم دیوبند ۹۵/۳/۲۳ھ

امداد باہمی کی ایک صورت کا حکم

سوال (۹۰) ایک کارخانے کے آٹھ سو مسلم ملازمین ایک انجمن قائم کرتے ہیں، اور ہر ماہ اپنی تنخواہ سے ایک روپیہ فی کس کے حساب سے رقم جمع کرتے ہیں، اور اس انجمن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ رکن ملازم کے حسن خدمت سے سبکدوشی پر اس کی جمع شدہ رقم ۲۵ فی صد اضافہ کے ساتھ اس کو واپس دی جائے یا ملازم کے دوران ملازمت فوت ہو جانے پر ہر رکن دو روپیہ فی کس کے حساب سے اسی ماہ کی حد تک رقم جمع کر کے یکمشت رکن متوفی کے پسماندگاں کو مالی اعانت کریں۔ مسئلہ در پیش یہ ہے کہ جمع شدہ رقم جس میں ہر ماہ اضافہ ہوتا رہتا ہے کسی ایسے شعبہ یا ادارہ میں مستعمل ہو جس سے جائز منافع حاصل ہو۔ ملازمین ادارہ مذکورہ کے لئے اپنی مصروفیات اور دیگر حالات کی بنار پر آج خود تجارت یا صنعت و زراعت سرمایہ جمع شدہ کا استعمال کرنا مشکل ہے۔ دریں حالات ارکان مقتدر انجمن مذکور یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے کسی بینک میں اس رقم کو محفوظ کر دیا جائے یا بڑے بڑے صنعتی اداروں میں جہاں حصص فروخت ہوتے ہیں اس سرمایہ کو لگایا جائے۔ ایسی صورت میں بینک سے جو منافع بشکل سود ملتا ہے یا حصص کے سلسلہ میں جو معاوضہ ایک مقرر شرح فی صد سے طے شدہ ملتا ہے وہ ہمارے لئے جائز ہوگا کہ نہیں؟

علاوہ ازیں متعلقہ ارباب انجمن مذکور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں وہ کون کون سی جائز صورتیں ہیں جس میں گھر بیٹھے سرمایہ لگانے پر منافع ملیں تو جائز ہو سکتا ہے اور کونسی صورتوں میں ناجائز۔ فقط

الجواب:- انجمن کے مقاصد وارادے نیک ہیں اللہ تعالیٰ صحیح طریق پر عمل کی نیز مقاصد حسنہ میں کامیابی کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ یہ رقم کسی بینک میں محفوظ کرنے کے بجائے مناسب یہ ہے کہ انجمن کے مقتدر اراکین ایک نگراں

کمیٹی بناکر اس کی نگرانی میں اس رقم سے اصول مضاربت پر کچھ کاروبار کرائے۔ اور حساب وکتاب ونفع ونقصان کی برابر جانچ کراتی رہے اور تمام ملازمین جن کی رقمیں اس میں شریک ہیں سب کو حسب حصہ رسدی نفع دیتی رہے۔ کسی بڑے صنعتی ادارہ یا کمیٹی کے حصص بھی خرید سکتے ہیں۔ جہاں شرکت یا مضاربت کے اصول پر کام ہوتا ہو لیکن ہر حال میں یہ ضروری ہے کہ کسی ملازم کے سبکدوش ہونے پر ہر حال میں محض ۲۵ فی صد ہی اضافہ کر کے نہ دیا جائے بلکہ اس کی رقم کے منافع کا صحیح اندازہ کر کے اخراجات وضع کر کے کل منافع مع اصل رقم کے دیدیا جائے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کسی ملازم کے دوران ملازمت فوت ہو جانے پر باقی اراکین اپنی طرف سے دو روپیہ فی کس کی اعانت از خود پسماندگان کو کردیں۔ لیکن یہ ان اراکین کا تبرع اور احسان ہوگا اس اعانت سے اس ملازم کی جمع شدہ رقم سوخت کر دینے کا حق نہ ہوگا اور نہ ایسا کرنا جائز ہی ہوگا، بلکہ اس فوت شدہ ملازم کے جمع شدہ رقم کے نفع ونقصان کا حساب کر کے اور اخراجات وضع کر کے جو رقم بچی ہوگی اس کو بھی ان پسماندگان کو دینا ضروری رہے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۹۵/۵/۱۵ھ

حضرت وحشیؓ کے صحابیت پر شبہ کا جواب

سوال (۹۱) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کدورت تھی؟ کیونکہ ایک موقعہ پر حضرت وحشیؓ کو آپؐ نے یوں ارشاد فرمایا تھا کہ میرے سامنے نہ آیا کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں بھی کدورت تھی، اگر آپؐ کے دل میں کدورت نہ ہوتی تو آپؐ حضرت وحشیؓ کو ایسا کبھی نہ فرماتے کہ میرے سامنے نہ آیا کرو، اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کے دل میں کدورت تھی۔ اگر واقعی یہ بات تھی تو کیا حضرت وحشیؓ

کا ایمان معتبر اور صحیح ہو سکے گا اور کیا وہ صحابی کہلانے کے مستحق ہوں گے، علاوہ ازیں جس کی طرف سے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کدورت ہوگی وہ شفاعت کے مستحق ہوں گے۔ الا کل شئ من امر الجاهلية تحت قدمی موضوع ودماء الجاهلية موضوعة وان اول دم اضع دمائنا دم ابن الربيعة ابن الحارث وكان مسترضعاً فی بنی سعد فقتله هذيل۔ واقعہ مذکورہ کے ساتھ یہ قول معارض تو نہ ہوگا۔ نیز ہندہ کی طرف سے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کدورت نہ ہوگی۔ حالانکہ اس نے اپنی ساتھنوں کے ساتھ جاکر میدانِ جنگ میں شہداء احد کا مثلہ کیا تھا اور ناک کان کاٹ کر گلے میں ہار اور ہاتھوں میں کنگن پہنے تھے۔ اور حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبایا تھا۔ اور فتح مکہ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر ماسبق کی تلافی کی استدعا کی اور مغفرت کی دعاء بھی کرائی۔ آپؐ نے اس کو معاف بھی کر دیا اور مغفرت کی دعاء بھی کی۔ اور کسی مفتی کا یہ جواب کہ کدورت کی دو قسمیں ہیں۔ کدورت اختیاری اور کدورت غیر اختیاری نعوذ باللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کدورت غیر اختیاری تھی؟

نیز کدورت اور کینہ کی تعریف بیان فرما کر یہ بتلایئے کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے۔

الجواب:۔ کدورت خواہ بمعنی کینہ ہو خواہ کسی ایسے معنی میں ہو جس میں کسی رذیلہ بشری کی نسبت جناب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم (روحی فداہ وقلبی) کی جانب ہوتی ہو تو درست نہیں۔ آپ کا (صلی اللہ علیہ وسلم) قلب مبارک بالکل مجلیٰ ومصفیٰ تھا۔ دونوں معنی سے آپ مبرا ومنزہ تھے۔ حضرت وحشی رضی اللہ عنہ سے آپؐ کا یہ فرمانا کہ میرے سامنے نہ آیا کرو، یہ ان کی بہی خواہی وہمدردی کے جذبہ سے تھا کہ تمہارے سامنے آنے سے وہ المناک منظر سامنے آجاتا ہے۔ اور تم تائب ہو کر

مومن صادق ہو چکے ہو- اور میرا قلب تم سے منشرح ہو چکا ہے - مبادا اس انشراح میں کوئی فرق نہ آجائے اور تم کو فائدہ پہنچنے میں کمی نہ ہو جائے، کیونکہ افادہ کے لئے مفید کا قلب مستفید کی جانب سے جتنا ہی زیادہ منشرح رہے گا اتنا ہی زیادہ اسس کو نفع پہنچے گا-

لہٰذا آپؐ کے اس فرمانے سے حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کے صحابی کہلانے میں یا ان کے مستحق شفاعت ہونے میں ذرہ برابر بھی شبہ نہ ہو گا اور نہ تو الا کل شئی من امر الجاھلیۃ الخ کے معارض ہی ہو گا- اور نہ تو حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں توبہ وصداقت ایمان کے بعد کسی کدورت وغیرہ کا شبہ ہی نہ ہو گا- حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے باب تربیت میں ایک موقعہ پر جو اس واقعہ سے استدلال فرمایا ہے اس سے آپؐ کے لئے کسی اذ قبیلہ بشری کا ایہام تک نہیں ہوتا-

رہ گیا اس شبہ کا جواب کہ حضرت ہندہؓ کے بارے میں سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کیوں نہیں ہے- سو اس کے مختلف وجوہ واسباب ہو سکتے ہیں منجملہ ان کے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ وہ پردہ میں رہتی تھیں سامنے آتی ہی نہ تھیں کہ اس جملہ کے کہنے کا موقع آئے- اور آپ نے شروع سوال میں جو یہ (مدعی عالم دینؒ) کہہ کر سوال قائم کیا ہے تو اس نے کب اور کس موقع پر کہا یا کس کتاب میں لکھا ہے تفصیل سے پوری بات لکھئے یا کتاب کا حوالہ دیجئے- تاکہ اس سے رجعت کر کے پوری بات سمجھی جا سکے-

کدورت کے معنی ہیں کسی کی جانب سے دل میں کچھ میل آجانا جس سے خوش خیالی بدخیالی سے بدل جائے خواہ بدگمانی تک نوبت نہ پہنچے-

اور کینہ کے معنی ہیں کسی کیجانب سے دل میں بدخیالی اسطرح آجائے کہ اس سے انتقام لینے کا جذبہ قلب میں پیدا ہو جائے گو مستور رہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

حکومت کے یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا میں شرکت کا حکم

سوال (۹۲) حکومت ہند کی طرف سے ایک ادارہ بنام "یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا" تین چار سال سے قائم ہے جو عوام سے سرمایہ حاصل کر کے اسے کاروبار میں لگاتا ہے اس کے ایک حصہ کی قیمت ۱۰/ روپیہ ہے۔ اور بازار میں دس روپیہ بیس پیسے یا پچیس پیسے ہے۔ اس طرح کمی بیشی کے ساتھ ملتے ہیں۔ اس میں لگائے ہوئے سرمایہ کی تحفظ کی ضامن حکومت ہے اور ہم جب چاہیں اسے بازار میں بیچ سکتے ہیں یا حکومت کو واپس کر سکتے ہیں۔ اس کے منافع کا اعلان منجانب حکومت بذریعہ اخبارات کیا جاتا ہے جو کم و بیش ہوتا ہے۔

ما۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ اس ادارہ میں مسلمانوں کے لئے سرمایہ لگانا جائز ہے یا نہیں؟

مٹ۔ اس کی ایجنسی باقاعدہ قانونی طور پر لے کر کمیشن کی بنیاد پر مسلمانوں سے یا دیگر اقوام سے سرمایہ حاصل کر کے کیا اس ادارہ کو دینا جائز ہے؟

الجواب:۔ (ما و مٹ) اس ادارہ میں مسلمانوں کے لئے سرمایہ لگانا بھی جائز ہے اور اس کی ایجنسی باقاعدہ اور قانونی طور پر لینا بھی جائز ہے اسی طرح کمیشن سے اگر وہی صورت مراد ہے جو اوپر سوال میں ہے کہ مثلاً دس روپیہ کا حصہ دس روپے بیس پیسے یا پچیس پیسے میں فروخت کرنا ہوتا ہے تو اس کی بھی شرعاً اجازت ہے۔ اور اگر کمیشن کی کوئی اور صورت ہے تو اس کو لکھ کر حکم شرعی معلوم فرمائیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند

۱۸/۱۰/۹۵ھ

امام شافعی ہو اور مقتدی حنفی یا اس کے برعکس، ہو تو نماز کس طرح پڑھیں

سوال (۹۳) ۱۔ ہم یہاں دبئی میں ہندو پاک کے مسلمان حنفی ہیں اور یہاں عرب ممالک میں اکثریت شافعی لوگوں کی ہے۔ اس لئے نماز دغیرہ میں زیادہ تر شافعی مسلک کے طریقہ پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس وقت یہاں غروب ۶ بجے ہوتا ہے اور حنفی وقت نماز عصر ۴ ½ پر ہوتا ہے لیکن شوافع کی اکثریت کیوجہ سے عصر کا وقت پونے چار ہوتا ہے یعنی غروب سے سوا دو گھنٹہ قبل ہوتا ہے اس صورت میں حنفی کی اقتدار شافعی امام کے پیچھے وقت پر ہو سکتی ہے یا نہیں ؟

۲۔ اکثر مساجد میں امام حنفی ہیں وہ بھی شافعی وقت پر نماز عصر کی امامت کراتے ہیں، ان کے پیچھے شافعی اور حنفی مقتدیوں کی نماز صحیح ہو سکتی ہے ؟

۳۔ حنفی شخص شافعی وقت پر اذان سنکر فوراً منفرداً نماز ادا کر سکتا ہے۔ (اذان غروب سے ۲ ½ گھنٹہ قبل ہوتی ہے)۔

۴۔ اگر اس طریقہ پر نماز نہیں ہوئی تو حنفی لوگ کیا کریں، کیونکہ اگر حنفی وقت پر نماز با جماعت ہونے لگے اور تمام حنفی لوگ جو تعداد میں وطنی شافعی لوگوں سے زیادہ ہیں اپنی الگ جماعت کریں تو فتنے کا اندیشہ ہے، ایسے ماحول میں کیا کیا جائے۔ ؟

۵۔ اگر شافعی وقت پر حنفی کی عصر ہو سکتی ہے تو اگر کسی حنفی کی ظہر باقی ہے تو اس سے پہلے پہلے ادا کر سکتا ہے۔ ہم نے معتبر حنفی علماء سے دریافت کیا گجرات کے ایک معتبر مفتی نے ہم سے زبانی صاف انکار کیا تھا کہ اس طرح نماز صحیح نہیں ہو گی۔ ہاں اگر نفل کی نیت سے عصر کی فرض میں شامل ہوں گے تو نفل ہو جائے گی اور حنفی وقت پر نماز عصر ادا کرنا لازمی ہے۔ دوسرے مولانا صاحب نے بتلایا کہ میں خود شافعی وقت پر ادا کرتا ہوں اس کی گنجائش نکلتی ہے۔ آپ

فیصلہ فرمائیں۔؟

ﻧﻤ۶۔ نماز فجر میں دوسری رکعت میں عرب حضرات قنوت نازلہ پڑھتے ہیں۔ بعض امام بعد قرأت اور بعض قومہ میں، اس کے بارے میں حنفی امام و مقتدی کیا کریں۔؟

ﻧﻤ۷۔ جہری نمازوں میں سورہ فاتحہ کے بعد شافعی امام تھوڑی دیر خاموش رہتے ہیں اس وقفے میں مقتدی الحمد شریف پڑھتے ہیں، اس وقت حنفی مقتدی کیا کرے، کیا حنفی امام شافعی مقتدیوں کی رعایت میں اس طرح خاموش رہ سکتا ہے کیونکہ اگر امام چھوٹی سورت پڑھتا ہے تو مقتدی الحمد پوری نہیں پڑھ سکتے۔

ﻧﻤ۸۔ تراویح میں نہایت مختصر قعدہ اخیرہ کیا جاتا ہے، جس میں مقتدی درود دعاء نہیں پڑھ سکتے ہیں اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد فوراً دوسری رکعت شروع ہو جاتی ہے، کیا مقتدی اپنے طور پر درود و دعاء کے بعد سلام پھیر کر امام کی نماز میں تھوڑی تاخیر سے (مثلاً الحمد کے ختم تک) شامل ہو سکتا ہے؟

ﻧﻤ۹۔ رمضان میں شافعی حضرات وتر با جماعت ادا کرتے ہیں اور دو رکعت ایک سلام سے اور ایک رکعت دوسری سلام سے تو کیا ان کی اقتدار حنفی کر سکتے ہیں؟۔

ﻧﻤ۱۰۔ عیدین کی نماز کی نیت سے پتہ چلتا ہے کہ شافعی حضرات سنت کی نیت کرتے ہیں اور ہم حنفی واجب کی۔ اس طرح ہماری نماز صحیح ہوگی یا نہیں

ﻧﻤ۱۱۔ جمعہ کے خطبۂ ثانی میں اور عیدین میں اہتمام سے مقتدی ہاتھ اٹھا کر آمین کہتے ہیں یہ ہمارے لئے جائز ہے؟

ﻧﻤ۱۲۔ سری نماز میں امام کو کتنی آواز سے قرأت کرنی چاہئے اور جہری میں کتنی؟ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ سری میں اتنے زور سے پڑھے کہ خود کان

میں آواز پہنچے، کیا صرف زبان ہلانے سے اور مخرج نکالنے سے نماز نہیں ہوگی؟

نمبر۱۳- صدقۂ فطر کس پر واجب ہے اور کسے دینا چاہیئے؟ زکوٰۃ اور صدقۂ فطر مسجد میں دے سکتے ہیں۔؟

نمبر۱۴- یہاں دلی میں اسپتال کے قانون کے مطابق بچہ پیدا ہونے کے فوراً بعد اذان دینے کی ممانعت ہے اور تین چار روز کے بعد جب چھٹی ہوتی ہے تب اذان کہی جاتی ہے، کیا اس میں کوئی حرج ہے؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب:- (نوٹ) پہلے چند فقہی عبارتیں پیش کی جاتی ہیں۔ پھر اصل جواب نقل ہوگا۔

نمبر۱ وقت الظهر من زواله ... الی بلوغ الظل مثليه وعنه مثله وهو قولهما وقول زفر والائمة الثلاثة. قال الامام الطحاوی وبه ناخذ وفی غرر الاذكار وهو الماخوذ به وفی البرهان وهو الاظهر لبيان جبرئيل وهو نص فی الباب وفی الفيض وعليه عمل الناس اليوم وبه يفتی — (در مختار علی هامش الشامی ص۲۴۰ ج۱)۔

نمبر۲ وقوله وعليه الناس اليوم الخ والاحسن ما فی السراج عن شيخ الاسلام ان الاحتياط ان لا يوخر الظهر الی المثل وان لا يصلی العصر حتی يبلغ المثلين (الی قوله) وانظر هل اذا لزم من تاخيره العصر الی المثلين فوت الجماعة يكون الاولی التاخير ام لا والظاهر هو الاول بل يلزم عن اعتقد رجحان قول الامام (ثم الی قوله) لو كان امام محلته يصلی العشاء قبل غياب الشفق الابيض فالافضل ان يصليها وحده

بعد البیاض۔ (شامی ص۲۴۰ ج۱)۔

۳ وادنی الجھر اسماع غیرہ وادنی المخافتہ اسماع نفسہ (در مختار علی ہامش الشامی ص۳۵۹ و۳۵۸ ج۱)

۴ قولہ وادنی الجھر الخ (بعد بحث طویل) وذکر (ای الرملی) ان کلا من قولی الھندوانی والکرخی مصححان وان ما قالہ الھندوانی اصح وارجح لاعتماد اکثر علمائنا علیہ (شامی ص۳۵۹ ج۱)

(اب جواب نمبروار درج ہے)

جواب سوال ۱ (الف) حنفیہ کے مفتی بہ وقت سے پہلے حنفی کا اقتداء کرنا مفتی بہ قول کے خلاف ہوگا (بحوالہ عبارت ۲)

(ب) عبارت ۱ و ۲ سے معلوم ہوا کہ جو حنفی اس مسئلے میں حضرت امام طحاوی کی اتباع کرتا ہو، اور ان کے قول کے مطابق صاحبین کے قول کو کہ وہ بھی امام ابوحنیفہ ہی کا ایک قول ہے راجح سمجھتا ہو جیسا کہ صاحب عزرالافکار و برہان وفیض نے سمجھا ہے وہ اگر امامت کرے یا اقتداء کرے تو نکیر نہیں کی جاسکتی، اور باقی احناف جو امام کے ظاہر قول کو اور جمہور احناف کے مفتی بہ قول کو لیتے ہیں اس کا حکم آگے آتا ہے۔

(ج) نہیں ادا کرسکتا۔

(د) اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو نفل کی نیت سے ان کے ساتھ شریک ہوجائیں پھر بعد میں اگر جماعت کرسکیں تو جماعت سے پڑھ لیں ورنہ منفرد پڑھ لیں۔

(ہ) پہلے ظہر پڑھے پھر عصر پڑھے۔ جس جگہ جماعت عصر ہو رہی ہو وہاں سے ہٹ کر دوسری جگہ گھر میں یا جہاں مناسب ہو پڑھیں۔ ہاں اگر شافعی جماعت عصر کے بعد فقہ حنفی کے مطابق اتنا وقت بچتا ہو کہ ظہر پڑھ کر پھر عصر کا وقت شروع

ہوگا تو رفع فتنہ کے لئے نفل کی نیت سے ان کی جماعت میں شریک ہوجائیں پھر بعد میں ظہر پھر عصر پڑھیں۔

جواب سوال ۲ ۔ اگر امام حنفی ہے تو قرأت کے بعد نہ پڑھیں بلکہ قومہ میں پڑھیں اور حنفی مقتدی آہستہ آہستہ آمین کہتے رہیں، اور اگر امام شافعی ہو تو قومہ میں پڑھے تو حنفی مقتدی بھی آہستہ آہستہ آمین کہتے رہیں، اور اگر بعد قرأت پڑھے تو حنفی مقتدی خاموش کھڑے رہیں۔

۳ ۔ (الف) حنفی مقتدی خاموش کھڑے رہیں۔

(ب) حنفی امام اس صورت میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اطمینان سے پڑھ کر ختم سورۃ کرے اور شوافع حضرات سورۃ فاتحہ پڑھیں۔ اگر کچھ سورۃ فاتحہ باقی رہ جائے تو ختم سورۃ سے قبل قبل پوری کرلیں۔

۴ ۔ حنفی امام کو بھی تراویح کے قعدہ اخیرہ میں التحیات الخ کے ساتھ درود شریف پڑھ لینا چاہئے، درود شریف پڑھنا بھی بہت اہم ہے۔ اگر کوئی امام جلدی سلام پھیر دے لیکن مقتدی کو درود شریف پڑھ کر رکعت مل جانے کا ظن غالب ہو تو درود شریف پورا کرکے سلام پھیرنا چاہئے۔

۵ ۔ حنفی حضرات اپنی جماعت وتر بعد میں جہاں مناسب ہو علیحدہ کریں اگر ان کے ساتھ جماعت میں شریک ہونا ہی پڑے تو دو رکعت نفل کی نیت کرکے شریک ہوں اور دوسرے رکعت کے سلام پر اپنی یہ نماز ختم کردیں۔ اور پھر مستقل دو رکعت نفل کی نیت کرکے شریک جماعت ہوجائیں اور جب امام سلام پھیرے تو اپنی ایک رکعت مثل مسبوق کے پوری کرلیں۔

۶ ۔ ایسی صورت میں بھی حنفیہ کا اقتداء کرلینا صحیح ہے کما فی الشامی ص ۳۷۸/۱ تحت مطلب فی الاقتداء بشافعی اھ۔

۷ - اس طرح دعار کرنا اس موقع پر ثابت نہیں ہے نہ کریں -

۸ - امام کرخی کی تخریج کے مطابق محض تصحیح حروف کے ساتھ ادائیگی بھی کافی ہے خواہ اس کی آواز کانوں تک نہ پہنچے اور امام ہندوانی کی تخریج کے مطابق اس طرح پڑھے کہ اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو خود قاری کے کانوں تک آواز پہنچ سکے - اور دونوں تخریجیں صحیح ہیں البتہ زیادہ علمار و مشائخ ہندوانی کے ساتھ ہیں جیسا کہ عبارت ۳ و ۴ سے معلوم ہوتا ہے اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ اس طرح پڑھیں کہ اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو خود قاری کے کانوں تک آواز پہنچ سکے -

۹ - جس کے پاس ضرورت سے زائد بالکل فاضل چیزیں نصاب کی مقدار موجود ہوں اس پر صدقہ فطر ادا کرنا واجب ہوتا ہے اور جو شخص زکوٰۃ لینے کا مستحق و مصرف ہو وہی اس کا بھی مستحق و مصرف ہے مسجد کے کسی کام میں زکوٰۃ و فطرہ دینا جائز نہیں۔ اگر دیں گے تو زکوٰۃ و فطرہ ادا نہ ہوگا -

۱۰ - بچہ پیدا ہونے کے بعد پنجگانہ کی اذان کی طرح بلند آواز سے اذان دینا ضروری نہیں ہے بلکہ سنت یہ ہے کہ بچہ جب آلائش و گندگی سے پاک کر لیا جائے تو اس کو قریب کر کے پہلے دایاں کان سامنے کر کے کلمات اذان صرف ایسی آواز سے کہدیں کہ آواز بچہ کے کان تک پہنچ جائے - پھر اسی طرح بایاں کان سامنے کر کے اقامت کے کلمات ایسی آواز سے کہدیں کہ آواز بچہ کے کان تک پہنچ جائے اور بس - اور یہ صورت قانون ہسپتال کے خلاف بھی نہ ہوگی اور سنت بھی ادا ہو جائے گی - فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ -

الجواب صحیح محمود عفرلہ دارالعلوم دیوبند - ۱۰/۱۱/۹۵ھ

ٹیلیویزن کے بارے میں شرعی حکم

سوال (۹۴) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں ؟

ٹیلیویزن بنانا، مرمت کرنا، اس کا خریدنا بیچنا یا اس کی تجارت کرنا، چالو ہونے کی حالت میں اس کے اندر ظاہر شدہ مناظر کا دیکھنا یا سننا وغیرہ شرعاً جائز ہے یا نہیں، امید کہ تفصیل سے جواب دے کر مشکور فرمائیں گے۔ فقط۔

الجواب :- (۱) ٹیلیویزن ناجائز کاموں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور سنجیدہ و جائز مقاصد کے اعلان کا بھی ذریعہ ہے اور واضع کی غرض بھی محض لہو و لعب نہیں ہے۔ اس لئے اس کو محض آلۂ لہو و لعب نہیں کہا جاسکتا ہے البتہ اس کا استعمال اکثر و بیشتر لہو و لعب میں ہی ہونے لگا ہے۔ اس لئے اکثر محتاطین نے اس کے استعمال کو علی الاطلاق ناجائز فرمادیا ہے اور وہ سدًّا للباب صحیح بھی ہے اور اس کا تحقیقی حکم بندہ کے نزدیک ایک تفصیل پر موقوف ہے اور وہ یہ ہے کہ اس آلہ میں جو چیزیں نظر آتی ان کی دو حیثیت ہے۔

حیثیت (۱)۔ ان چیزوں کا دیکھنا، سننا اور اس آلہ کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنا۔

حیثیت (۲)۔ ان چیزوں کا خود بنانا۔ دیکھانا۔ سنانا، ان دونوں شقوں کے احکام مختلف اور الگ الگ ہیں، "شق (۱)" کا حکم شرعی یہ ہوگا کہ ان کا جواز یا عدم جواز ان چیزوں کے محض عکس یا فوٹو ہونے میں دائر و منحصر نہ ہوگا بلکہ اس کے استعمال کا جواز و عدم ان ضابطوں پر دائر ہوگا۔

ضابطہ (۱) :- جو چیزیں اس آلہ میں سنائی دیں یا نظر آئیں اگر ان کا دیکھنا یا سننا بغیر اس آلہ کے جائز ہے تو اس آلہ کے ذریعہ بھی ان کا دیکھنا یا سننا جائز رہے گا، جیسے جائز خبر و کلام وغیرہ سننا۔ جو بغیر باجے وغیرہ آلات لہو کے ہوں

اور جیسے کسی غیر ذی روح کا فوٹو دیکھنا جس میں اور کوئی شرعی قباحت نہ ہو جس کا تذکرہ آئندہ آئے گا اس کا دیکھنا -

ضابطہ ۲ :- جن چیزوں کا بغیر اس آلہ کے بھی دیکھنا یا سننا ناجائز ہے ان کا اس آلہ میں بھی دیکھنا یا سننا ناجائز رہے گا، جیسے ناجائز کلام کا سننا یا جائز ہی کلام ہو مگر باجے وغیرہ آلات لہو کے ساتھ ہو، یا مثلاً عریاں وفحش سین ومنظر نظر آئے، بلکہ ہر وہ شئ جو نفسیاتی طور پر کسی بُری خواہش میں ہیجان پیدا کرنے والی ہو یا ہیجان پیدا ہونے کا مظنہ ہو، ان سب چیزوں کا دیکھنا اور سننا حرام رہے گا خواہ بذریعہ عکس نظر آئیں یا بذریعہ فوٹو محض عکس وفوٹو کے اعتبار سے اس حکم میں کوئی فرق نہ ہوگا -

اور شق ۲ یعنی بنانے، دیکھانے یا سنانے کا حکم اس میں یہ تفصیل ہے کہ (الف) اگر یہ عمل فوٹو کے ذریعہ ہو اور فوٹو ذی روح کا ہو تو اس کا بنانا، دیکھانا وغیرہ سب بالکل حرام وناجائز ہوگا۔ خواہ شق ۱ کی خرابیاں اس میں منضم ہوں یا نہ ہوں -

(ب) :- اگر فوٹو غیر ذی روح کا ہو، مگر اس سے کفر یا شرک کے کسی شعار کا اعزاز یا اس کا تعاون ہوتا ہو تو اس کا بھی بنانا دیکھانا سب ناجائز وحرام رہے گا -

(ج) :- اگر یہ خرابیاں نہ ہوں تو ان کا بنانا، دیکھانا سب جائز رہے گا -

اگر یہ عمل فوٹو کے ذریعہ نہ ہو بلکہ صرف عکس کے ذریعہ ہوتا ہو تو چونکہ عکس لینا اور ڈالنا اپنی قدرت اور اختیار سے ہوگا، اس لئے اس قدرت اور اختیار کو بے محل اور غلط طریقہ سے استعمال کرنے پر عند اللہ گرفت ومواخذہ ہوگا اور انجام ونتائج کے اعتبار سے اس کا عکس لینے اور ڈالنے کا حکم بھی وہی ہوگا جو فوٹو کا الف، ب میں مذکور ہوا -

اس لئے الف، ب کے موقعہ میں اس عکس کے ذریعہ سے بھی دیکھنا سننا ناجائز رہے گا۔ اور اس کا عکس لینے اور ڈالنے کو خود عکس پڑ جانے پر قیاس نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ عکس پڑ جانا یہ اپنی قدرت و اختیار میں نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے یہ عکس جو خود پڑ جائے خواہ دھوپ میں ہو یا پانی میں یا آئینہ وغیرہ میں ہو اگرچہ کتنا ہی فحش و عریاں وغیرہ ہو یا معصیت کا ہو، اگر اس پر نگاہ اچانک پڑ جائے تو چونکہ یہ نگاہ پڑ جانا بھی اپنی قدرت و اختیار سے نہیں ہے اس لئے اس نگاہ پڑ جانے پر اول وہلہ میں کوئی گرفت یا مواخذہ بھی عنداللہ نہیں ہے۔ البتہ اگر اس پر نگاہ قائم رکھی جائے ہٹائی نہ جائے یا ہٹا کر دوبارہ ڈالی جائے تو چونکہ یہ نگاہ قائم رکھنا یا دوبارہ ڈالنا اپنے قدرت و اختیار میں ہے، اس لئے یہ حرام و گناہ ہوگا امید ہے کہ اس تفصیل سے ٹیلی ویژن کی ساری شقوں کا شرعی حکم نکل آیا خواہ ان میں محض عکس تسلیم کیا جائے یا اور کچھ اس سے حکم شرعی میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند

حرام روپیہ ہونے کی صورت میں حج کرنے کا حیلہ

سوال (۹۵) ہمارے اطراف میں ایک رواج حج کے سلسلہ میں ہو گیا ہے وہ یہ کہ خواہ زید کو فریضۂ حج ادا کرنا ہو یا نفل حج جب زید کے پاس اتنے روپے جمع ہو جاتے ہیں کہ حج فرض ہو جائے یا فرض ادا کرنے کے بعد اتنے روپے جمع ہو گئے کہ وہ نفل حج کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور دونوں صورتوں میں زید کے پاس جو روپے حج کے لئے ہیں زید کو یہ یقین ہے اور شرعاً بھی ایسا ہی ہے وہ روپے حرام آمدنی کے ہیں، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ روپے حرام کمائی کے ہیں۔ زید اس حرام روپے کو پاک کرنے

کے لئے یہ حیلہ کرتا ہے کہ کسی کافر سے اتنے روپئے قرض لیتا ہے اور اپنے پاس کا روپیہ کافر کو دیدیتا ہے، آیا کافر سے جو روپیہ قرض لیا (بطور بدلین) وہ روپیہ حلال آمدنی شرعاً شمار کیا جائے گا اور اس سے حج جائز ہوگا؟ نیز یہ حیلہ کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

امید کہ جواب شافی مدلل و مفصل بحوالہ تحریر فرمایا جاوے گا۔

الجواب:- حرام روپئے کو پاک کرنے کا یہ طریقہ غلط ہے اس سے حرام روپیہ پاک نہ ہوگا بلکہ اور وبال بڑھ جانے کا اندیشہ ہے، حرام روپیہ جیسے چوری کا ہو یا غصب کا یا رشوت کا یا سود کا مثلاً۔ اس کا حکم تو یہ ہے کہ اصل مالک مل جائے تو اس کے ملک میں کسی حیلہ سے پہنچا دیا جائے ورنہ اس کے وبال سے بچنے کے لئے یہ یکمشت یا باقساط کسی محتاج غریب کو بطور صدقہ دے کر اپنی ملک سے نکال دے۔ اور حرام قطعی کا روپیہ نہیں ہے بلکہ عقودِ فاسدہ کی آمدنی ہے تو اس میں کچھ تفصیل ہے، اور قرض لینے والا وہ حیلہ تو محض اسصورت کا ہے کہ کسی شخص پر حلال کمائی سے جو حج فرض ہوگیا تھا، اور حج نہ کرسکا اور یہ روپیہ ختم ہوگیا اور اب جو روپیہ ہے وہ حلال وطیب نہیں ہے تو کسی سے قرض لے کر حج سے سبکدوشی کرے اور وہ روپیہ قرض میں دیدے۔ باقی سب بڑی گستاخی اور خطرناک جرم ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۱۱/۱/۹۶ھ

ہندوستان کی زمین اسوقت عشری ہیں یا خراجی	**سوال** (۹۶) ہندوستان کی

زمین عشری ہیں یا خراجی، بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ ہندوستان کی زمینیں موجودہ دور میں نہ عشری ہیں اور نہ خراجی۔ آیا یہ قول صحیح ہے یا نہیں

بصورت صحت تحریر فرمائیں کہ وہ کونسی بنیادیں ہیں جن کے سبب آج ہندوستان کی زمینوں کو عشری اور خراجی ہونے سے خارج کر دیا گیا ہے۔ جب کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے فتاؤوں میں ہندوستان کی زمینوں کے عشری ہونے کا حکم متعدد علماء و مفتیان کرام سے موجود ہے۔ مثلاً مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی مفتی کفایت اللہ صاحبؒ و مفتیان دار العلوم دیو بند۔ مزید برآں عشر و زکوۃ کی فرضیت مطلقاً قرآن و حدیث و فقہاء حنفیہ سے ثابت ہے جس میں دار الحرب و دار الاسلام کا کوئی فرق نہیں ہے۔

ہندوستان کی وہ زمینیں جنہیں سیر دھری یا کاشتکاری کہا جاتا ہے، جس میں ہندوستانی قانون کے مطابق خرید فروخت تعمیر گڈھا کنواں وغیرہ کھدوانا ممنوع ہے بیس گنا جمع کرنے کے بعد مکمل تصرفات کے اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔ ان کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ وہ میراث میں داخل ہو کر شرعی طور پر تقسیم ہوں گی یا کیا حکم ہوگا، صاحب زمین کے انتقال کے بعد وہ ترکہ ہو کر وارثوں کا حق بن جائیں گی جب کہ حکومت ہند اس میں وراثت جاری کرتی ہے۔ لیکن بھومیدھر زمین و سیر دھر زمین کے وارثوں میں فرق کیا ہے۔ مثلاً سیر دھری لڑکی نہیں پا سکتی بلکہ لڑکے اس کے مستحق ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

الجواب:- خاتمہ زمینداری میں جن زمینوں کو حکومت نے اپنے قبضۂ تصرف میں لے لیا اور ملک مالکان ختم کر دیا، وہ مالکوں کی ملک سے نکل کر حکومت کی ملک میں داخل ہو گئیں۔ اور وہ زمینیں چاہے پہلے عشری رہی ہوں لیکن اب عشری باقی نہیں رہیں، اس لئے کہ عشریت باقی رہنے کے لئے شرط ہے کہ کبھی ملک غیر مسلم میں نہ جائیں۔ پھر ان زمینوں میں سے جس زمین کو حکومت نے بیس گونے وغیرہ لے کر اپنے قاعدہ و ضابطہ کے تحت قابضین کے ملک میں دیدیا

اور اس پر ان کو حق مالکانہ دیدیا اس زمین کے وہ قابضین مالک ہو گئے اور ان میں وراثت حسب تخریج شرعی جاری ہوں گی اور یہ زمینیں خراجی ہو گئیں، اور خراجی زمین میں عشر نہیں واجب ہے، اور جن زمینوں پر حق مالکانہ نہیں دیا وہ ملک حکومت میں باقی رہیں اس کو حکومت جس کو جس طرح چاہے دے اس کے اختیار میں ہے اس میں وراثت شرعی جاری نہ ہوگی اس کی مثال سیر دھری کی زمینیں ہیں اور یہ زمینیں نہ خراجی ہیں اور نہ عشری بلکہ اراضی محوزہ سلطانیہ کے درجہ میں ہیں۔ اور ان زمینوں کی پیداوار میں سے عشر نکالنا ضروری نہ رہیگا اور جن زمینوں کا زمیندارہ نہیں ٹوٹا اور حکومت نے ان کو اپنے قبضہ تصرف میں نہیں لیا جیسے باغ مالکان اور مکان کی زمینیں اگر یہ عشری زمین میں ہیں، اور خاتمہ زمیندارہ کے قانون سے مستثنیٰ ہیں تو یہ عشری شمار ہوں گی، اور ان کی پیداوار پر عشر واجب ہوگا نیز جن زمینوں کی عشریت ختم زمیندارہ قانون سے ختم ہو گئی ان سے محض وجوب ساقط ہوا ہے لیکن احتیاط اس میں ہے کہ بغرض حصول خیر و برکت جہاں تک ہو سکے عشر و نصف عشر نکالتے رہا جائے۔ اس قسم کے مباحث باب الرکاز ج ۲ شامی اور باب العشر والخراج شامی ج ۳ میں بھی کافی مل جائیں گے

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند

اذان کے وقت وضو کرتے ہوئے وضو کی دعا پڑھنے کا حکم

سوال (۷۹) (۱) وضو کرتے وقت اگر اذان ہو رہی ہو تو کیا جو دعائیں وضو کے عضو دھوتے کے وقت حضورؐ سے منقول ہیں وہ پڑھنی چاہئے یا اذان کا جواب دینا چاہئے۔

(۲) :۔ کیا تصویر (جاندار) کی طرف دیکھنا بھی گناہ ہے۔ اگر جاندار کی تصویر نگی ہوئی نہ ہو یعنی سامنے نظر نہ آتی ہو لیکن کسی طرح چھپی ہوئی ہو تو ایسی تصویر دیکھنا

بھی گناہ ہے (مثلاً کسی کتاب کے اندر تصویر کا ہونا اخبار کے اندر کے ورقوں پر جاندار تصویر کا ہونا وغیرہ۔

۳ :- انگریز لوگ جب ان کی کرسمس ہوتی ہے تو مسلمان کے گھر میں بھی اکثر کرسمس کارڈ بھیجتے ہیں تو کیا مسلمان کو بھی (اخلاقاً) جن انگریز نے اس کے گھر کارڈ بھیجا ہے کرسمس کارڈ بھیجنا جائز ہے۔

۴ :- جب اذان میں مؤذن حی علی الصلوٰۃ کہے تو منھ کب پھیرے اور کہاں تک تفصیل سے لکھیں۔

الجواب :- (۱) بہتر ہے کہ کلمات اذان کا جواب دیا جائے۔

۲ :- عزت وعظمت و محبت یا رغبت وشہوت یا بد نگاہی کے جذبہ سے دیکھنا منع ہے۔

۳ :- ہاں اپنے عید وغیرہ خوشی کے موقع میں اخلاقاً مسلمان بھی بھیج سکتے ہیں

۴ :- جب حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کہنا شروع کرے تو منھ پھیرے اور پورا چہرہ پھیرے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۹۶/۱/۲۵ھ

کافر ہمسایہ کے جنازہ میں جانے کا حکم

سوال (۹۸) (۱) کافر ہمسایہ کے جنازے میں جانا جائز ہے یا نہیں اگرچہ وہ جا کر نماز جنازہ (چاہے کیسے ہی وہ کرتے ہوں) نہ بھی پڑھے۔

۲ :- اگر مقتدی کی ثناء ختم ہونے سے پہلے ہی امام قرأت شروع کردے تو مقتدی جو ثناء باقی رہ گئی تھی کب ختم کرے۔

۳ :- جمعہ کو دوسری اذان کا جواب جائز ہے یا نہیں، صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم)

کا کیا معمول تھا۔

الجواب :۔ (۱) ساتھ نہ جانا چاہئے ہاں تعزیت و تسلی و تسکین کے لئے ایسے افعال و اقوال کی گنجائش ہے جس میں ایہام شعار و کفر و شرک میں شرکت اور اعزاز کا نہ ہو۔

ﻟ۲ :۔ اگر شنار کا ایک آدھ لفظ باقی رہ گیا تو پورا کرلے ورنہ خاموش ہو کر قرأت کی جانب متوجہ ہوجائے یا ختم سورہ فاتحہ تک درمیان وقفہ میں پورا کرلے۔

ﻟ۳ :۔ جمعہ کی دوسری اذان کا جواب حاضرین کو زبان سے دینا ثابت نہیں ہے۔ امام دے سکتا ہے جیسا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے ممبر پر دینا ثابت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ نظام الدین عفر لہ

دارالعلوم دیوبند ۹۶/۱/۲۵ھ

حضور ؐ نے کبھی کوئی پھل کھڑے ہو کر کھایا ہے یا نہیں

سوال (۹۹) (۱) کیا یہ صحیح ہے کہ حضور ؐ کبھی کبھی پھل وغیرہ کھڑے کھڑے بھی کھالیا کرتے تھے مگر کھانا وغیرہ یعنی روٹی وغیرہ ہمیشہ بیٹھ کر ہی کھایا کرتے تھے۔

ﻟ۲ (الف) سوتے وقت میں تین قل پڑھنا سنت ہے یا چار قل، قل پڑھنے کے بعد چونکہ ہاتھ پر پھونک مار کر سارے بدن پر دم کرنا بھی سنت ہے۔ تو کیا یہ عمل ہر تین یا چار قل پر کرنا سنت ہے یا کہ تین مرتبہ یہ تین یا چار قل پڑھ کر ایک ہی مرتبہ سنت ہے

(ب) کیا یہ صحیح ہے کہ حصن حصین میں یہ لکھا ہے کہ حضور ؐ سونے سے پہلے آیۃ الکرسی تین مرتبہ بستر پر لیٹتے ہوئے پڑھتے تھے۔

ﻟ۳ :۔ کیا یہ صحیح ہے کہ حضور ؐ اذان کے بعد کی دعا اتنی آواز سے پڑھا کرتے تھے کہ صرف ساتھ بیٹھنے والا شخص سن سکتا تھا۔

الجواب :- ہاں سچ ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ لوگ چلتے چلتے کچھ پھل یا پان وغیرہ کھا لیتے ہیں، اور مروجہ طریقہ دعوتوں وغیرہ میں کھڑے کھڑے کھانا ثابت نہیں، اور اس کی مشابہت بھی جائز نہیں۔

۲ :- (الف) یہ سب ہی سنت سے ثابت ہے، چاروں قل بھی پڑھ سکتے ہیں اور ہاتھ میں پھونک کر بدن پر ہاتھ پھیرنا علاجاً تھا تاکہ آفات و بلیات سے تحفظ رہے۔ ضروری نہیں ہے، اور اختیار ہے ہر بار بدن پر ہاتھ پھیریں یا صرف اخیر میں۔

(ب) ہاں یہ بھی ثابت ہے۔

۳ :- ہاں صحیح ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۹۶/۱/۲۵ھ

نمازی کے آگے سے ہٹنے کا حکم

سوال (۱۰۰) اگر میں کسی نمازی کے بالکل آگے بیٹھا ہوا ہوں اور وہ نمازی نماز میں مشغول ہے تو کیا میں اگر اپنی جگہ سے ہٹ کر کسی اور جگہ جانا چاہتا ہوں تو ہٹ سکتا ہوں۔ کیا بیٹھے رہنا اور نمازی کے نماز کا ختم کرنے کا انتظار کرنا زیادہ اولیٰ ہے۔

الجواب :- ہاں بیٹھے رہنا اور ختم نماز کا انتظار کرنا اولیٰ ہے اور ہٹ جانا بھی درست ہے۔ البتہ نمازی اگر دائیں جانب کچھ ہٹا ہوا ہو تو اس کے بائیں جانب سے ہٹے، اور اگر بائیں جانب کچھ ہٹا ہوا ہو تو اس کے دائیں جانب سے ہٹے اور بالکل ہی محاذاۃ میں ہو تو ہر طرف سے ہٹ سکتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۹۶/۱/۲۵ھ

انگریزی دوا کے استعمال کا حکم

سوال (۱۰۱) اکثر انگریزی دواؤں میں الکوحل ڈالے (اسپرٹ) جاتے ہیں تو کیا مسلمان کے لئے اس دوا کا استعمال کرنا جائز ہے، مسلمان اگر دواؤں کے بنانے کا کام کرتا ہے، جن دواؤں میں اکثر الکوحل بھی پڑتی ہے تو کیا یہ ہنر جائز ہے۔ اسکول میں اکثر برتن صاف کرنے کیلئے الکوحل استعمال ہوتی ہے اور کسی اور چیز کے بنانے کیلئے بھی استعمال کی جاتی ہے تو کیا یہ فائدہ حاصل کرنا جائز ہے کیا یہ استعمال جائز ہے۔

الجواب:۔ الکوحل اصل میں شراب کے جوہر کو اور تلچھٹ کو کہتے تھے اور شراب چونکہ نجس اور حرام ہوتا ہے اس لئے الکوحل بھی نجس و حرام ہوگا۔ اور اس کا دواؤں میں ڈالنا اور ان دواؤں کا استعمال کرنا ناجائز کہا جاتا تھا۔ اور اب دواؤں میں عام طور پر اسپرٹ ڈالی جاتی ہے اور اسپرٹ کا ان چار شرابوں کی جنس سے ہونا ضروری نہیں جو نجس العین ہوتی ہیں بلکہ گڑ وغیرہ سے بھی بن جاتی ہے، لہٰذا جب تک دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو جائے کہ یہ اسپرٹ جو اس دوا میں پڑی ہوئی ہے وہ انہی شرابوں کا جوہر یا تلچھٹ ہے جو نجس العین ہوتے ہیں اس وقت تک اس اسپرٹ کو ناپاک و نجس نہیں کہہ سکتے اور ان کا استعمال کرنا یا ان دواؤں کا استعمال کرنا جس میں یہ اسپرٹ پڑی ہو ناجائز و حرام نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح اس سے برتن صاف کرنا اور دواؤں میں اس کا ڈالنا بھی ناجائز و حرام نہیں کہہ سکتے۔ یہ فتویٰ ہے اور تقویٰ الگ بات ہوگی۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہٗ

دار العلوم دیوبند ۹۶/۱/۲۵ھ

فیکٹری کی ملازمت کا حکم

سوال (۱۰۲) اگر کوئی مسلمان کسی فیکٹری کا ملازم ہو، اس کا کام یہ ہو فیکٹری کا حساب کتاب کرنا یعنی یہ لکھنا کہ اتنا فیکٹری کا نفع ہوا

اتنا نقصان ہوا، اتنا ویزہ لیا بینک سے اتنا پیسہ سود پر لیا، تو کیا یہ اور ایسے اور ہنر جائز ہے۔ مہربانی فرماکر کے ایسا نقطہ تحریر فرمادیں کہ جس سے اور کاموں سے حلال وحرام ہونے کا استنباط کرسکیں۔

الجواب:- سود لینے اور دینے کا حساب لکھنا بھی ناجائز ہے اور باقی مذکورہ کام اور ان کی ملازمت بھی جائز ہے۔ اگر سود لینے دینے کا حساب لکھنا کسی دوسرے غیر مسلم کلرک کے حوالہ کرکے خود لکھنے سے بچ سکیں تو بچ جائیں اور اگر مجبوری ہو تو دوسری جائز ملازمت تلاش کرتے رہیں اور جب تک نہ ملے اس ملازمت کو نہ چھوڑیں۔ البتہ استغفار کرتے رہیں۔ اور یہ نیت رکھیں کہ جب دوسری جائز ملازمت مل جائے گی تو اس کو چھوڑ دوں گا۔ مجبوری کے درجہ تک گنجائش رہے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفی عنہ

دارالعلوم دیوبند ۹۶/۱/۲۵ھ

کمبریز میں مکان خریدنے کی ایک صورت کا حکم

سوال (۱۰۳) ہم نے کمبریز میں مسلمانوں کی ایک جماعت بنائی ہے جس میں پچیس افراد ہیں۔ یہاں شہر میں کوئی بھی مسجد نہیں ہے جس کی وجہ سے فی الحال کرایہ پر مکان لے کر سب مل کر پانچوں وقت کی نماز اور جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں۔ اور اسی مکان میں مدرسہ بھی چلتا ہے۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی نماز کے لئے کوئی دوسرا بڑا ہال کرایہ پر لے کر نماز ادا کرتے ہیں۔ ہم لوگ مسجد اور مدرسہ کی ملکیت خریدنے کی کوشش میں ہیں فی الحال ہماری سوسائٹی کے پاس اندازاً تین ہزار ڈالر جمع ہوئے ہیں اور اندازاً آٹھ سے نو ہزار ڈالر جمع ہونے کی امید ہے، اتنا مال سوسائٹی کے ۲۵ ممبروں پر ہوگا۔ اور مسجد، مدرسہ کی ملکیت کو خریدنے کے لئے پچاس سے ساٹھ ہزار ڈالر چاہئے

لیکن اتنی رقم کس وقت جمع ہو سکتی ہے وہ خدا کے علاوہ کوئی جان نہیں سکتا۔

یہاں پر تمام لوگ ملازم پیشہ ہیں مثال کے طور پر مسجد اور مدرسہ کے کام چلانے کے لئے پچاس سے ساٹھ ہزار ڈالر کی ملکیت خرید بھی لیں۔ لیکن یہاں پر رواج یہ ہے کہ تمہارے پوری رقم نہ ہو تو جتنی بھی رقم ہو، تمہارے پاس جمع ہوتی ہے۔ جس کو DOWN PAYMEMT کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور بقیہ رقم ہر مہینے ہفتہ واری جمع کریں، جہانتک پوری رقم جمع نہیں ہو جاوے گی وہاں تک بائع تقریباً تیرہ فیصد روپیہ سود مانگتا ہے۔ اگر پچاس سے ساٹھ ہزار کی قیمت کے مکان ہوں تو ہر مہینہ تقریباً چھ سو سے سات سو ڈالر ادائیگی کی رقم ہوتی ہے۔ جس وقت پورے مکان کی قیمت کی ادائیگی نہ ہوگی اسوقت مکان کی قیمت کا سود اصل قیمت سے دو تین گنا زائد ہوگا۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر DOWN PAYMEMT زیادہ دیں تو ماہانہ ہفتہ دار کرائے کی رقم تقریباً برابر ہوتی ہے لیکن اگر DOWN PAYMEMT کم ادا کریں تو ماہانہ ہفتے کی رقم کرائے کی رقم سے دوگنی ہوتی ہے۔ تو کیا سود کے روپیے سے مکان خرید لیں یا کرایہ سے اسی مکان کو چلاتے رہیں۔ فی الحال جو مکان لے رکھا ہے وہ بہت ہی چھوٹا ہے جس کا ماہانہ کرایہ ایک سو ڈالر ہوتا ہے، اور اس مکان میں ۲۵ آدمی نماز پڑھ سکیں ایسا انتظام ہے، بعدہ اس مکان کے دائیں بائیں جانب مسلمانوں کی آبادی ہے نتیجتاً نمازی کو طلبہ کے پڑھنے کی آواز سے تکلیف نہیں ہے۔ لیکن مستقبل میں یہ مکان خالی کرنا پڑے تو بعد میں پھر سے ایک مکان کرایہ پر رکھنا پڑے گا جس کا کرایہ ماہانہ دو سو ڈالر سے تین سو ڈالر تک ہوگا۔ پھر یہاں ایک ساتھ میں سب لوگ کا جمع ہونا جس کو غیر مسلم پسند نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے کرایہ کے مکان میں کبھی بھی تکلیف کا ہونا لازم ہے۔ اس لئے کہ مالک مکان مہینہ کی نوٹس دے کر خالی کرا دیں تب پھر سے مکان کی ضرورت آئے گی۔ ابھی ابھی قریب میں پوری رقم دے کر بھی مکان خرید سکیں ایسی

توقع نہیں ہے، پھر مکان کی قیمت اور کرایہ بھی ہر سال بڑھتا جارہا ہے نتیجتاً مکان بورڈ گیج سے خرید نامناسب معلوم ہوتا ہے، بہت سے مسلمان بھائیوں نے اپنے رہنے کے لئے اس طرح سے مکان خرید لئے ہیں۔ لہٰذا مذکورہ حقیقت کو دھیان دے کر شریعت کی رو سے لکھ کر مہربانی فرمادیں۔

(۱) مطلب یہ ہے کہ جو رقم جمع ہو اس رقم کو DOWNPAYMEMT طریقے سے دے کر بقیہ رقم کو ہر مہینہ یا ہفتہ بھر کر مسجد یا مدرسہ کا مکان خرید سکتے ہیں یا نہیں

(۲):- جو ہم اس طریقہ سے نہ کریں تو مسلمانوں کے لئے ہم کو کیا کرنا چاہئے۔

(۳):- ہر مسلمان اس طرح سے (بورڈ گیج) طریقہ سے مکان استعمال کے لئے خرید سکتے ہیں یا نہیں۔

(نوٹ)، یہاں دنیا کے گوشہ گوشہ سے مسلمان آکر بسے ہوئے ہیں لہٰذا ان سوالوں کا جواب قرآن شریف اور حدیث شریف کی روشنی میں دیں اور بعد میں حنفی مذہب کا حوالہ دے کر مہربانی فرمادیں۔

الجواب:- حسب تحریر ترجمہ سوال تعمیر عمارت کی بیشک اشد ضرورت ہے اور جلد پورا ہو جانا بھی بے حد ضروری ہے۔ پس اگر خرید عمارت کے لئے نقد قیمت کا فراہم ہونا دشوار ہے تو بہتر صورت یہ ہے کہ جن لوگوں کو بینک میں جمع کئے ہوئے سرمایہ پر سود کے نام سے کچھ رقم مل رہی ہو، وہ لوگ اس کو بینک سے نکال کر ضرورت کے مقدار اکٹھا کرلیں۔ پھر کسی غریب مستحق زکوٰۃ شخص کو اس خرید میں چندہ کے ذریعہ شریک ہونے کی ترغیب دے کر اور اس کے فوائد و ثواب بتلا کر اس سے کہا جائے کہ تم اتنے روپے کسی سے قرض لاکر بطور چندہ کے اس کا کے لئے دیدو تمہارا قرض ادا کرادیا جائے گا۔ تم کو بھی اس چندہ دینے کا پورا پورا ثواب ملے گا۔

پھر موقعہ ہو تو قرض بھی اپنے پاس سے دیدیا جائے یا کسی سے دلادیا جائے

پھر جب وہ شخص قرض لاکر بطور چندہ کے یا عطیہ کے دیدے تو وہ سود والا روپیہ اس کو دے کر مالک بنا دیا جائے پھر قرض خواہ اسی وقت یا جب مناسب ہو اپنا قرض اس سے وصول کرے۔ اور یہ بھی کر سکتے ہیں کہ سود والا کل رقم اس مستحق کو اس کام میں شریک ہونے اور عطیہ دینے کا ثواب بتلا کر دیدیں اور دے کر اس کو اس رقم کا مالک مختار بنا دیں، پھر وہ شخص اپنی طرف سے بطور عطیہ کے اس خرید کے لئے دیدے اور اس روپئے سے بجائے ادھار خریدنے کے نقد خرید لیا جائے۔

اور اگر اس طرح نقد خرید لینے میں کالا روپیہ وغیرہ ہونے کا خطرہ ہو تو اس سے قانونی حفاظت کر لی جائے۔ مثلاً یہ کہ فلاں فلاں سے قرض لے کر خریدا ہے یا چندہ سے خریدا ہے وغیرہ ذٰلک۔ یہ صورت حنفیہ کے نزدیک بھی بے ضرر و بے خطر جائز ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفی عنہ

دار العلوم دیوبند ۲۲/۱/۹۶ھ

الجواب صحیح

محمود غفرلہ

فنڈ کا شرعی حکم

سوال (۱۰۴) ۱: سرکاری نوکری کی تنخواہ سے کچھ روپیہ بطور فنڈ کاٹا جاتا ہے اور جتنا یہ فنڈ کٹتا ہے اس میں اس فنڈ کی آدھی رقم گورنمنٹ اس میں شامل کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہمارے ۲۰ روپئے فنڈ کٹا تو سرکار اس میں ۱۰ روپئے اور اپنی طرف سے ملا دیتی ہے، اور پھر ان ۳۰ روپیوں پر سود لگا دیتی ہے کیا یہ دونوں حالت جائز ہے یا صرف ہمارے لئے ہماری اصل رقم جو کہ کٹتی ہے وہ ہی جائز ہے۔

۲: ہماری تنخواہ سے سرکاری طور پر جبراً ۵ روپیہ بیمہ کے کٹتے ہیں ہمارے

رٹائر ہونے تک یہ اصل رقم دو ہزار روپے بنتے ہیں، لیکن رٹائر ہونے پر ہمیں سرکار دو ہزار روپیوں کے ۵ ہزار روپئے دے گی۔ یا اچانک ہم کسی حادثہ کا شکار ہو جاتے ہیں یعنی مرجاتے ہیں تو یہ پیسہ یعنی مبلغ ۵ ہزار روپئے ہمارے لواحقین کو ملتا ہے چاہے ہماری کل رقم یعنی دو ہزار روپئے بھی جمع نہ کئے گئے ہوں کیا یہ دونوں صورت جائز ہیں۔

۳ :- بینک یا ڈاکخانہ میں ہم بذات خود کچھ روپیہ جمع کریں اور اس پر سرکار بطور سود کچھ رقم دے یا سرکاری طور پر کوئی رقم جمع ہو، اور اس پر کچھ روپئے بطور سود ملتے ہیں، تو کیا یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔

۴ :- جو روپیہ ہمیں سود کا ملتا ہے اس کو ہم کسی آدمی کو بتا کر دیں کہ یہ سود ہے تو یہ ڈر ہے کہ وہ یہ نہ سمجھ لے کہ ہم سود خور ہیں۔ کیونکہ پوری بات وہ نہیں سمجھ پاتا تو ایسی صورت میں کیا (الف) سود کی رقم بغیر بتائے کہ یہ سود کا پیسہ ہے کسی مستحق کو دیدیا جائے۔

ب :- یا اس رقم کو جلا کر یا پھاڑ کر ختم کر دیا جائے۔ ان دونوں صورتوں میں کونسی صورت بہتر ہے۔

الجواب :- ۱ فنڈ کاٹ کر حکومت اس میں جتنا ملا کر دیتی ہے خواہ سود کے نام سے دے وہ سب لے لینا اور اپنے استعمال میں لانا سب جائز ہے سود نہیں ہے بلکہ وہ سب انعام ہے۔

۲ :- سرکاری طور پر جبراً جو روپیہ حکومت بیمہ کے نام پر کاٹ لیتی ہے وہ روپیہ اور اس میں جتنا ملا کر دے وہ سب بھی ناجائز نہیں ہے لے سکتے ہیں۔ اور اپنے کام میں خرچ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح مرجانے پر لواحقین کو جو روپیہ دیتی ہے اس میں جو روپیہ ملازم کا اپنا جمع ہو وہ تو ترکہ بنتا ہے اس میں وراثت کے قاعدہ

سے ہر وارث کا حصہ ہوگا اور جو روپیہ اس سے زائد حکومت دیتی ہے وہ اپنے قانون کے ماتحت جس کو دیتی ہے اس کا ہوتا ہے اور اس کا لینا جائز ہے۔

البتہ جو روپیہ انسان بیمہ میں خود کٹوائے اور حکومت کی طرف سے مجبوری نہ ہو اور نہ جبراً کانتی ہو تو وہ واقعی بیمہ ہے اور ایسا کرنا ناجائز ہے اور اس میں اپنے جمع کئے ہوئے روپے سے زاید جو ملے گا وہ سود اور ناجائز ہوگا، اس کو لے کر کسی غریب مستحق زکوٰۃ کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے بطور صدقہ کے دیدینا ضروری رہے گا۔ اور اس محتاج مستحق زکوٰۃ کو دیتے وقت یا کسی وقت بتانا ضروری نہیں ہے کہ یہ سود کا روپیہ ہے بلکہ اپنے دل میں چھپائے رکھنا بھی درست ہے۔ اور اس روپیہ کو جس طرح خود خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح جلا ڈالنا یا پھاڑ ڈالنا یا پھینک دینا بھی جائز نہیں ہے۔ **فقط واللہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ **الاحقر نظام الدین غفرلہ**

دارالعلوم دیوبند ۶/۲/۹۶ھ

هر رکعت میں دو سجدے فرض ہیں

سوال (۱۰۵) عید گاہ مبارک خاں شہید گورکھپور میں عید کی نماز میں سب سے آخری صف والے بہت سے مقتدیوں نے دوسری رکعت تکبیر کی آواز نہ سننے کی وجہ سے صرف ایک ہی سجدہ کیا دوسرا سجدہ بالکل نہیں کیا، بعد نماز امام صاحب سے دریافت کیا گیا تو موصوف نے فرمایا کہ جن مقتدیوں نے دوسری رکعت میں صرف ایک ہی سجدہ کیا ان کی بھی نماز تبعاً للامام ہوگئی۔ ہر رکعت میں دونوں سجدے فرض ہیں، کیا امام صاحب کا فرمانا صحیح ہے۔

الجواب:- تبعاً للامام مقتدی کی نماز اسی حد تک صحیح ہوتی ہے جس حد تک مقتدی سے شرائط و فرائض و ارکان اصلیہ میں سے کوئی چیز فوت نہ

ہوئی ہو۔ اور غلطی محض ایسی ہو جسکی تلافی کا انجبار فقط سجدہ سہو سے ہو سکتا ہے اور یہاں ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہاں سجدہ ثانیہ فوت ہو گیا ہے اور سجدہ ثانیہ بھی مثل سجدہ اول کے فرض ہے کما فی البحر ص۲۹۳ والطحطاوی ص۱۲۵ وص۱۲۷۔

اسی طرح نماز عیدین سے ایجاب سجدہ سہو کے سقوط پر بھی قیاس نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ یہ سقوط ازدحام کی وجہ سے عام مصلیوں کی نماز کو فساد سے بچانے کے لئے ہے، اور وہ بھی اسی حد تک جب تک محض ایسی غلطی ہو جس کا انجبار سجدہ سہو سے ہو سکتا ہے۔ ورنہ اگر فرض فوت ہو جائے یا فساد صلوٰۃ کا خطرہ ہو تو حکم سقوط متوجہ نہیں ہوتا ہے جیسا کہ درمختار، ردالمحتار، بحر وغیرہا نے بحث کر کے واضح کر دیا ہے۔ اس لئے امام موصوف کا یہ فرمانا کہ نماز ان کی بھی صحیح ہو گئی صحیح نہیں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

الجواب صحیح — دارالعلوم دیوبند ۹۶/۲/۱۰ھ

العبد محمود

دارالعلوم دیوبند

مکروہ تنزیہی و مکروہ تحریمی کا حکم

سوال (۱۰۶) فقہ کی مشہور ترین کتاب الاشباہ والنظائر میں یہ قاعدہ لکھا ہے کہ اذا اجتمع الحاظر والمبیح رجح الحاظر۔ یعنی جب منع کرنے والی اور اجازت دینے والی دلیلیں جمع ہو جائیں تو منع کرنے والی دلیل کو ترجیح دی جائے گی۔ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے صرف ایک دن عاشورہ کے روزہ کے سلسلہ میں یہاں تین قول ہیں۔

(۱) مستحب، (۲) مکروہ تنزیہی، (۳) مکروہ تحریمی۔ کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ حدیث ہیں تشبہ بقوم فھو منھم اور دوسری حدیث جس کے الفاظ تو اس

وقت یاد نہیں ہیں لیکن مفہوم یہ ہے کہ اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا تو نو تاریخ (محرم) کو ضرور ضرور روزہ رکھوں گا (لاصومن التاسع) دو دو تاکید کے ساتھ نو تاریخ کو روزہ رکھنے کا اعلان کیا، ظاہر کرتا ہے،

مندرجہ بالا حدیثوں اور قاعدہ پیش کردہ اشباہ سے کیا تحریمی کو ترجیح دیجائیگی جیسا کہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب نے لکھا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کیوں درمختار کی عبارت سے تنزیہی کا اور شامی کی عبارت سے تحریمی کا پتہ چلتا ہے اور فقہ کی عام کتابوں میں صرف مکروہ کا لفظ ملتا ہے اور فقہاء جب مکروہ بغیر کسی قید کے بولتے ہیں تو اس سے مکروہ تحریمی مراد لیا جاتا ہے، عالمگیری میں بھی صرف مکروہ لکھا ہے تو کس قول کو ترجیح دی جائے۔

الجواب:۔ یوم عاشورہ کے روزہ کے سلسلہ میں اگرچہ محض ایک دن کا ہی رکھائے اذا اجتمعا الحاظر والمبیح کا ضابطہ متوجہ نہ ہوگا، صوم یوم عاشورہ کی حرمت یا ممانعت کا کوئی نص نہیں ہے بلکہ نص میں لم ینہانا عنہ کی تصریح موجود ہے۔ (مسلم)۔

اور واقعہ یہ ہے کہ صوم یوم عاشورہ، صوم رمضان کی فرضیت سے قبل فرض تھا، اور فرضیت صوم رمضان کے بعد اس کی فرضیت منسوخ ہو کر افضل سینت باقی رہ گئی تھی۔ اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود بھی روزہ رکھا۔ اور صحابہ کرامؓ کو بھی اس کے رکھنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ مسلم شریف میں ہے کہ وصیام یوم عاشوراء احتسب علی اللہ ان یکفر السنۃ التی قبلہ (مشکوٰۃ ص۱۷۹) پھر جب یہود کی مخالفت کا حکم ہوا تو صحابہ کرامؓ نے اس روزہ رکھنے میں مشابہت یہود کا شبہ عرض کیا۔ تو ازالہ شبہ اس طرح فرمایا گیا کہ ہم یہود کی نقل میں یہ روزہ نہیں رکھتے ہیں بلکہ اپنے حضرت موسیٰؑ کی موافقت سے ہم باعتبار یہود کے زیادہ حقدار ہیں اس لئے

رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے رکھا اور لوگوں کو رکھنے کا بھی حکم دیا، جیسا کہ ارشاد ہے فنحن احق و اولیٰ بموسیٰ منکم فصامہ وامر بصیامہ (متفق علیہ) مگر پھر غایت ورع کی بنیاد پر ایہام مشابہت سے بھی بچنے کی خاطر آپ نے ارشاد فرمایا لئن بقیت الیٰ قابل لاصومن التاسع (مشکوٰۃ ص۱۸۰)

آپؐ نے اس ارشاد میں یہ نہیں فرمایا کہ میں عاشورہ کو روزہ نہیں رکھوں گا بلکہ اس سے سکوت فرمایا اور آئندہ سال محرم آنے سے قبل ہی رفیق اعلیٰ سے جا ملے اس لئے اس روایت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ لاصومن التاسع مع العاشر۔ جیسا کہ مسند احمد و بزاز کی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے اس کے جملے اس طرح ہیں۔ خالفوا الیہود بصوم یوم قبلہ او بعدہ چنانچہ شراح حدیث نے بھی یہ مفہوم لاصومن التاسع کا بیان فرمایا ہے۔ غرض ان احادیث سے جو صوم یوم عاشورہ کے سلسلہ میں وارد ہیں ان سب کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ تنہا یوم عاشورہ کا روزہ ناجائز یا مکروہ تنزیہی نہیں ہے بلکہ صاحب فتح الملہم نے بطور قول فیصل کے اس کا استحباب نقل کیا ہے فرماتے ہیں قولہ ومن احب ان یترکہ الخ قال النحوی معناہ انہ لیس بواجب فابوحنیفۃ یقدرہ لیس بواجب والشافعیۃ یقدرونہ لیس بتاکد اکمل التاکید وعلی المذھبین فھو سنۃ الان (الیٰ قولہ) والعلماء مجمعون علیٰ استحبابہ وتعیینہ الاحادیث الخ (فتح الملہم شرح مسلم ص۱۴۳ ج۳)

اور اسی کے قریب قریب شیخ عبد الحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات ص۸۱ ج۲ کتاب الصوم میں فرماتے ہیں و مراتب صوم محرم سہ است وافضل آنست کہ روزہ دارد روز نہم ودہم ویا زدہم ہمچنیں آمدہ است در حدیث احمد و بزاز

از ابن عباس و دوم نہم و دہم و سوم دہم تنہا ۱۲۔

یا بہت سے ایہام مشابہت سے بچنے کے لئے اگر کوئی کراہت کا حکم دے گا تو فقط کراہت تنزیہی بمعنی غیر افضل کا حکم دے سکتا ہے۔ جس کا حاصل اباحت نکلتا ہے۔ درمختار و فتح القدیر کی کراہت تنزیہی کے حکم کا محل یہی مباح غیر افضل ہوگا۔ اسی طرح جن فقہاء نے مطلق کراہت لکھا ہے اس کا محل بھی یہی کراہت تنزیہی بمعنی غیر افضل ہوگا۔ کیونکہ کراہت تحریمی بلکہ اسارت کا حکم دینے کے لئے بھی مستقل دلیل کی حاجت ہوتی ہے جیسا کہ شامی و بحر وغیرہ نے اس کو اچھی طرح مبرہن کر دیا ہے، فقال فی الشامی صـ ۲۲۹ تحت مطلب فی بیان السنۃ و المستحب بعد بحث طویل لان الکراھۃ حکم شرعی فلابد لہ من دلیل۔

اور یہاں اس کے خلاف نص (ولم ینھانا عنہ) اباحت کا موجود ہے۔ اور وہ جو جناب نے فرمایا ہے کہ کراہت کا اطلاق جب مطلق ہوتا ہے تو اس سے کراہت تحریمی مراد ہوتی ہے۔ تو یہ قاعدہ صرف باب الحظر والاباحۃ تک محدود ہے عام نہیں ہے۔ چنانچہ شامی صـ ۲۱۵/۵ میں اس کی تصریح ہے۔ فرماتے ہیں، قولہ کل مکروہ ای کراہۃ تحریم وھی المراد عند الاطلاق کما فی الشرح قیدہ بما اذا کان فی باب الحظر والاباحۃ۔ لہٰذا اس قاعدہ سے یہ شبہ نہ کیا جائے۔ اور شامی کی عبارت سے روزہ عاشورہ کے بارے میں کراہت تحریمی کا حکم نہیں نکلتا ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ نہم یا یازدہم کو روزہ رکھے بغیر محض دہم محرم کو بھی روزہ رکھنا مباح غیر افضل ہے مکروہ تحریمی وغیرہ کہنا صحیح نہیں ہے اور شامی نے مکروہ تحریمی نہیں کہا ہے۔ اور یہی قول احوط ہے۔ ہاں اگر کوئی اس روزہ کو واجب

کہنے لگے یا واجب جیسا معاملہ کرنے لگے یا کسی بنیاد پر رکھے تو اس کے لئے مکروہ تحریمی و ناجائز تک کہا جا سکتا ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۹۶/۲/۱۰ھ

الجواب صحیح | الجواب صحیح

العبد محمود | سید احمد علی سعید

دارالعلوم دیوبند

مختلف فیہ و مجمع علیہ کے مفہوم میں فرق

سوال (۱۰۷) مختلف فیہ، متفق علیہ مجمع علیہ اور مفتی بہ کی ایسی تشریح کیجئے کہ عوام سمجھ جائیں۔

الجواب:- مفتی بہ صرف اس قول کو کہنا جس پر اجماع ہو چکا ہو۔ صحیح نہیں ہے۔ مفتی بہ کو مجمع علیہ میں محصور کرنا غلط ہے اور مجمع علیہ تو مفتی بہ ہو ہی گا مختلف فیہ اقوال میں بھی مفتی بہ اس قول کو کہتے ہیں جس کو محققین واصحاب ترجیح نے فتویٰ کے لئے اختیار و منتخب کیا ہو۔ علامہ ابن عابدین کی عقود رسم المفتی میں نیز عموماً کتب فتاویٰ کے باب رسم المفتی میں اس پر مفصل کلام کیا ہے اور اس کی کچھ علامتیں بھی بیان کی ہیں، مثلاً یہ الفاظ بہ یفتیٰ۔ علیہ الفتویٰ علیہ المعمول۔ علیہ الاعتماد۔ وھو المختار وغیرہ وغیرہ۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۹۶/۲/۱۰ھ

الجواب صحیح | الجواب صحیح

العبد محمود | سید احمد علی سعید

نس بندی کا شرعی حکم

سوال (۱۰۸) ۱ الف :- نس بندی کا حکم شرعی کیا ہے۔

(ب) اگر جائز نہیں جیساکہ وادبنات اور قتل اولاد خشیۃ املاق کی ممانعت اور اس کے پس منظر سے سمجھ میں آتا ہے اگر عدم جواز ہی راجح ہے تو پھر حسب ذیل صورتوں میں اس عدم جواز پر کیونکر عمل کرنا ممکن ہوگا؟

۱ حکومت وقت نے اب تک تو اختیاری طور پر نس بندی کو لاگو کیا تھا، مگر اب کافی سختی برتی جارہی ہے حتیٰ کہ اب راہ چلتے ہوئے مسلم مسافروں کو پکڑ کر بھی نس بندی کی کوشش کی جارہی ہے۔

۲ :- یہ بھی قانون نافذ ہونے والا ہے کہ دو بچوں سے زیادہ کی پیدائش کو غیر قانونی قرار دے کر دو کے بعد آپریشن کرالینا لازمی ہوگا۔

۳ :- تیسرے بچہ پر لازمی ٹیکس کا قانون بھی نافذ کیا جارہا ہے۔

۴ :- دکان اور تجارت کے لئے لائسنس حاصل کرنے کے لئے بھی آپریشن کی شرط لگائی جارہی ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہے کہ چار و ناچار امر غیر شرعی کا ارتکاب کرنا ہی ہوگا۔

(ج) ایسے علماء، وزعماء کا کیا حکم ہے جو جواز کے فتوے دے رہے ہیں۔ یا ریڈیو پر تقریر کرتے ہیں، نیز زعماء مسلمین اپنی لیڈری کے زعم میں علماء کو لکیر کا فقیر قرار دے کر آپریشن (نس بندی) کی ترغیب دیتے ہیں اور نظیر میں مسلم ممالک کو پیش کرتے ہیں۔ کیا پاکستان وغیرہ ممالک کے علماء اس کے جواز پر متفق ہیں؟ اگر متفق ہیں تو پھر کیا ان کا اتفاق یہاں کے علماء اور عوام کے لئے کافی نہیں ہے اگر نہیں ہے تو کیوں؟۔

(د) عدم جواز کا یقین رکھتے ہوئے ایمر جنسی اور تعزیرات ہند کے تحت گرفتاری

اور اسی کے ساتھ جیل خانہ میں جبری آپریشن کے خطرہ سے خاموش رہنا اور عوام کو صحیح بتانے یا ان کو روک ٹوک کرنے سے احتراز کرنا اور خاموش رہنا کتمان علم میں شامل نہیں ہوگا؟

(ہ):- ان ملازمین مسلمین کا کیا حکم ہوگا جو اس شعبہ کے ملازم یا کسی بھی سرکاری ملازمت میں ہیں، نیز ان کی ملازمت کو اپنی نس بندی یا دوسروں کی نس بندی کروانے پر معلق کر دیا جائے۔ اور وہ اپنی ملازمت و روزی کی خاطر اپنے کو مجبور سمجھ کر ڈاکٹری سرجری وغیرہ کے فرائض انجام دیتے ہیں کیا ان کو مضطر قرار دے کر الضرورات مبیح المحذورات پر عمل کرنا کہہ سکتے ہیں یا ترک ملازمت ہی ضروری ہے؟

(و):- املاق و افلاس متوہم ضرورات مبیحہ میں داخل ہوگا۔؟

(ز):- اگر واقعی اولاد کی زیادتی اور مال کی کمی ہو تو آپریشن برضا و رغبت کرانے کی اجازت ہوگی یا نہیں؟ عزل کی شرعی اجازت سے اس پر استدلال کرنا کیا حکم رکھتا ہے۔؟

(ح):- اگر املاق متوہم یا متیقن کی وجہ سے جواز کی گنجائش نکالی جائے تو تزوجوا الولود الودود۔ یا اباھی بکم الامم وغیرہ اور اس طرح کی دیگر روایات کا مصداق کیا ہوگا۔

(ط):- کیا اس کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت نہیں کہیں گے اور اگر ہے تو پھر خاموشی کا کیا معنی ہوگا۔

(ی):- کیا اس طرح کے جبری قوانین سے بچنے کے لئے ہجرت کرنا ضروری قرار دیا جائے گا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو جائے ہجرت کہاں ہے ہر ملک اپنے ملک میں بسنے والے ہی کو شہری حقوق دینا اور دوسروں کو غیر ملکی قرار دے کر ان کے اوطان میں دھکیل دینا چاہتا ہے۔ پھر مہاجرین کو کیسے قبول کریں گے۔؟

(ک):۔ جن کا آپریشن حیلہ وخداع سے کر دیا جائے تو وہ مخدوع عند الشرع مجرم ہوگا یا نہیں۔ ؟

(ل):۔ ایسے بوڑھے جن کی زوجہ نہیں ہے اور وہ دوسری شادی بھی کرنا نہیں چاہتے گو ان سے اولاد کی امید ہے یا ایسے بوڑھے جو اس طرف میلان نہیں رکھتے روپئے کی لالچ یا مسلمانوں کی غانہ پری کے لئے آپریشن کرالیں تو جائز ہوگا یا نہیں ؟

س۲ :۔ لاٹری کا ٹکٹ خریدنا جائز ہے یا نہیں، اگر ناجائز ہے تو حسب ذیل شکلوں میں کیا حکم ہوگا۔ ؟

(الف):۔ ہر دستاویز آراضی کے ساتھ جبراً لاٹری کا ٹکٹ دیا جاتا ہے اگر نہ لیا جائے تو رجسٹری نہیں ہوتی اور اگر لیا جاتا ہے تو حرام کا مرتکب ہونا ظاہر ہے

(ب):۔ دکانداروں کو دس پانچ ٹکٹ سرکاری طور پر دیئے جاتے ہیں نہ لینے پر کہا جاتا ہے کہ سرکار کو چندہ ہی سمجھ کر دیدیجئے کیا چندہ کی نیت کر کے دیدینا اور ٹکٹ قبول کر لینا جائز ہوگا ؟

(ج):۔ اس جبری ٹکٹ سے ملنے والے انعام کا مصرف کیا ہوگا۔ اپنی ذات اور اہل وعیال پر صرف جائز ہوگا یا نہیں ؟۔

(د):۔ اگر جائز نہیں ہے تو جو رقم اس کے ذریعہ حاصل ہوگی یا برضا ورغبت ٹکٹ لینے سے حاصل ہو یا اسی طرح سودی قرض سے حاصل ہو تو مورث کے مرنے کے بعد ورثاء کے لئے اس کا استعمال اس کلیہ (تبدل ملک سے تبدل عین ہوجاتا ہے)، کے تحت جائز ہوگا یا نہیں جب کہ ورثہ کو معلوم ہے کہ میرے مورث نے یہ مال غلط طور پر حاصل کیا تھا اگر نہیں تو پھر اس کلیہ کا مصداق کیا ہوگا اور اگر تبدل عین ہوکر ورثہ کے لئے جواز کا حکم صادر کیا جائے تو پھر الحرمۃ منتقل مع العلم فقہاء کے نزدیک اس اصل اور ضابطہ کا محل کیا قرار پائیگا، بینوا بالدلیل وتوجروا عند الجلیل

الجواب :- جواب سوال ۱ (الف) کوئی ایسا عمل کرالینا جس سے بچہ پیدا ہونے کی صلاحیت ہمیشہ کے لئے بالکل ختم ہوجائے خصی ہوجانے کے مترادف و ہم معنیٰ ہے۔ اس لئے کہ خصی کرانے سے مقصود یہی صلاحیت، بچہ پیدا ہونے کی ختم کر دینا ہوتا ہے۔ خواہ مادہ تولید کو منتقل ہونے سے روک کر ہو خواہ جماع پر قدرت روک کر ہو، اور یہ معنیٰ یہاں بھی اس عمل میں متحقق ہوں گے۔ لہٰذا دونوں حکماً ایک ہوں گے اور خصی کرانا ممنوع و حرام ہے۔ اس کی حرمت و ممانعت نصوص میں منصوص و مصرح ہے۔

مثلاً لیس منا من خصیٰ و اختصیٰ (۲) ان عثمان بن مظعون قال یا رسول اللّٰہ ائذن لی فی الاختصاء فقال لہ ان اللّٰہ قد ابدلنا بالرھبانیۃ الحنیفیۃ السمحۃ والتکبیر علی کل شرف فان کنت منا فاصنع کما نصنع (۳) نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الرجل ان یتبتل وان یحرم ولوج بیوت المومنین (ھٰذہ کلھا فی مجمع الزوائد ص ۲۵۲-۲۵۴ ج ۴ متصلاً عن الطبرانی) (۴) بخاری و مسلم میں ہے کہ رد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی عثمان بن مظعون التبتل ولو اذن لہ لاختصینا (مشکوٰۃ ص ۲۶)۔

ان روایتوں میں خصی کرانے کی یعنی بچہ پیدا ہونے کی صلاحیت کو ختم کرانے کی ممانعت و حرمت ہر حال و ہر شکل میں ہے خواہ کسی بھی ذریعہ و وجہ سے ہو (کما فی المرقات ص ۲۰۲ ج ۳) کما قال ان الاختصاء فی الآدمی حرام صغیراً کان او کبیراً وھکذا فی النووی ایضاً۔

اس لئے ایسے کسی عمل کی اجازت یا اباحت ہرگز نہ ہوگی جس سے بچہ پیدا ہونے کی صلاحیت ختم ہوجائے ایسا کوئی عمل خواہ مرد کرائے یا عورت خواہ بذریعہ آپریشن

کرائے یا بذریعہ نس بندی یا کسی اور طرح کرائے علت و حرمت کے مطرد ہونے سے حکم مطرد رہے گا اور اس کا حکم حرمت و ممانعت کا ہے وہ ہر حال اور ہر شکل میں عائد و لازم ہوگا اور یہ عمل کرالینا حرام و سخت گناہ ہوگا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ۔

اگر یہ شبہ کیا جائے کہ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) نے تزہد و رہبانیت کے شوق میں تبتل و اختصار کی اجازت طلب کی تھی، اور یہ تبتل و اختصار چونکہ شریعت نصاریٰ کی چیز تھی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے رد کا اور منع فرمایا۔

جواب:۔ جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے جس مقصد کے لئے بھی اس کی اجازت طلب کی ہو اور درخواست پیش کی ہو یہ دوسری بات ہے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نہی و نکیر فرمائی ہے اور ان کی درخواست رد فرمایا ہے وہ اس لئے کہ اس تبتل و اختصار میں تکثیر نسل نہیں ہوگی اور قوتِ جہاد میں ضعف پیدا ہوگا۔ جیسا کہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص۴۰۲ میں ہے کہ فنھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عنہ (اما التبتل) امتہ لیکثر النسل ویدوم الجھاد اس سے معلوم ہوا کہ کوئی ایسا فعل یا عمل جس سے افزائش نسل میں خلل پڑے وہ ممنوع ہوگا۔ اور منطوق الٰہی فاستعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم الآیۃ کے اشارے سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے اس سے یہ بات بھی نکل آئی کہ عزل وغیرہ کوئی ایسی تدبیر جس سے عارضی طور پر بھی بچہ پیدا ہونا رک جائے اس کی عادت بنالینا یا اس کو قانون و جبری شکل دیدینا بھی شرعاً ممنوع ہوگا اور اگر کچھ گنجائش ہوگی تو لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا کے ضابطے کے تحت صرف اسی حد تک ہوگی جس حد تک عورت میں تکالیف حمل

برداشت کر لینے کی صلاحیت وقوت نہ پیدا ہو جائے یا پھر محض وقتی واتفاقی حکم نہ کہ اباحتِ مطلقہ جیساکہ ضبط تولید کے جواز مطلقہ کے قائلین فرماتے ہیں، لہٰذا اس کے لئے جبری قانون بنانا اور قانون کے ذریعہ پوری قوم پر لازم کرنا شریعت اور شارع علیہ السلام کے منشاء کے خلاف اور ناجائز ہوگا۔ حرمت کی یہ ایک دلیل ہوگی۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ کلام پاک سورہ نور میں ہے وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم ان یکونوا فقراء یغنھم اللہ من فضلہ واللہ واسع علیم ہ

اس آیت کریمہ کے تحت روح المعانی میں ہے الظاھر انہ وعد من اللہ عزوجل بالاغناء اور اغناء کے اس وعدہ پر ابن جریر، ابن منذر ابن حاتم وغیرہم نے بہت سی حدیثیں نقل کی ہیں۔ مثلاً۔ (۱) عن ابن عباسؓ تلا وانکحوا الایامی منکم الآیۃ قال امر اللہ سبحانہ بالنکاح ورغبھم فیہ وامرھم ان یتزوجوا احرارھم وعبیدھم ووعدھم فی ذٰلک الغناء۔ (۲) عن ابی بکر الصدیقؓ قال اطیعوا اللہ فیما امرکم بہ من النکاح ینجز لکم ما وعدکم من الغناء (۳) ان عمر بن الخطابؓ ابتغوا الغناء فی الباءۃ وفی لفظ اطلبوا الفضل من الباءۃ وتلا ان یکونوا فقراء یغنھم اللہ من فضلہ (ھٰذہ کلھا من الدر المنثور ص ۴۵ ج ۵)

پھر اسی تفسیر روح المعانی میں اس آیت کے نیچے مذکور ہے ولا یبعد ان یکون فی ذٰلک سد لباب التعلل بالفقر وعدہ مانعا من المناکحۃ پھر چند سطر کے بعد ہے قد تقرر فی الطباع الساکنۃ الی الاسباب

ان العیال سبب للفقر وعدمھم سبب لتوفر المال فارید قطع ھذا التوھم پھر چند سطر کے بعد ہے ومعنی الاٰیۃ حینئذ ان النکاح لا یمنع الغناء من فضل اللہ تعالیٰ۔

آیت بالا سے اور اس کے تحت نہایت موقر و مستند تفسیر سے بطور دلالۃ النص کے اور بطور ما سیق الکلام لاجلہ کے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس عقیدہ کی بنیاد کے رد اور باطل کرنے کے لئے اور اس پر تعمیر عمل مرتب کرنے سے روکنے کے لئے اس آیت کریمہ کا نزول ہوا ہے۔ جس عقیدہ کی بنیاد پر یہ تعمیر عمل (کوئی ایسا عمل کرا لینا جس سے بچہ پیدا ہونے کی صلاحیت ختم ہو جائے) بروئے کار لائی جا رہی ہے جب یہ بات ثابت ہو گئی تو پھر اس عمل کی اجازت شرعاً کیوں کر ہو سکتی ہے بلکہ اس بنیاد پر تو حکم حرمت اور سخت و شدید ہو جائے گا۔

جواب (ب)

جناب نے صحیح سمجھا ہے۔ جب نس بندی سے بچہ پیدا ہونے کی صلاحیت ختم ہو جائے گی تو بہت سے دلائل و شواہد سے یہ فعل حرام و ناجائز ہوگا اور بغیر سخت مجبوری و اضطرار کے کسی قسم کی ہرگز گنجائش بھی شرعاً نہ ہوگی مندرجہ ذیل صورتوں کا حکم بھی نمبر وار لکھا جاتا ہے۔

(۱):۔ حتی الوسع بچنے کی مناسب تدبیر اختیار کریں مثلاً حکام بالا کو ان حالات سے مطلع کر کے بچاؤ کرائیں اور جو شخص واقعی اس طرح مبتلا ہو جائے گا اور دل سے راضی نہ ہوگا۔ وہ عند اللہ ماخوذ و گنہ گار نہ ہوگا۔

(۲، ۳، ۴):۔ قانون کی حدود میں رہتے ہوئے حکومت کو شرعی موقف سے آگاہ کر کے سعی کریں کہ ایسے قانون سے مسلمانوں کو الگ رکھا جائے اور مستثنیٰ قرار دیا جائے، اور کہا جائے کہ دستور ہند میں جو مذہب کے تحفظات کی ضمانت

دی گئی ہے اس کو بروئے کار لایا جائے۔ باقی اگر حکام باز نہ آئیں خواہ کسی وجہ سے باز نہ آئیں اور چار و ناچار امر غیر شرعی کا ارتکاب کرنا ہی پڑجائے تو جو لوگ واقعی مجبور ہوں گے اور دل سے راضی نہ ہوں گے وہ بوجہ اضطرار کے مواخذہ اخروی میں گرفتار نہ ہوں گے اور یہ عدم مواخذہ محض مراحم خسروانہ کے قبیل سے ہوگا۔ عام حکم نہ ہوگا، عام حکم وہی حرمت و ممانعت کا اور اس کے ارتکاب پر مواخذہ و گرفت اخروی کا ہوگا، اور اس اضطراری ابتلاء کے باوجود قیود بالا کے تحت حکومت وقت سے استثناء کی کوشش و سعی بہرحال باقی رہے گی۔

جواب نمبر (ج)

جو علماء یا زعماء بغیر دلیل شرعی کے جواز کا فتویٰ دیں گے یا دیتے ہیں، وہ گناہ عظیم کے مرتکب ہوں گے یا ہوتے ہیں، اور ضل و اضل کے مصداق بنیں گے یا بنتے ہیں۔

مسلم ممالک کے تمام علماء اس پر متفق نہیں ہیں بلکہ مقتدر و معتمد علماء اس کے عدم جواز کو ہی بیان کرتے ہیں اور فتویٰ دیتے ہیں۔ نیز کسی شخص یا جماعت یا حکومت کا عمل یا قانون حجت شرعی نہیں ہے۔ حجت شرعی صرف کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ اور اس کی موافقت و متابعت میں اصحاب خیر القرون مشہود لہا بالخیر کا عمل و طرز استدلال و اجماع ہے یا پھر ائمہ مجتہدین کا وہ اجتہاد ہے جو انھیں مذکورہ بالا دلائل سے مستنبط ہو۔

جواب نمبر (د)

ہر شخص پر حسب استطاعت و قدرت حکومت وقت کو حدود و قانون میں رہتے ہوئے شرعی موقف سے آگاہ کرنا اور استدعا کرنا واجب ہے اور انھیں قیود و شرائط کے ساتھ عوام کو مسئلہ شرعی اور حکم شرعی سے آگاہ اور واقف کرانا بھی ضروری

ہے۔ قدرت واستطاعت رہتے ہوئے خاموش رہنا اور نہ بتلانا کتمان علم ہوگا،

جواب ۱ (ہ)

انفرادی وشخصی طور پر ہر شخص کو تو مجبور ومضطر نہیں کہا جاسکتا، البتہ اجتماعی وقومی سطح پر مجموعہ قوم کو مجموعی طور پر مجبور ومضطر کہا جائے گا۔ سوالات میں اوپر لکھے ہوئے حالات وواقعات کو سامنے رکھنے سے یہ بات اور واضح طور پر سامنے آجاتی ہے، اس لئے ترک ملازمت کا حکم نہیں دیا جاسکتا اور نہ ترک تجارت، ترک زراعت اور ترک معاش سبھی کا حکم دینا پڑے گا اور اس طرح پر اپنا امتیاز رہی نہیں بلکہ قومی بقا بھی سخت دشوار ہو جائے گی۔

غرض اضطرار اجتماعی یا مجموعی تو کہہ سکتے ہیں، باقی اضطرار انفرادی وشخصی اس کا حکم ہر شخص کے حالات کے اعتبار سے الگ الگ ہوگا، جس کو ہر شخص الگ الگ اپنے طور پر کسی معتمد واقف کار عالم دین سے پوچھ کر مشخص ومتعین کرا سکتا ہے اور معلوم کرسکتا ہے

جواب ۱ (و):- داخل نہیں ہوگا۔

جواب ۱ (ز):- پھر بھی ایسا عمل کرا لینے کی جس سے بچہ پیدا ہونے کی صلاحیت ختم ہو جائے اجازت نہ ہوگی۔ بغیر سخت مجبوری واضطرار کے ایسا کرا لینا ناجائز اور سخت گناہ ہوگا۔ اور عزل کو اس پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا، اس لئے کہ عزل میں صلاحیت ختم نہیں ہوتی۔

جواب ۱ (ح):- اس کا شرعی حکم تو بیان ہو چکا کہ حرام ہے۔ اور بغیر سخت مجبوری واضطرار کے کوئی گنجائش نہیں۔ باقی یہ سوال تو ان سے ہوگا جو جواز کے قائل ہیں۔

جواب ۱ (ط):- قانون وقت کے حدود میں رہتے ہوئے پہلے

حکومت وقت کو شرعی موقف سے آگاہ کیا جائے سمجھایا جائے۔ اس کے جواب کے بعد مداخلت یا عدم مداخلت کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔

جواب ۱ (ی) :- ہجرت کرنا ضروری نہ ہوگا، بلکہ یہیں رہ کر اس کی اصلاح میں سعی کرنا لازم رہے گا۔

جواب ۱ (ک) :- اگر کوئی واقعی مخدوع و مضطر ہوگا وہ عنداللہ مجرم نہ ہوگا۔

جواب ۱ (ل) :- نہیں جائز ہوگا، بلکہ اس میں وہی تفصیل ہے جو (ہ) کے جواب میں ابھی گذری۔

جواب ۲ :- ناجائز ہے۔ ذیل میں مندرجہ شکلوں کا حکم بھی درج ذیل ہے

جواب (الف، ب، ج) :- مجبوری کی صورت میں مجبوری کی حد تک گنجائش ہو سکے گی۔ اور مجبوری کی حد یہ ہوگی کہ ان چیزوں اور معاملوں کے بغیر جن چیزوں اور معاملوں پر لاٹری کا ٹکٹ خریدنا لازم کیا جا رہا ہے، معاش یا معاشرہ خراب ہو کر ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑے گا۔

پھر اس سے حاصل شدہ رقم کا حکم یہ ہوگا کہ اپنی جمع کی ہوئی رقم سے جو زائد رقم حاصل ہو۔ اس کا حقیقی اور اصل مالک اگر ضابطہ شرعی اور ثبوت شرعی کے مطابق معلوم ہو جائے، تو وہ رقم کسی اچھے انداز سے اس تک پہنچا دیا جائے ورنہ پھر بغیر نیت ثواب کے بلکہ اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے اپنی ملک سے خارج کر دینا اور بصورت صدقہ کسی غریب محتاج کو دیدینا واجب رہے گا۔ اپنی ذات یا عیال پر یا کسی اور کام میں خود صرف کرنا درست نہ رہے گا۔ ہاں اگر خود مستحق صدقہ ہو چکا ہو تو حکم دوسرا ہوگا۔ اور خود بھی خرچ کر لینے کی گنجائش ہو سکے گی۔ اور یہ بات دوسری ہوگی۔

نیز اس معاملہ پر سوال ۲ کے معاملہ کو قیاس نہیں کر سکتے، اس لئے کہ اس معاملہ کا تعلق محض عمل و مال سے ہے بلکہ انفاق مال سے ہے، عقیدہ سے نہیں ہے اور نہ اس کا اثر عقیدہ تک پہنچنا ضروری ہے۔ بخلاف سوال ۲ کے معاملہ کے کہ اس کا تعلق عقیدہ سے ہے اور اس عقیدہ کی حفاظت و درستگی کی خاطر بھی مذکورہ نص (وانکحوا الایامی منکم) کا نزول ہوا ہے، اس لئے اس معاملہ کو اس معاملہ پر قیاس کرنا غلط ہوگا بلکہ اس معاملہ میں بغیر سخت مجبوری واضطرار کے توسع کی گنجائش بھی نہیں ہو سکتی۔

جواب (د):- چونکہ صورت مسئولہ میں اصل مالک (ارباب اموال) معلوم و متعین نہیں ہیں۔ اس لئے اس کا حکم یہ ہے کہ جب تک وہ حاصل شدہ حرام رقم اپنے حلال مال میں مختلط ہو کر خلط ملط نہ ہو گئی ہو بلکہ متعینہ طور پر باقی ہو اس وقت تک مورث کے مرنے کے بعد بھی اس کو بصورت صدقہ بغیر نیتِ ثواب کے ان ورثہ کو جو خود مستحق صدقہ نہ ہوں اپنی ملک سے خارج کر دینا ضروری ہوگا۔ اور جو ورثہ خود مستحق صدقہ ہو چکے ہوں ان پر یہ اخراج عن الملک لازم نہ رہے گا اور جس وقت وہ حاصل شدہ حرام رقم حلال رقم میں مختلط ہو چکی ہو اور امتیاز مشکل ہو گیا ہو تو ورثہ پر حکماً اس کا تصدق اور اخراج عن الملک لازم تو نہ ہوگا لیکن دیانۃً حرام کی مقدار کا اپنی ملک سے بصورت تصدق نکال دینے کا حکم متوجہ رہے گا۔ کما فی رد المحتار ص ۱۳۰ ج ۴ ولکن لا یحل اذا علم عین الغصب مثلاً وان لم یعلم مالکہ کما فی البزازیۃ اخذ مورثہ رشوۃ او ظلماً ان علم ذلک بعینہ لا یحل لہ اخذہ والا فلہ اخذہ اما فی الدیانۃ فیتصدق بہ بنیۃ ارضاء الخصماء (ثم بعد سطر) والحاصل انہ ان علم ارباب الاموال

(الیٰ قولہ) وان کان مالہ مختلطا مجتمعاً من الحرام ولا یعلم ای بابہ ولا شیئاً منہ بعینہ حل لہ حکماً والاحسن دیانۃ التنزہ عنہ وھکذا فی الرد فی باب الحظر والاباحۃ وفی الکراہیۃ وفی البحر ج ۸ صـ ۲۰۱ وفی ص ۲۴۷ وفی صـ ۲۴۷ ج ۵ ۔ اتنی تحریر سے جناب کا فقہی اشکال حل ہوگیا ۔ فالحمد للہ علی ذلک ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند

ملازم کے مرنے کے بعد فنڈ کا حکم

سوال (۱۰۹) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین بیچ اس امر کے کہ عبدالعلیم ملٹری ملازم ہے، انھوں نے سرکاری ملازمت میں لکھا تھا کہ دوران ملازمت وفات ہوجانے کی صورت میں ان کے پرائیوٹ فنڈ کی جمع شدہ رقم جو کچھ بھی ہو ان کی اہلیہ کو دیدی جائے، قضائے الٰہی سے ان کی وفات دوران ملازمت واقع ہوگئی، اور محکمہ نے کل رقم مرحوم کے منشاء اور تحریر کے مطابق بیوہ کو دیدی۔ مرحوم عبدالعلیم کے ایک فرزند اور بیوہ وتین دختران ہیں، جو سب کے سب عاقل بالغ اور شادی شدہ ہیں، ان میں ایک لڑکی عرصہ سے پاکستان میں مقیم ہے اور اغلب ہے کہ وہاں کی شہریت حاصل ہوچکی ہے۔ اس کا شوہر پاکستانی شہری ہے۔ مرحوم نے ترکہ میں ایک مکان سفالہ پوش اور کچھ رقم ڈاکخانہ کے سونگ بینک اور کچھ رقم اسٹیٹ بینک میں چھوڑا ہے۔ ازراہ کرم شرعی حکم سے مطلع فرمائیں کہ :۔

۱ :۔ کیا پاکستان میں جاکر بس جانے والی لڑکی ترکہ پدری کی حقدار ہے۔

۲ :۔ کیا وہ رقم جو مرحوم نے پرائیوٹ فنڈ کی شکل میں بیوہ کے نام لکھا تھا، اور جو بیوہ کو مل چکی ہے ورثاء میں قابل تقسیم ہے۔

۳ :۔ کیا ڈاکخانہ اور بینک میں جمع کی ہوئی رقم میں ورثار کو ترکہ پہنچتا ہے

۴ :۔ مرحوم نے بینک میں جو رقم رکھی تھی وہ حج کے اخراجات کے لئے تھی، اب کیا یہ بھی ورثار میں قابل تقسیم ہے؟

۵ :۔ ترکہ کے تقسیم کا شرعی اصول مابین ورثار کیا برتا جانا چاہیے؟

۶ :۔ بیوہ کا دین مہر مؤجل مرحوم نے اپنی زندگی میں ادا نہیں کیا تھا اور نہ زوجہ نے کبھی معاف کیا ہے، ایسی صورت میں کیا دین مہر کی رقم ترکہ سے منہا کی جاسکتی ہے؟

الجواب :۔ ۱ ہاں وہاں جاکر بس جانے والی لڑکی بھی حسب تخریج شرعی حقدار ہے، تخریج شرعی کی تفصیل ۵ کے جواب میں مذکور ہے۔

۲ :۔ فنڈ میں جمع شدہ رقم کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ رقم کا وہ ہے جو مرحوم کی تنخواہ سے کٹی ہوئی رقم کے علاوہ ہے اور اس کو حکومت نے خود اس میں شامل کیا ہے۔ اس زائد رقم کی مالک و مستحق تنہا مرحوم کی بیوہ ہے، اس میں کسی اور وارث کا کوئی حق نہیں ہے۔ البتہ جو حصہ فنڈ کا مرحوم کی تنخواہ سے کٹ کر جمع ہوا ہے وہ حصہ شرعاً دین واجب الادار بذمہ حکومت تھا، اس کے بارے میں مرحوم یہ وصیت شرعاً تملیك الدين على من ليس عليه الدين ہونے کی وجہ سے شرعاً درست نہیں ہے بلکہ یہ حصہ فنڈ مرحوم کا ترکہ شرعی ہے جو مرحوم کے تمام ورثار پر حسب تخریج شرعی تقسیم ہوگا، اور بیوہ کے تنہا راس پر قبضہ کرلینے سے بقیہ ورثار شرعی کا سوخت نہ ہوگا۔ تخریج شرعی کی تفصیل ۵ کے جواب میں ملاحظہ ہو۔

۳ :۔ ڈاکخانہ و بینک وغیرہ میں جمع کی ہوئی رقم میں بھی حق ورثار پہنچتا ہے وہ رقم بھی حسب تخریج شرعی تقسیم ہوگی، تخریج شرعی کی تفصیل

نمبر ۵ کے جواب میں درج ہے۔ البتہ اپنی جمع کی رقم سے زائد جو رقم سود کی بنتی ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر مرحوم کے ذمہ کچھ انکم ٹیکس وغیرہ منجانب حکومت عائد ہو اس میں وہ سود کے نام والی رقم دیدی جائے۔ اور اگر منجانب حکومت کوئی ایسا مطالبہ نہ ہو یا بعد ادائیگی مطالبہ بچ جائے اس کو ان ورثاء کو دے سکتے ہیں جو غریب و محتاج ہوں، اور اگر ورثاء میں کوئی محتاج و غریب نہ ہو تو بلانیت ثواب بطور صدقہ کے غریبوں، محتاجوں کو دیدیا جائے۔

نمبر ۴:- اگر مرحوم پر حج فرض نہیں تھا یا فرض تھا، مگر مرحوم نے اپنا حج کرانے کی وصیت نہیں کی ہے بلکہ محض ارادہ ہی ظاہر کیا تھا، تو وہ رقم بھی ترکہ شمار ہوگی۔ اور اس میں بھی حسب تخریج شرعی تقسیم جاری ہوگی، تفصیل تقسیم نمبر ۵ کے جواب میں مذکور ہے، اور اگر مرحوم پر حج فرض تھا اور مرحوم نے حج کے لئے وصیت بھی کی تھی اور وہ رقم تہائی ترکے کے اندر ہے تو اس سے حسب وصیت حج بدل کرایا جائے۔ حج بدل کرانے کے بعد جو رقم بچے گی وہ ترکہ شمار ہو کر حسب تخریج شرعی ورثہ پر تقسیم ہوگی

نمبر ۵ و نمبر ۶:- مرحوم عبدالعلیم کے مرنے کے وقت اگر مرحوم کے باپ و ماں زندہ نہیں تھے تو مرحوم عبدالعلیم کا کل ترکہ خواہ بصورت مکان ہو یا بصورت سامان یا زیورات و نقد ہو یا بینک وغیرہ کسی جگہ جمع شدہ ہو، ان سب کے مجموعہ میں سے پہلے بیوہ کا مہر جو باقی ہے وہ ادا کیا جائے۔ اسی طرح اگر اور کوئی قرض باقی ہے تو اسے ادا کیا جائے، پھر اس کے بعد باقی ترکہ صرف ایک تہائی کے اندر مرحوم کی وصیت صحیحہ نافذ کی جائے۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ترکہ بچے اس کو چالیس سہام پر تقسیم کر دیں۔ چالیس سہام میں پانچ سہام بیوہ کا حق ہوگا۔ اور چودہ سہام فرزند کا حق ہوگا۔ اور سات سات سہام تینوں لڑکیوں کا حق ہوگا، جو لڑکی کسی غیر ملک

کی شہری ہوگئی ہے محض اس سے اسکا حق وراثت سوخت نہ ہوگا بلکہ اس کا حصہ محفوظ رکھ کر اس کو مطلع کیا جائے، اور اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا جائے یا اس سے بیع وشراء وغیرہ کا کوئی شرعی معاملہ بذریعہ مراسلت وغیرہ کرلیا جائے، اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اگر مرحوم کے انتقال کے وقت ماں یا باپ کوئی زندہ تھے تو ان کو واضح کر کے پھر تخریج شرعی معلوم کی جائے۔

(نوٹ) یاد رہے کہ فنڈ میں جو رقم حکومت اپنی طرف سے ملاتی ہے وہ صورت مسئولہ میں مرحوم کا ترکہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ رقم تنہا بیوہ کا حق ہے۔ جیساکہ ۲ کے جواب میں درج ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۳۰/۳/۹۶ھ

گھی پاک کرنے کا طریقہ شرعی

سوال (۱۱۰) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل کے بارے میں۔

مولانا احمد رضا خاں صاحب مرحوم نے اپنے فتاوی رضویہ مطبوعہ رضوی پریس بریلی میں صـ۶ و ۷ پر تحریر کیا ہے، ایک سوال کے جواب میں۔ سوال وجواب بعینہٖ مندرجہ ذیل ہیں۔

سوال :- گھی گرم تھا، اس میں مرغی کا بچہ گرا اور فوراً مر گیا۔ یہ گھی کھانا جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب :- گھی ناپاک ہوگیا، بے پاک کئے اس کا کھانا حرام ہے، پاک کرنے کے تین طریقے ہیں، ایک یہ کہ اتنا ہی پانی اس میں ملاکر جنبش دیتے رہیں یہاں تک سب گھی اوپر آجائے اسے اتارلے دوسرا پانی اسی قدر ملاکر یوں ہی کریں پھر اتار کر تیسرے پانی سے اسی طرح دھوئیں، اور اگر گھی سرد ہو کر جم گیا ہو تو

تینوں بار اس کے برابر پانی ملاکر جوش دیں، یہاں تک کہ گھی اوپر آجائے، اسے اتار لیں۔

اقول ــــ بلکہ جوش دینے کی پہلی ہی بار حاجت ہے، پھر تو گھی رقیق ہوجائے گا، اور پانی ملاکر جنبش دینا کفایت کرے گا قال فی الدر ولو تنجس الدھن یصب علیہ الماء فیغلی فیعلوا الدھن الماء فیرفع بشیء ھکذا ثلث مرات اھ وھذا عند ابی یوسف خلافاً لمحمد وھو اوسع وعلیہ الفتوی کما فی شرح الشیخ اسماعیل عن جامع الفتاوی وقال فی الفتاوی الخیریۃ لفظۃ فیغلی ذکرت فی بعض الکتب والظاھر انھا من زیادۃ الناسخ فانا لم نرمن شرط لتطھیر الدھن الغلیان مع کثرۃ النقل فی المسألۃ والتتبع لھا الا ان یراد بہ التحریک مجازاً فقد صرح فی مجمع الروایۃ وشرح القدوری انہ یصب علیہ مثلہ ماء ویحرک فتامل اھ اویحمل علی ما اذا جمد الدھن بعد تنجسہ ثم رأیت الشارح صرح بذلک فی الخزائن فقال والدھن السائل یلقی فیہ الماء والجامد یغلی بہ حتی یعلو اھ

دوم:- ناپاک گھی جس برتن میں ہے۔ اگر جمنے کی طرف مائل ہوگیا ہو آگ پر پگھلالیں اور ویسا ہی پگھلا ہوا پاک گھی اس برتن میں ڈالتے جائیں یہاں تک کہ گھی سے بھر کر ابل جائے، سب گھی پاک ہوجائے گا، جامع الرموز میں ہے۔ الماء کالماء والدبس وغیرھما طھارتہ باجرائہ مع جنسہ مختلطا بہ اھ۔

سوم:- دوسرا گھی پاک لیں اور مثلاً تخت پر بیٹھ کر نیچے ایک خالی

برتن رکھیں اور پرنالے کے مثل کی چیز میں وہ پاک گھی ڈالیں، اس کے بعد یہ ناپاک گھی اس پرنالے میں ڈالیں یوں کہ دونوں کی دھاریں ایک ہوکر پرنالے سے برتن میں گریں، اسی طرح پاک و ناپاک دونوں گھی ملاکر ڈالیں یہاں تک کہ سب ناپاک گھی پاک گھی سے ایک دھار ہوکر برتن میں پہنچ جائے، سب پاک ہوگیا، خزائن میں ہے إناءان کان احدھما طاھر والاخر نجس فصبا من مکان عال فاختلطا فی الھواء ثم نزل وطھر کلہ۔

پہلے طریقے میں پانی سے گھی کو تین بار دھونے میں گھی خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ دوسرے طریقے میں ابل کر تھوڑا گھی ضائع ہوجائے گا۔ تیسرا طریقہ بالکل صاف ہے مگر اس میں احتیاط بہت درکار ہے کہ برتن میں ناپاک گھی کی کوئی بوند نہ پاک سے پہلے پہنچے نہ بعد کو گرے نہ پرنالے میں بہاتے وقت اس کی کوئی چھینٹ اڑکر پاک گھی سے جدا برتن میں گرے، ورنہ برتن میں جتنا پہنچایا اب پہنچے گا سب ناپاک ہوجائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اب سوال یہ ہے کہ مولانا نے جو اپنے فتوے میں ایک طریقہ میں درر دوسرے میں جامع الرموز اور تیسرے میں خزائن کا حوالہ دیا ہے تو کیا وہ واقعہ کے عین مطابق ہے؟ اور یہ کہ کیا یہ مذکورہ طریقے متعمد علیہا ہیں۔؟

بینوا توجروا۔ بارک اللہ لکم۔

التبصرۃ علی الجواب :- پہلے جواب کی تقدیر پر گھی تو پاک ہوجائے گا مگر اس کے مضر ہونے کا اندیشہ ہے جیسا کہ خود مجیب نے لکھا ہے کہ اس طریقہ سے تین بار دھونے میں گھی خراب ہونے کا اندیشہ ہے اور اسی وجہ سے فقہاء کرام نے عامۃً جوش دینے کو لکھا ہے اور بتلایا ہے کہ گھی کی مقدار پاک پانی میں گھی ڈال کر جوش دیں بعد جوش کے جب گھی پانی مختلط

ہوجائیں۔ گھی اوپر سے اتارلیں اور تین بار ایسا ہی کریں، لہٰذا اس جواب (۱) کی تعبیر میں سقم ہے اور بالخصوص جب کہ اس طریقہ پر کوئی معتبر وصریح حوالہ نہیں ہے۔ جو حوالہ ہے وہ یہ نہیں بتلاتی کہ یہ تحریک ٹھنڈے ہی پانی میں ہو

دوسرے جواب کی تعبیر میں بھی غلطی ہے، اس لئے کہ جس عبارت (عبارت جامع الرموز) سے استدلال کیا ہے اس میں لفظ باجی ائمہ مع جنسہ مختلطا بہ ہے اجرار کے معنیٰ ابلنے کے نہیں آتے بلکہ بہا دینے کے آتے ہیں اور اس بہا دینے (اجرار) کا یہ طریقہ نہیں ہوسکتا جو اس جواب میں مذکور ہے۔

تیسرا جواب کوئی الگ اور مستقل شکل نہیں ہے، بلکہ وہی ہے جو ۲ میں جامع الرموز سے نقل کیا ہے۔ پھر اسی تیسرے جواب میں جو دو شقیں بیان کی ہیں اس میں پہلی شق میں تعبیر کی غلطی کے ساتھ آپس میں عبارت کے اندر تدافع و تزاحم بھی ہے، اس لئے وہ شق بے معنیٰ ہوکر رہ جاتی ہے اور دوسری شق بعینہ وہی ہے جو جواب ۲ میں جامع الرموز کی عربی عبارت میں ہے۔ لہٰذا اس کی دوسری تشریح بھی ناسمجھی یا غلط فہمی کی بنیاد پر ہے ۱۲

اور صحیح و آسان اور بے ضرر طریقہ پاک کرنے کا وہی ہے جو رد المحتار وغیرہ فقہاء احناف کی معتبر کتابوں میں مذکور ہے جس کو بہشتی زیور میں بھی نقل کیا ہے

فلینظر ھناک فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دار العلوم دیوبند ۹۶/۴/۳۰ھ

الجواب صحیح

سید احمد علی سعید

دار العلوم دیوبند

پیشاب فلٹر کرنے کے بعد بھی ناپاک رہے گا

سوال (۱۱۱) ابھی کچھ ایام قبل روسی سائنسدانوں نے ایک شخص کو ایک ہوا بند کوٹھری میں تجربہ کے طور پر بند کر دیا اور اس کے لئے سامان خورد و نوش کا کچھ انتظام کر دیا، لیکن کچھ ایام کے لئے پانی سپلائی نہ کیا تاکہ پانی کے بغیر زندگی کا تجربہ کر سکیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایک برتن میں پیشاب کیا اور اس کے تمام اجزاء متعفنہ اور خاریہ کو ایک مشین سے کشید کر کے ختم کر کے مثل پانی کر دیا جس طرح سمندری پانی کو کھارے سے تبدیل کر کے میٹھا بنا لیتے ہیں۔ اب فرمائیے کہ یہ تقلیب ماہیت یا قلب ماہیت کے ماتحت آتا ہے یا نہیں؟ مع دلائل شرعیہ نقلیہ و عقلیہ ثابت فرمائیں۔؟۔

الجواب:۔ اس کشید کرنے کا حاصل تو صرف یہ ہے کہ پیشاب کے اندر سے اس کے متعفن اجزاء اور مضرت رساں اجزاء کو نکال دیا گیا ہو اور باقی جو اجزاء بچے وہ اسی پیشاب کے اجزاء ہیں۔ اور پیشاب بجمیع اجزائہ نجس العین اور نجس بنجاست غلیظہ ہے، اس لئے یہ باقی ماندہ اجزاء بھی نجس العین اور نجس بنجاست غلیظہ ہی رہیں گے۔ اس میں تقلیب ماہیت کی کوئی صورت نہیں پائی گئی۔ اس کو قلب ماہیت نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ تو تجزیہ و تخرجہ ہوا نہ کہ قلب ماہیت۔ قلب ماہیت تو یہ ہے کہ سابق حقیقت معدوم ہو کر نئی حقیقت و نئی ماہیت بن جائے نہ پہلی حقیقت و ماہیت باقی رہے نہ اس کا نام باقی رہے نہ اس کی صورت و کیفیت باقی رہیں نہ اس کے خواص و آثار و امتیازات باقی رہیں بلکہ سب چیزیں نئی ہو جائیں، نام بھی دوسرا صورت بھی دوسری آثار و خواص بھی دوسرے، اثرات و علامات اور امتیازات بھی دوسرے پیدا ہو جائیں جیسے شراب سے سرکہ۔ فقط واللہ اعلم۔ کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

بسکٹ جو نجاست میں گر جائے اس کا حکم

سوال (۱۱۲) ہمارے بسکٹ جو کاغذ میں ملفوف تھے، ایک دم اچانک غلیظ پانی میں گر پڑے فوراً ہی نیچے پہنچ کر ایک آدمی نے اٹھا لئے۔ کھول کر دیکھا تو بعض پر چار چھ دھبے یا ہلکے چھینٹے تھے اور بعض پر صرف کاغذ کی تری ہی پہنچی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کے پاک کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ کیا بسکٹوں کے تنور میں اس کو سینک کر پاک کر سکتے ہیں۔ بینوا بالدلیل توجروا عند الجلیل۔

الجواب:۔ محض سینکنے سے یہ بسکٹ پاک نہ ہوں گے۔ سینکنے سے نجاست کے اجزاء لطیفہ تو نکل سکیں گے مگر اجزاء ثقیلہ وکثیفہ کا اخراج نہ ہوگا۔ اس لئے یہ سوال ہی بے کار ہے۔ البتہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جس حصہ پر نجس پانی یا نجاست کا اثر (دھبہ وغیرہ) ہو اس کو کھرچ کر نکال دیا جائے۔ اور بقیہ کو استعمال کر لیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین غفرلہ

دار العلوم دیوبند ۳۰/۴/۹۶ھ

صحیح

محمود غفرلہ

ریح خارج ہونے پر وضو کرنے کا حکم کیوں ہے

سوال (۱۱۳) ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ ریح خارج ہونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، لیکن ایک بہت ہی تعلیم یافتہ غیر مسلم کا سوال ہے کہ ریح خارج ہونے پر آپ وضو ہی کیوں کرتے ہیں، آب دست کیوں نہیں کرتے۔؟

الجواب:۔ خروج ریح میں وضو کا حکم اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس سے نجاست نکل کر بدن پر لگ جاتی ہے، اور اس نجاست کو دور کرنے کا یہ طریقہ ہے، کہ سوال پیدا ہو کہ پائخانہ کے مقام پر تو ضرور ہی لگی ہوگی۔ پھر اس کو دھونے کا

حکم کیوں نہیں ہے؟ بلکہ یہ امر تعبدی ہے اور اس کی وجہ دوسری ہے اور حکم خداوندی ہے۔ اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہر انسان کے جسم میں کچھ نہ کچھ پائخانہ پیشاب وغیرہ (غلاظت) ہر وقت ہی رہتی ہے اور جب تک وہ غلاظت اپنے محل ومستقر میں رہتی ہے اس وقت تک اس آدمی کو نہ تو کوئی ناپاک کہتا ہے اور نہ کسی عضو کے دھونے وغیرہ کا حکم دیتا ہے۔ اور جب وہ غلاظت اپنی جگہ ومحل وظرف سے نکل کر جسم سے باہر آجاتی ہے تو فوراً دھونے اور پاک کرنے کا تقاضہ ہوجاتا ہے اور طبیعت سلیمہ دھوتی بھی ہے ورنہ سب کو نجس وناپاک قرار دیتی ہے اور ناپاک وگندہ تصور کرتی ہے اور اس سے منقبض رہتی ہے۔ پس ریح خارج ہونے میں اگرچہ کوئی غلاظت وغیرہ مثل پیشاب پائخانہ خارج نہ ہو، مگر وہ ریح پائخانہ کے محل ومستقر وظرف سے نکل کر باہر آتی ہے۔ اور کچھ نہ کچھ اثر غلاظت کا لے کر آتی ہے جیساکہ اس کی بدبو وغیرہ سے اندازہ ہوجاتا ہے اور اس سے طبیعت سلیمہ پر کچھ اثر انداز بھی ہوجاتی ہے، اور کچھ انقباض وتکدر بھی بسا اوقات طبائع سلیمہ میں پیدا ہوجاتا ہے۔ اس لئے عقل سلیم کا تقاضا تو یہ تھا کہ جب ریح خارج ہو تو اسی وقت فوراً آبدست بھی لے اور ہاتھ منھ دھوکر تکدر طبعی وانقباض بھی دور کرلیا جائے، اور اپنی بشریت کو اعلیٰ ومرتفع کرلیا کرے، مگر چونکہ اس میں عام طبائع پر تنگی واقع ہوتی، اور ناپاکی کسی جگہ لگی نہیں ہوتی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بشری کمزوری پر نظر فرماکر اور شفقت کرتے ہوئے یہ حکم تطہیر وتنظیف کا نہیں دیا، بلکہ یہ حکم دیا کہ کم از کم جب میرے دربار میں حاضری دینا ہو، اور نماز کے لئے آنا ہو۔ تو وہ بھی چونکہ میرے دربار کی حاضری ہے اس وقت کم از کم وضو یعنی ایک خاص طریقہ سے ہاتھ، منھ، پیر وغیرہ دھوکر آیا کرو، اس سے ہم وہی انشراح دیں گے جو فوراً پوری تطہیر سے تم حاصل کرتے، بلکہ بہ نظر شفقت

مزید یہ بھی آسانی فرمادی کہ اگر تم پہلے سے وضو کر چکے ہو، تو اگرچہ اس سے نماز بھی پڑھ چکے ہو، وہ بھی کافی قرار دے لیں گے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی حکمتیں ہیں جو صرف اللہ کے علم میں ہیں، اور بہت سی حکمتیں علماء نے بیان بھی کی ہیں، مثلاً اس عمل سے صفت ملکوتیت بھی پیدا ہوگی اور ملائکہ سے قربت ومناسبت بھی پیدا ہوگی، جو باعث قرب خداوندی ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دارالعلوم دیوبند ۱۳/۷/۹۶ھ

مہر فاطمی کی تحقیق موجودہ حالت کے اعتبار سے

سوال (۱۱۴۴)، ہم ایک بڑی تعداد میں انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ اور ہماری جماعت کا نام "نصرت یار چوراۃ خلیفہ سنت والجماعت یو، کے" ہے، اس جماعت کی ماتحتی میں ہم خوشی، غمی وغیرہ کے طور طریق شریعت کے موافق انجام دیتے ہیں۔ ہمیں یہاں انگلینڈ کی اقتصادی حالت کے پیش نظر مہر کے سلسلہ میں چند مسائل درکار ہیں۔ یہاں کا معاشرتی انتظام مختصر طور پر یہ ہے۔

لوگوں کی اقتصادی حالت بہت اونچی ہے۔ متوسط شخص کی ایک ہفتہ کی آمدنی اندازاً چالیس سے پچاس پونڈ ہے۔ دولہا جس وقت مجلس نکاح میں آتا ہے تو کم از کم ایک سو پونڈ کا لباس زیب تن کئے ہوتا ہے۔ نیز نکاح پڑھانے والے اور مسجد ومدرسہ کو بطور ہدیہ اندازاً ۲۰ ر پونڈ دیئے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ دوسرا خرچہ الگ ہوتا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے۔

(۱) :- جس عورت سے نکاح ہوتا ہے۔ اسکی مہر فقط $127\frac{1}{2}$ روپیہ ہوتی ہے پونڈ کے حساب سے مقرر نہیں کی جاتی۔ اب بہت سے لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ مہر کی یہ موجودہ رقم حالت کے اعتبار سے بہت ہی کم ہے۔ تو اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے ؟۔

ر۲ :- مہر فاطمی کتنی ہے اور کیا ہے؟ ۱۲۷ ½ روپیہ یہ مہر فاطمی شمار ہوتی ہے یا نہیں؟

ر۳ :- شریعت میں مہر کی زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم مقدار کیا ہے؟

ر۴ :- شریعت کی نظر میں کتنی مقرر شدہ مہر عمدہ مہر ہے -

مندرجہ بالا سوالات کے جوابات حدیث کی روشنی اور کتابوں کے حوالہ کے ساتھ عنایت فرمائیں - جواب کا ازحد انتظار رہے گا - اس لئے مہربانی فرماکر پہلی فرصت میں جواب سے نوازیں -

الجواب :- ر۱ - آج سے تقریباً ۵۰-۶۰ رسال قبل ۱۲۷ ½ روپیہ ۱۲۷ ½ تولہ خالص چاندی کے برابر شمار ہوتا تھا - اب تو ایسا نہیں ہے - اب تو روپیہ کاغذ کے ہونے لگے - اور ۱۲۷ ½ روپیہ سے صرف ۸-۹ ر تولہ خالص چاندی کے برابر بھی بمشکل ہی سے ہونگے اور مہر فاطمی کے برابر تو کسی طرح بھی نہیں ہوسکتے مہر فاطمی کی مقدار بعض محققین کے نزدیک ایک سو چالیس (۱۴۰) تولہ چاندی کے برابر ہے - اتنی چاندی یا اتنی چاندی (۱۴۰ تولہ) جس زمانہ میں جتنے کاغذی روپیوں سے ملے گی اتنے روپئے مہر فاطمی میں دینے ہوں گے - اور بعض محققین کے نزدیک مہر فاطمی کی مقدار تقریباً ۱۳۲ ر تولہ چاندی کے برابر ہے - اتنی چاندی یا اتنی چاندی (۱۳۲ تولہ) جس زمانہ میں جتنے کاغذی روپیوں سے ملے گی اتنے روپئے مہر فاطمی میں دینے ہوں گے ــــ یہی دوسرا قول (تقریباً ۱۳۲ تولہ چاندی) حضرت مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم دار العلوم دیوبند۔ صاحب فتاویٰ دار العلوم کا ہے اور یہی ہمارے نزدیک ماخوذ بہ ہے -

وہاں کا جو معاشرہ و تمدن کا حال سوال میں درج ہے اور جو حقیقت مذکور ہے اس کے اعتبار سے واقعی یہ مقدار (۱۲۷ ½ روپیہ ان کاغذی روپیوں سے)

بہت کم ہے اسلئے کہ مہر کی اقل مقدار اگرچہ صرف دس درہم ہے جو تقریباً تین یا ساڑھے تین تولہ چاندی کے وزن کا ہوتا ہے۔ لیکن مہر کی بہتر مقدار کیا ہے اس کے بارے میں اپنے اکابر علماء کی دو رائے ہیں۔

(۱) تو یہ ہے کہ شوہر کی حیثیت کے اعتبار سے اتنی مقدار ہو کہ اس کا ادا کرنا تو شوہر کے استطاعت میں ہو مگر ادا کرنے میں شوہر کچھ دشواری اور بار محسوس کرے۔ یہ رائے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نور اللہ مرقدہ کی ہے اور اشبہ بالفقہ ہے۔ (۲) دوسری رائے مہر فاطمی کی مقدار کی ہے۔ یہ اختیار کردہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کی ہے اور الیسر للعمل ہے ــ اور جماعتی طور پر یکساں عمل کے لئے یہی مقدار زیادہ مناسب ہوتی ہے۔ خواہ ایک سو چالیس تولہ چاندی رکھ لی جائے چاہے ۱۳۲ر تولہ چاندی، دونوں کی گنجائش ہے۔

۲ :۔ اس نمبر کا جواب ۱ کے جواب میں آچکا بلکہ ۳ و ۴ کے جوابات بھی ۱ کے ہی جواب میں آچکے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیو بند

۲۸ ۸/۹۶ ھ

عیسائی مجسٹریٹ کے کرائے ہوئے نکاح کی شرعی حیثیت

سوال (۱۱۵) عدالت کورٹ میں عیسائی مجسٹریٹ کے سامنے نکاح ہوا اور مجسٹریٹ ایجاب وقبول کرائے اور دو گواہ مسلمان موجود ہوں، ایک عورت کی طرف سے اور دوسرا مرد کیطرف سے تو یہ نکاح شرعاً منعقد سمجھا جائیگا یا نہیں۔ مع دلائل جواب سے مشرف فرمائیں۔

نوٹ :۔ ایجاب وقبول کے الفاظ انگریزی میں ہوتے ہیں جس کا ترجمہ

حسب ذیل ہے تم زید عمر کہ سکتے ہو کہ تمہاری دانست میں کسی طرح سے باقاعدہ تمہارا نکاح مسمیٰ ہندہ بنت بکر کے ساتھ جو یہاں حاضر ہے تو اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہے اور تم ان گواہوں کے اور حاضرین کے روبرو جو یہاں موجود ہیں باقاعدہ ہندہ بنت بکر کو تمہاری عورت کے طور پر قبول کرتے ہو؟ - مجسٹریٹ کے مذکورہ سوال کے جواب میں نکاح کرنے کیلئے جو مرد وہاں موجود ہوتا ہے، کہتا ہے کہ" ہاں میں ہندہ بنت بکر کو میری عورت کے طور پر قبول کرتا ہوں"۔ پھر مجسٹریٹ نکاح کرنے کیلئے جو عورت وہاں حاضر ہے اس سے سوال کرتا ہے کہ" تو ہندہ بنت بکر کہہ سکتی ہے کہ تیری دانست میں کسی طرح سے باقاعدہ تیرا نکاح مسمیٰ زید بن عمر کے ساتھ جو یہاں موجود ہے تو اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہے۔ تو ان گواہوں اور حاضرین کے روبرو۔ جو یہاں موجود ہیں باقاعدہ زید بن عمر کو تیرے شوہر کے طور پر قبول کرتی ہے"۔ مجسٹریٹ کے اس سوال کے جواب میں عورت کہتی ہے کہ" ہاں" میں زید بن عمر کو اپنے شوہر کے طور پر قبول کرتی ہوں - پھر فوراً اس ایجاب وقبول کے بعد مجسٹریٹ دونوں مرد اور عورت کے داہنے ہاتھ طلب کرتا ہے اور دونوں کی ملاقات کرا دیتا ہے اور ان الفاظ میں نکاح کرا دیتا ہے" میں ظاہر کرتا ہوں کہ زید ابن عمر اور ہندہ بنت بکر جو یہاں حاضر ہیں دونوں نے باقاعدہ نکاح کر لئے مزید وضاحت کیلئے کورٹ میرج کا جو یہاں پر طریقہ رائج ہے۔ اس کی انگریزی نقل ارسال ہے۔ جواب سے نوازیں۔

الجواب:۔ حسب تحریر سوال جب عقد نکاح کی مجلس میں زوجین (مرد وعورت) دونوں خود موجود تھے تو اگرچہ عیسائی مجسٹریٹ کے کہنے سے یا پوچھنے سے مرد نے کہا" میں قبول کرتا ہوں"، اور عورت نے کہا "میں قبول کرتی ہوں"، تو چونکہ میں قبول کرتا ہوں اور میں قبول کرتی ہوں، یہ

دونوں قول فعل حال کے صیغے ہیں جو عقود میں مثل صیغہ ماضی کے یکساں مفید اور باعث انعقاد عقد ہوتے ہیں خواہ کسی زبان میں ہوں، جیساکہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے وھما (ای الایجاب والقبول) عبارۃ عن کل لفظین ینبئان عن معنی التملیک ماضیین او حالین۔ (تنویر الابصار)۔

لہٰذا پہلا قول ایجاب اور دوسرا قول قبول بن گیا۔ اور عقد نکاح کا ایجاب وقبول دونوں جو رکن نکاح ہیں پائے گئے اور یہ دونوں (میاں بیوی) خود عاقد نکاح اور مباشر نکاح (خود اپنے نکاح کا عقد کرنے والے) ہو گئے اور جب یہ ایجاب وقبول دونوں دو مسلمان گواہوں کے روبرو ہوا تو یہ نکاح بلاشبہ منعقد ہو کر لازم بھی ہو گیا۔ اور مجسٹریٹ محض واسطہ ونگراں کے درجہ میں رہ گیا تاکہ بوقت انکار ثبوت ہو سکے جیساکہ مندرجہ ذیل فقہی عبارتوں سے واضح ہوتا ہے۔

الف :- ویصح (النکاح) بلفظ تزویج ونکاح .... وبکل مایملک بہ الرقاب۔ (شامی ص ۲۷۴ ج ۲)

ب :- اذا کان الموکل حاضراً کان مباشراً لان العبارۃ منتقل الیہ وھو فی المجلس (شامی ص ۲۷۴ ج ۲)

ج :- قولہ لانھا تجعل عاقدۃ لانتقال عبارۃ الوکیل الیھا وھی فی المجلس فکانت مباشرۃ ضروریۃ (بحوالۂ بالا)

د :- قولہ وینعقد متلبساً بایجاب احدھما لا اشار الی ان المتقدم من کلام العاقدین ایجاب سواء کان المتقدم من کلام الزوج او من کلام الزوجۃ والمتاخر قبول (شامی ص ۲۶۲ ج ۲)

لا :- وتقبل شهادة المامور عند التجاحد وارادة الاثبات واما من حيث الانعقاد الذي الكلام فيه فهي مقبولة مطلقاً كما لا يخفى (رد المحتار ص۲۷۴ ج۲) -

اور جب مرد و عورت (زوجین) دونوں نے مجلس عقد نکاح میں خود موجود رہتے ہوئے ایجاب و قبول کے الفاظ کہدیئے تو اب مجسٹریٹ کو مندرجہ بالا عبارات کی بنا پر شرعاً قاضی نکاح اور عاقد نکاح نہیں قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح خطبۂ نکاح یا تذکرہ مہر کا نہ ہونا بھی مضر نہیں: اس لئے کہ خطبۂ نکاح نکاح کے شرائط و واجبات میں سے نہیں ہے، بلکہ سنن نکاح میں سے ہے اور سنن کے ترک ہو جانے سے اصل شئ ختم یا باطل نہیں ہو جاتی۔ بیش از بیش اگر خود بغیر کسی جبر و اکراہ کے اور بغیر کسی قانونی مجبوری کے محض اپنی مرضی سے ایسا عقد یعنی بغیر خطبہ و بغیر تذکرۂ مہر کے) کیا جائے تو خلاف سنت کے ارتکاب کا گناہ ہوگا، اور اگر قانونی مجبوری سے یا کسی جبر و دباؤ سے ایسا کریں تو اس ارتکاب کا گناہ بھی نہ ہوگا، جیسا کہ عبارات ذیل سے معلوم ہوتا ہے۔

( ) امر السلطان اكراه ولو لم يتهدده (فی کتاب الاکراه من الدر على الرد ص۸۹ تا ۹۰ ج۵) -

( ) في الحديث ان الله تجاوز عن امتى الخطاء والنسيان وما استكرهوا عليه - وفي شرحه اي وما طلب منهم من المعاصي على وجه الاكراه (مشكوٰة ص۵۸۴)

اسی طرح تذکرۂ مہر نہ ہونے سے بھی اس عقد میں کوئی خرابی یا فساد نہیں آیا۔ هدايه ص۳۰۴ ج۲ - ويصح النكاح وان لم يسم فيه مهراً - ۱۲ وهكذا في الدر والرد وغيرهما -

خلاصہ یہ کہ صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال اس عقد نکاح کے صحیح و لازم ہو جانے میں کوئی شبہ نہیں بلا شبہ بالکل صحیح ہو کر لازم و نافذ ہو جاتا ہے

فقط و اللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند

۹۷/۱/۳ھ

صاع کی صحیح مقدار

سوال (۱۱۶) فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے صاع کا وزن ۱۰۴۰ درہم لکھا ہے۔ عبارات فقہیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وزن جَو کے صاع کا ہے۔ علامہ شامیؒ نے بھی یہی لکھا ہے کہ اتنے وزن کے جَو سے جو برتن بھر جائے وہ صاع ہوگا، احتیاط بھی اسی میں ہے۔

پس اگر اس برتن میں گیہوں بھر کر وزن کریں تو وہ جو کے مذکورہ وزن سے یقیناً زیادہ ہوگا، پھر گیہوں بھی مختلف وزن کے ہوتے ہیں، اس لئے اس کے نصف صاع کا صحیح اور یقینی وزن معلوم کرنے کا طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۴۰ درہم جَو وزن کر کے ایک برتن میں بھر لیں پھر اس برتن کو ماش سے بھریں، پھر ان ماش کا وزن کریں تو جو وزن آئے گا، گندم میں وہی وزن معتبر سمجھا جائے۔ کیونکہ گیہوں کی کسی بھی نوع کا وزن ماش سے زیادہ نہیں ہوسکتا (کذا فی الشامیۃ)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ۱۰۴۰ درہم کا حساب سیر اور تولہ سے لگا کر اس وزن کے مطابق گیہوں کا صاع قرار دینے کا جو معمول چلا آ رہا ہے وہ صحیح نہیں ہے یہاں ۷۰ جَو کا وزن برقی مشینوں سے کرایا گیا تو ۲۷۶۵۸۱۷ رتی ہوا اس حساب سے نصف صاع ایک سیر ½ ۶۹ تولہ ہوا۔ لہٰذا اتنے جَو سے جو برتن بھر گیا

ایسے گیہوں سے بھر کر وزن کیا تو ۲ر سیر ۳۰ر تولہ ہوا، اور ماش سے بھر اگیا تو ۲ر سیر ۳۶ر تولہ ہوا۔

پس تحقیق مذکور کی بنار پر گیہوں سے صدقۃ الفطر ادا کرنے کے لیئے ۲ر سیر ۳۶ر تولہ گیہوں ہونے چاہئیں۔ تحقیق کرنے سے اس طرح سمجھ میں آیا ہے۔

حضرات مفتیان کرام اس کے متعلق اپنی رائے گرامی تحریر فرمائیں۔

الجواب :- حضرت مفتی محمود صاحب علیل ہیں بسلسلہ علاج باہر تشریف لے گئے۔ اور یہ گرامی نامہ مع سوال کے احقر کے سپرد فرما گئے کہ تو ہی اس سلسلہ میں جواب لکھ دے، اس لئے جرأت شمع خراشی ہے۔ اگر کوئی بات صحیح ادا ہو گئی تو اللہ کا شکر ہے، ورنہ معذرت خواہی کے ساتھ حصول فہم سلیم و حصول طبع مستقیم کیلئے دعاء کی درخواست ہے سوال کے متعلق جو بات ذہن میں ہے عرض ہے۔

سب سے پہلے ان حسابی تحقیقات و تدقیقات کا شرعی درجہ متعین و معلوم کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شرع شریف میں ان کا کیا مرتبہ ہے؟ آیا صحت ادا کے لئے یہ حساب یا کوئی حسابی تحقیقات و تدقیقات اختیار کرنا لازم ہے؟ کیا اس کے بغیر ادائیگی صحیح نہ ہو گی اور فرض ذمہ میں باقی رہ جائیگا یا کچھ اور صورت ہے۔

اس سلسلہ میں چند نصوص کی طرف ذہن رہنمائی کرتا ہے۔

مثلاً۔ (الف) نحن امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب۔

(ب) الدین الفطرۃ۔

(ج) الدین یسر۔ وغیر ذلک۔

ان سب کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص حساب، کتاب جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، بدوی ہو یا شہری ہو، عالم ہو یا جاہل، مرد ہو یا عورت۔ ہر ایک جب عاقل بالغ غیر معذور و مکلف ہو، تو احکام شرع پر بآسانی عمل کر کے اپنے معبود حقیقی سے اپنا رشتہ جوڑ سکے۔ اور خطاب تکلیف میں کامیاب ہو سکے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ حسابی تحقیقات و تدقیقات ہر فرد بشر کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہنا پڑے گا کہ یہ حسابی تحقیقات و تدقیقات مدار نجات یا مدار صحت عمل، یا مدار صحت ادا نہیں ہو سکتے۔ بیش از بیش ان کا مرتبہ تحسین یا استحباب کے درجہ میں ہوگا، یا یہ چیزیں طمانیت قلب کے قبیل سے ہوں گی مکلف کی برأت ذمہ کے لئے موقوف علیہ ہرگز نہ ہوگی۔

پس فقہاء کرام کی یہ ابحاث اسی درجہ و قبیل کی ہوں گی، عمل کے صحت و جواز کے لئے معیار یا مدار نہ ہوں گی۔

اور ساتھ ہی یہ بات بھی سامنے رکھنا چاہئے کہ صدقہ فطر کی مقدار نصف صاع حنطہ (گیہوں)، یا ایک صاع شعیر (جو) واجب ہونے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس واجب کی ادائیگی بلا تکلف صاع مدینہ سے یا جو صاع میسر ہوا اس سے یا جس نوع کے صاع کی ہدایت تھی اس سے نصف صاع یا ایک صاع ادا فرما دیتے تھے، اور سبکدوش و بری الذمہ قرار دیئے جاتے تھے۔

ایسا ہرگز نہیں تھا کہ جس صاع کا اعتبار تھا اور جس صاع سے ادا فرماتے تھے وہ سارے کے سارے ایک تاریخ کے بنے ہوئے تھے یا ایک ہی نوع کے تھے، بلکہ نئے پرانے جو میسر آ گئے ان سے ادائیگی کر لی، خواہ پتھر سے بنے

ہوئے ہوں یا لکڑی سے بنے ہوئے ہوں - اور مشاہدہ ہے کہ بالکل پرانا صاع جو مدتوں سے بار بار استعمال ہوتا ہے اس کا ظرف واندرونی خول کافی بڑھ چکا ہوتا ہے، بالخصوص جب لکڑی کا ہو، اور جو صاع بالکل تازہ اور نیا ہوتا ہے اس کا اندرونی خول وظرف کم اور چھوٹا ہوتا ہے -

اور بڑے خول وظرف میں زیادہ مقدار غلہ کی سمائے گی اور چھوٹے میں کم مقدار سمائے گی اور وزن کرنے میں دونوں کی مقداروں میں بڑا فرق بھی ہوگا، مگر ادا سب کی تسلیم کی گئی -

اسی طرح ادائیگی میں کوئی قید نہیں کہ اتنے وزن وحجم اور اتنی ذبازت کے گیہوں یا جَو ادا کئے جائیں -

بلکہ جو گیہوں یا جَو میسر ہوا ادا کر دیا، یا بیش از بیش اوسط درجہ کا لحاظ کر لیا اس میں گیہوں کے ہلکے اور بھاری ہونے کے اعتبار سے بڑا فرق آنا ظاہر ہے - بھاری اور وزنی گیہوں جو ایک صاع میں یا نصف صاع میں سمائے گا اس کا وزن بہت زیادہ ہو جائے گا - اور ہلکے گیہوں کا وزن کم ہو جائے گا، اور اس کی مقدار بھی وزن کے اعتبار سے بہت کم ہو جائے گی -

باوجود ان تمام باتوں کے ادائیگی سب کی صحیح ومعتبر مانی گئی، اگر یہ حسابی تحقیقات وتدقیقات مدار یا شرط ہوں تو ان سب کی ادائیگی کیسے صحیح ومعتبر ہوگی بلکہ بہت سارے صحابہ کرام رض (نعوذ باللہ من ذلک) قاصر الادا، قاصر العمل، قابل مواخذہ قرار پا جائیں گے (ثم العیاذ باللہ) -

قرن اول کا یہ عام حال بھی اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ حسابی تحقیقات وتدقیقات مطلوب شرعی نہیں، اور اس کو لازم وضروری قرار دینا یا اس پر صحت ادا کو یا برأت عن الذمہ کو موقوف یا معلق کرنا منشاء ومزاج شرع کے خلاف ہوگا

اور بہت ممکن ہے، قبلہ بابا حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے اس تحریر (سوال صاع کی تقریبی تحدید) (جواب) چونکہ ہر جگہ کا حساب مختلف اور وزن مختلف ہے، پس شتر جو دم بریدہ غیر مقشر کا ایک درم، پس اس حساب سے رطل بنالیں۔ اور آٹھ رطل کا ایک صاع بنالیں اور کسی کی تحریر کا اعتبار نہ کریں (فتاویٰ رشیدیہ ص۳۶۱ کامل ہر سہ حصہ) کے اس جملہ میں (کہ اور کسی کا اعتبار نہ کریں) اس جانب بھی اشارہ ہوا کہ اس میں غلو کرنا درست نہیں اور ان کو شرط لازم قرار دینا یا مدار صحت یا مدار برأت عن الذمۃ قرار دینا منشاء و مزاج شرع کے خلاف ہوگا۔

نیز یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ ایک ملک کے تول یا ناپ یا سکہ کو جب دوسرے ملک کے تول یا ناپ یا سکہ میں ڈھالا جاتا ہے اور مطابقت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو دونوں کی بنیاد مختلف ہونے کی وجہ سے انطباق مکمل اور صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً درہم کے وزن کو جب ہم تولہ، ماشہ کے وزن سے منطبق کرنا چاہیں گے تو کبھی پورا انطباق نہ ہوگا، اس لئے کہ ہندی وزن تولہ، ماشہ کی بنیاد خشخاش پر ہے کہ آٹھ خشخاش کا ایک چاول پھر آٹھ چاول کی ایک رتی پھر آٹھ رتی ایک ماشہ پھر بارہ ماشہ ایک تولہ۔

اور درہم (عربی وزن) کی بنیاد شعیر (جو) پر ہے کہ پانچ شعیر کا ایک قیراط چودہ قیراط کا ایک درم۔

لہٰذا جب تک شعیر (جو) کا چاول یا خشخاش یا رتی کے ساتھ کلی انطباق نہ ہوگا ان دونوں سے بڑے وزن مثلاً تولہ اور درہم میں بھی کلی انطباق نہ ہوگا بلکہ جتنا فرق چھوٹے اور بنیادی اجزاء میں ہوگا اس سے کئی گنا زیادہ بڑے

وزن میں ہوگا، اگر تولہ کے درجہ میں دو خشخاش کا بھی فرق ہوگیا تو من اور کوئنٹل تک پہنچتے پہنچتے ایک من کا سوا من اور سوا من کا ایک من بھی ہوسکتا ہے، پھر اسی طرح شعیر بھی مختلف جسامت اور حجم و وزن کے ہوتے ہیں اور چاول و خشخاش بھی مختلف وزن و حجم و جسامت کے ہوتے ہیں۔ پس کوئی شخص کسی وزن و حجم کے ساتھ انطباق معلوم کرے گا اور کوئی شخص کسی اور وزن و حجم کے ساتھ انطباق معلوم کرنے کی کوشش کرے گا اور ایسی صورت میں عدم انطباق ناگزیر ہوگا، اور صاحب درمختار نے جو ماش و عدس کے ذریعہ سے وزن کرنے کا ذکر کیا ہے، وہ صرف اس بنیاد پر ہے کہ ماش و عدس مختلف وزن و حجم کے نہ ہوں۔ ممکن ہے صاحب در کے زمانہ میں ماش و عدس سب ایک وزن و حجم کے ہوتے رہے ہوں، لیکن اس زمانہ میں بالخصوص ہمارے اطراف میں تو ماش و عدس دونوں مثل گیہوں و جَو کے مختلف حجم و وزن کے ہوتے ہیں لہٰذا یہ دردسری محض بیکار ہوگی اور غیر مفید ہوگی۔ جیسا کہ خود علامہ شامیؒ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا صاحب درمختار کی تحقیق پر بنار کر کے کوئی فیصلہ کرنا صحیح نہ ہوگا۔

اسی طرح برقی مشینوں کے ذریعہ سے وزن کی جو مقدار معلوم ہو فقط اسی کو لازم قرار دینا اور اسی پر صحت ادا کو معلق کرنا بھی صحیح نہ ہوگا، اور نہ اس کی بنیاد پر خلفاً عن سلفٍ عند الجمہور جو معتبر و معمول بہ چلا آرہا ہے اس کی تغلیط درست ہوگی، جیسا کہ نصاب زکوٰۃ میں اپنے اکابر کا ذوق معلوم و مشہور رہے کہ مقدار نصاب (۵۲½ تولہ) چاندی کو جو جمہور سلف سے بطور توارث چلا آتا ہے، اس کے خلاف مؤقر علمار کی تحقیق کے بعد بھی اس کو ترک نہیں کیا گیا کما صرح بہ صاحب الاوزان الشرعیہ (جواہر الفقہ ص۱۴ و ص۱۵) للمفتی

محمد شفیع مد ظلہ العالی)۔

ہاں یہ الگ بات ہوگی کہ اگر کوئی احتیاط برتے اور مشینی وزن کی مقدار کے مطابق ادا کرے تو یہ احتیاط ہوگی، اس کو ممنوع یا ناجائز نہ کہیں گے۔ لیکن ایسے شخص کو اس کا بھی حق نہ دیں گے کہ وہ دوسروں کو اسی کے ذریعہ حاصل شدہ مقدار پر ادائیگی کے لئے مجبور کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عغرلہ

دارالعلوم دیوبند

۹/۹/۹۶ھ

کپاس کی خریداری میں حکومت کی دی ہوئی رقم جو سود کے نام سے دیتی ہے اس کا حکم

سوال (۱۱۷) ہمارے یہاں کپاس کی کاشت عموماً ہوتی ہے، اور اس کیوجہ یہ ہے کہ اس کی فروخت نہایت آسان ہے، کسان کو بیک وقت تمام روپیہ مل جاتا تھا۔ لیکن سال گذشتہ حکومت مہاراشٹر نے قانون ادھیکار کے ذریعہ ہر کسان پر لازم کردیا کہ وہ سرکاری کارندوں کے ہاتھ سرکاری خریداری مرکز پر فروخت کریں جس کا نرخ بھی مقرر کرچکی ہوتی ہے۔ اب مجبوراً کسان ایسا کرتے ہیں جس کی وجہ سے پوری قیمت کا صرف ۳۰ فی صد دیا جاتا ہے اور وہ بھی ہفتہ عشرہ کے بعد بذریعہ بینک۔ باقی ۷۰ فی صد دو قسطوں میں غیر مدت متعینہ پر ملتی ہے۔ جس میں آٹھ ماہ لگ جاتا ہے، پھر نرخ بھی اور صوبوں کے مقابلہ میں کم رکھا ہے۔

پھر دو قسطوں والی رقم واجب الادا میں سے ایک قسط روک لی اور اعلان کیا کہ اس کو ۱۰ فی صد کے حساب سے سود ادا کیا جائیگا جس کی وجہ سے وہ رقم ایک سال بعد کسانوں کو ملتی ہے۔

اب حکومت اس رقم کا تمام عرصہ کا سود ادا کر رہی ہے جتنے دنوں انھوں نے مذکورہ بالا رقم روک لی ہے۔

یہ قاعدہ ہم کسانوں خریداروں کے مرضی کے خلاف بنالیا گیا ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ اس دس فی صد پر جو سود دیتی ہے وہ شرعی سود کے حکم میں داخل ہو کر ہمارے لئے ناجائز ہے یا جائز؟۔

امید کہ جواب سے جلد نوازیں گے۔

الجواب:۔ اگر حکومت کسانوں کی مرضی کے خلاف ایسا کرتی ہے اور کسانوں کو مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے تو دس فی صد رقم جو سود کے نام سے حکومت خود کسانوں کو دیتی ہے، وہ شرعی سود کی تعریف میں نہیں آتی اور وہ رقم (دس فی صد) شرعاً سود نہ ہوگی بلکہ شرعاً جزو ثمن ہوگی، اور اس کا لینا اور استعمال کرنا سب جائز و درست رہے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند

۲۹/۸/۹۶ھ

سوال (۱۱۸) عورتیں قبرستان میں جا سکتی ہیں یا نہیں

کیا فرماتے ہیں علماء دین اور شرع متین ۔ عرض خدمت ہے کہ رشیدہ رضا جو یہاں ویلم گرلس انگریزی اسکول میں ٹیچر تھیں اور بریگیڈیر رضا کی بیوی تھیں، ان کا انتقال مورخہ ۵/اکتوبر ۱۹۷۶ء کو ہو گیا، ان کی لڑکی امریکہ میں تھی اور کچھ دوست احباب بھی باہر تھے کل مورخہ ۹/اکتوبر پرنسپل ویلم گرلس اسکول مس شری بستواان لڑکی اور کچھ انگریز عورتیں یعنی ہندو مسلم عیسائی اونچی خاندان کی عورتیں ان کی قبر پر پھول چڑھانے گئیں تو انھیں یہ کہہ کر قبرستان میں نہیں جانے دیا کہ عورتوں کا

قبرستان جانا منع ہے، ان کی امریکہ سے آئی ہوئی لڑکی کو بہت افسوس ہوا، اور بڑی ناامیدی کی حالت میں سب کو جانا پڑا، اور بڑی عجیب قسم کی باتیں اسلام کے خلاف کہیں، اور سوال کیا کہ ایسا حکم کس وجہ سے ہے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے لکھیں کہ عورتیں قبرستان میں کیوں نہیں جاسکتی ہیں، خلاصہ اور سمجھا کر لکھیں۔

دوسرے، شوہر اور بیوی کا رشتہ زندگی میں بہت عزیز ہوتا ہے اور دنیا میں ہر وقت ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں، مگر جب بیوی مرجاتی ہے، اور اسے دنیا کی آخری منزل پر بھی قبرستان لے جانے کی تیاری کرتے ہیں، قبرستان لے جاتے ہیں، قبر میں اتارتے ہیں، مگر اس کے شوہر کو چھونے تک نہیں دیتے منھ نہیں دیکھاتے، آخری منزل قبر تک جانے میں کندھا بھی نہیں لگا دیتے ایسا کیوں، پوری تفصیل سے لکھیں۔

میں اور میری بیوی دو ہی ہیں، اگر میں مرجاتا ہوں تو میری قبر کی کون دیکھ بھال کرے گا، مرنے کے بعد میری قبر پر کوئی بھی آنے جانے والا نہ ہوگا، کچھ عجیب سا معاملہ ہے۔ مجھے سمجھا کر لکھیں۔

تیسرے۔ قرآن مجید میں غلاموں کے حقوق ہیں اور غلاموں کو آزاد کرنے کے بارے میں بھی ہے، کسی بھی خوشی کے موقعہ پر یا کفارہ دینے کے لئے غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم ہے۔ غلام آزاد ہونے پر یا بیچے جانے پر دوسری جگہ جاسکتا تھا ویسے کسی بھی حالت میں اپنے مالک کی بلا رضامندی نہیں جاسکتا، پچھلی دنیا سے ابھی تک بہت کم آقا ہوں گے جو غلام کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرتے ہوں گے، ورنہ عام طور سے غلام کی کوئی عزت نہیں ہوتی تھی اور اسے بڑی مجبوری اور سختی کی زندگی گذارنی پڑتی تھی۔

انسان کے لئے یہ غلام اور لونڈی جس کے ساتھ ہمبستر... بھی ہو سکتے تھے کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ اسلام میں انسان انسان کو لونڈی غلام بنا کر رکھے، ایسا غلام لونڈی رکھنے کے بجائے اگر حکم ہوتا کہ کوئی غلام اور لونڈی نہیں ہوگا، سب کو آزاد کر دیا جائے تو بہت خوبصورت ہوتا، ویسے خدا کا حکم ہے شاید کوئی خاص بات ہو، آپ اس خاص بات سے میری جانکاری کرائیں، بیحد ممنون ہوں گا۔

الجواب: ۔ ۱ ۔ عورتیں اگر قبرستان میں پردہ کے ساتھ جائیں اور وہاں جا کر کفر و شرک کی کوئی بات نہ کریں، بلکہ کچھ آیات پڑھ کر ایصال ثواب کر دیں اور میت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مغفرت کر دیں اور قبر کو سجدہ یا بوسہ یا پھول وغیرہ نہ چڑھائیں تو اس صورت میں عورتوں کا بھی قبرستان جانا منع نہیں ہے۔ جو لوگ عورتوں کو قبرستان جانے سے روکتے ہیں وہ انھیں شرعی خرابیوں میں مبتلا ہو جانے کے خطرہ سے روکتے ہیں، اور یہاں تم پھول چڑھانا ہی مقصد بتایا گیا، ممکن ہے کہ اسی وجہ سے روک دیا ہو۔ کیونکہ یہ شرک کا فعل ہے۔

۲ : ۔ شوہر بھی اپنی بیوی کا جنازہ قبرستان لے جا سکتا ہے، قبر میں اتار سکتا ہے، کفن کے اوپر سے چھو سکتا ہے۔ چہرہ بھی دیکھ سکتا ہے۔ البتہ تنہائی میں یکجا نہ ہونے دیا جائے خطرہ ہے کہ فرط محبت سے چمٹ جائے یا بوس و کنار وغیرہ کوئی فعل ناکردنی کر بیٹھے، اور جہاں بھرے مجمع میں اس کا خطرہ ہوگا وہاں بھرے مجمع میں بھی روک سکتے ہیں۔ مگر یہ حکم محض ایک عارض کی وجہ سے اور عارضی و وقتی ہوگا نہ کہ عام حکم۔ ناواقفیت کی وجہ سے لوگوں نے اس کو عام حکم سمجھ رکھا ہے اور مطلقاً روک دیا ہے۔ اس لکھنے سے آپ کا اشکال رفع ہو گیا ہوگا کہ عورتیں بھی اوپر لکھی ہوئی شرائط

وقیود کے ساتھ جاسکتی ہیں، کوئی ممانعت نہ ہوگی، حدیث شریف میں ہے

انی نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا فانھا تذکرکم الموت ولکن لا تقولوا ھجرا

(ترجمہ) میں نے تم لوگوں کو زیارت قبور سے منع کیا تھا اب اجازت دیتا ہوں، اب تم لوگ زیارت قبور کیا کرو، اس لئے کہ یہ لذات وخواہشات دنیوی کو توڑنے والی چیز (موت) کو یاد دلاتی ہے۔

انی نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا فانھا تذکرکم ھاذم اللذات الموت

اس حدیث شریف میں خطاب مردوں وعورتوں دونوں کو ہے اور اجازت دونوں کی ہے۔ اور آداب زیارت وہی (دعائے مغفرت وایصال ثواب و حصول عبرت ویاد آخرت وغیرہ) بتائے گئے جس کا ذکر اوپر احقر نے بھی کردیا ہے

ص۳:۔ جناب کے سامنے غلاموں کے صحیح حالات نہیں پیش کئے گئے اس لئے جناب کے ذہن میں یہ اشکالات پیدا ہو گئے ورنہ جناب تو تعلیم یافتہ اور سمجھدار لوگوں میں سے ہیں، اور اونچے طبقہ کے افراد میں سے ہیں۔ اگر صحیح صحیح تاریخ سامنے لائی گئی ہوتی اور جو حقوق اور مراعات شریعت اسلامیہ نے غلاموں کو دی ہیں، اور امت نے جو سلوک ان کے ساتھ کیا ہے وہ صحیح طور پر جناب کے سامنے لائے گئے ہوتے تو ہرگز جناب کو یہ اشکالات نہ ہوتے۔ صحیح حقیقت واضح ہونے کے لئے چند باتیں پہلے ذکر کردینا ضروری ہیں۔

الف:۔ غلام کب بنائے جاتے تھے اور کیوں بنائے جاتے تھے اور اس سے مقصد کیا ہوتا تھا۔

ب:۔ شریعت اسلامیہ نے غلاموں کے بارے میں کیا احکام نافذ کئے اور ان کو کیا حقوق ومراعات دیں۔

ج:۔ امت محمدیہ نے ان کے ساتھ کیا سلوک کئے اور ان حقوق ومراعات کی کہاں تک رعایت کی۔

ان تینوں عنوان پر تفصیل سے لکھنے کے لئے تو کئی جلدوں کی ضخیم کتاب درکار ہے مگر چونکہ اتنی فرصت نہیں، نیز آنجناب تو ماشاء اللہ خود ذہین اور ذی علم ہیں انشاء اللہ چند اشارات بھی کافی ہوں گے۔ اگر تفصیل کا شوق ہوگا تو سیر و تاریخ کی معتبر کتب سے ان اشارات کی خود تصدیق بھی ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی کتاب "القرآن فی الاسلام" اردو میں ہے اس کو بھی دیکھ لیں تو بہت کچھ معلومات حاصل ہو جائیں گی۔

(الف) جب خالق کائنات کا تعارف کرانے اور اس کا کلمہ (کلمہ توحید) دنیا والوں تک پہونچانے کے لئے اللہ کے کچھ سچے بندے (جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بہ نفس نفیس یا آپ کے صحابہ کرام عنہم) کسی قوم یا کسی ملک تک پہونچتے اور خالق کائنات کے باغی ان سے ٹکر لیتے اور قتل و قتال پر آمادہ ہو جاتے تو حق تو یہ تھا کہ جو گرفتار ہوتا ان کو بھی نہ تیغ کر دیا جاتا، مگر رحمت خداوندی نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ چنانچہ اسلام کا حکم یہ ہے کہ صرف ان لوگوں کا قتل کر دینا روا رکھا جائے گا جو میدان کارزار میں برسرپیکار ہو کر قتل ہو جائیں، یا اسی قسم کے کسی اور جرم کے مرتکب ہو کر مستحق قتل ہو جائیں۔

عام قتل کو کبھی بھی اسلام نے روا نہیں رکھا اور نہ کبھی اس کی اجازت دی۔ لہٰذا جو لوگ میدان کارزار میں اپنے خالق و مالک سے بغاوت کرتے ہوئے پکڑے جاتے تھے ان کو قتل نہ کیا گیا۔

اب اگر ان سب کو جیل میں ڈالدیا جاتا تو اول تو ان کے اندر اور عناد و بغض کی آگ بھڑکتی، دوسرے بلا وجہ اس کا بار حکومت پر پڑتا اور وہ مقصد بھی حاصل نہ ہوتا جو اللہ کو منظور تھا اور جس کا امت مسلمہ کو حکم تھا کہ اللہ کے ناواقف بندوں کو ہمدردی و بہی خواہی کے انداز میں اللہ سے واقف کراؤ

تلقین ایمان کرو، تعلیمات اسلام پہنچاؤ، کیونکہ اس میں سب سے بڑا مانع بغض وعناد ہے جو محبوسیت اور جیل کی زندگی کے تصور ہی سے قریب قریب لازم ہو جاتا ہے، اور اگر بغیر کسی سزا و تنبیہ کے بالکل چھوڑ دیا جاتا تو ان کی شرارت و بغاوت اور بڑھ جاتی اور ایسی بڑھتی کہ قابو سے بھی باہر ہو جاتی، اس لئے اسلام نے ایک تیسری صورت تجویز کی کہ ان قیدیوں کو مجاہدین پر تقسیم کر دیا جائے اور حکم یہ دیدیا کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرو، جو خود کھاؤ ان کو کھلاؤ جو خود پہنو، ان کو بھی پہناؤ، بالکل اولاد اور بھائی جیسا معاملہ کرو، اور ہمدردی و بہی خواہی کے انداز میں تلقین ایمان کرو، اسلامی تعلیمات و اخلاق سے خوگر بناؤ، ان کے ہر دکھ درد میں شریک رہو، ان کی ہر راحت و آرام کا خیال رکھو، ان کی طاقت سے زیادہ ہرگز ان پر کسی چیز کا بار نہ ڈالو وغیرہ وغیرہ جیسا کہ ہم خود (ب) کے جواب میں کچھ تفصیل عرض کریں گے۔ یہی وجوہ تھیں کہ غلام بھی مثل اولاد زیر تربیت لوگوں کے اپنے آقا و مربی کی مرضی و اجازت کے بغیر کہیں آتے جاتے نہیں تھے اور خود رائی وغیرہ نہیں کرتے تھے۔ اس چیز کو آپ کے سامنے اس قدر بھیانک انداز میں پیش کیا گیا جس سے آپ کو وحشت ہونے لگی جیسا کہ سوال کی عبارت سے مفہوم ہوتا ہے۔ ورنہ غلاموں کا اپنے آقا کی اجازت و مرضی سے تجارت کرنا کاروبار کرنا اور بڑے بڑے سفر کرنا سب کتابوں میں منقول ہے، غرض وہ اس طرح سے تبلیغ اسلام کا جو اسلام کا اصل مقصد ہی (اعلاء کلمۃ اللہ) تھا وہ بھی مکمل طور پر پورا ہوگا، اور یہی دوسری صورت میں جو مضر اور بھیانک خطرہ تھا وہ بھی پیدا نہ ہوگا۔ چنانچہ جب یہ خطرات ختم ہو گئے تو بجائے غلام بنانے کے بڑی بڑی تعداد فوراً رہا بھی کر دی گئی جیسا کہ غزوہ میں چھ ہزار نفر جو قتال کرتے ہوئے گرفتار ہوئے تھے بہ یک قلم رہا کر دیئے گئے۔

اسی طرح غزوہ تبوک وفتح مکہ وغیرہ کے اندر بھی ہوا، بلکہ فتح مکہ میں تو یہاں تک اعلان عام کر دیا گیا تھا کہ جو شخص فلاں کی پناہ میں آجائے گا وہ مامون وآزاد، اور جو شخص فلاں کے گھر میں پناہ گزیں ہو جائے گا وہ آزاد و مامون وغیرہ وغیرہ اور ایسا ہی کیا بھی گیا، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔

اتنے بیان سے یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کب غلام بناتا تھا اور کیوں بناتا تھا، اور اس سے اصل مقصد کیا تھا۔

(ب) بیان بالا سے بھی اجمالاً معلوم ہو گیا کہ اسلام نے غلاموں کے بارے میں کیا کیا احکام نافذ کئے اور ان کو کیا کیا حقوق ومراعات دیں، لیکن مزید توضیح وتوثیق کے لئے کچھ آیات واحادیث بھی پیش کردی جاتی ہیں۔ جن سے انشاء اللہ یہ بات اور بھی کھل کر سامنے آجائے گی۔

(۱) ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن (قرآن پاک)	اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت عملی اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور اگر مجادلہ ہی کرنا پڑ جائے تو) ان سے نہایت خوبصورت انداز میں اور نہایت مستحسن طریقہ سے مجادلہ کرو
(۲) (انھم) اخوانکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن جعل اللہ اخاہُ تحت یدیہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا یکلفہ من العمل ما یغلبہ۔ (بخاری مسلم)۔	وہ لوگ (غلام)، تمہارے بھائی ہیں، اللہ نے ان کو تمہارے قبضہ میں دے رکھا ہے پس جس کے قبضہ میں اللہ نے اس کے بھائی کو دے رکھا ہو، اس پر لازم ہے کہ جو خود کھائے وہی اس کو بھی کھلائے جو خود پہنے اس کو پہنائے اور اس پر اس کی قوت سے زیادہ بار نہ ڈالے۔

(۳) عن عبد الله بن عمرو جاءه قهرمان له فقال له اعطيت الرقيق قوتهم قال لا قال انطلق فاعطهم فان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال كفى بالمرء اثما ان يحبس عمن يملك قوته۔ (مشکوٰۃ ص۲۹۱)

حضرت عبد اللہ بن عمرو کے پاس ان کا ایک کارپرداز آیا (آتے ہی) اس سے پوچھا کہ غلام کو اس کی ضروریات دیدیں انھوں نے جواب دیا ابھی نہیں تو فرمایا کہ جاؤ پہلے اس کو دیکر آؤ، اس لئے کہ سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک انسان کے گنہگار ہونے کے لئے اتنا ہی بہت ہے کہ جو لوگ اس کے قبضہ اور ملک میں ہوں ان کی ضروریات کو روک لے یا تنگی میں ڈالے۔

(۴) ان رجلا مات ولم يدع وارثا الا غلاما كان اعتقه فقال النبي صلى الله عليه وسلم هل له احد قالوا لا الا غلام له كان اعتقه فجعل ميراثه له (ابوداؤد۔ ترمذی ابن ماجہ)

ایک شخص کا انتقال ہوا، اس نے اپنے پسماندگان میں سوائے ایک غلام کے جس کو کہ وہ آزاد کرچکا تھا نہیں چھوڑا تھا (اس کی وراثت و ترکہ کا تذکرہ ہوا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ آیا کوئی اس کے پسماندگان میں ہے جواب ملا کوئی نہیں سوائے ایک غلام کے جس کو وہ آزاد کرچکا ہے۔ تو آپ نے اس شخص کی میراث اس غلام کو دلائی۔

(۵) من ضرب غلاما له حدا لم يأته او لطمه فان كفارته ان يعتقه (مسلم شریف)

جو شخص اپنے غلام کو بلاوجہ مارے اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کردے۔

(۶) انہ علیہ السلام کان یقول فی مرضہ الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم۔ (ابوداؤد)

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مرض وفات میں نماز کے اہتمام کا اور غلاموں کے حقوق کی رعایت کی تاکید کا زیادہ تذکرہ فرماتے تھے

(۷) من ملک ذا رحم محرم منہ عتق علیہ (ترمذی ابن ماجہ)

جو شخص اپنے کسی محرم رشتہ دار کا مالک (کسی وجہ سے بھی) ہو جائے تو وہ اس پر (از خود) آزاد شمار ہو جائے گا۔

(۸) من اعتق رقبۃ مسلمۃ اعتق اللہ بکل عضو منہ عضوا من النار حتی فرجہ بفرجہ (بخاری ومسلم)

جو شخص ایک مسلمان غلام آزاد کر دے گا اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں اس غلام کے ہر ہر عضو کے بدلہ میں آزاد کرنے والے کے ہر ہر عضو کو جہنم کی آگ سے آزاد کر دیں گے

(۹) من اعتق شقصا فی عبد اعتق کلہ ان کان لہ مال وان لم یکن لہ مال استسعی العبد غیر مشقوق علیہ (بخاری ومسلم)

جو شخص (مشترک غلام میں سے) اگرچہ صرف اپنا حصہ آزاد کرے گا، جب بھی بقیہ حصہ آزاد ہو کر پورا غلام آزاد ہو جائیگا۔ اگر آزاد کرنے والا مالدار ہے ورنہ بقیہ حصہ کے بارے میں مکاتب بنا کر اس سے تجارت کرا کر بقیہ کا معاوضہ اس کے عزیب آقا کو دلا کر آزاد کر دیا جائے، اور غلام پر اس کی قوت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے

⁂ ⁂ ⁂

(۱۰) من اعتق نفسا مسلمۃ کانت فدیتہ من جہنم۔ (شرح السنۃ)

مسلمان غلام کا آزاد کر دینا عذاب جہنم کا فدیہ ہے اور عوض میں عذاب جہنم سے چھٹکارہ ہے۔

(۱۱) اذا ولدت امۃ الرجل منہ فھی معتقۃ عن دبر او بعدہ (مشکوٰۃ ص ۹۳)	جس باندی کو اس کے آقا سے بچہ ہو جائے تو وہ باندی آقا کے انتقال ہوتے ہی آزاد شمار ہوگی (اور کبھی فروخت نہیں ہو سکتی)۔
(۱۲) ان امی ملکت فھل ینفعھا ان اعتق فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعم۔ (مالک)	ایک عورت نے دربار رسالت میں آکر عرض کیا کہ میری ماں کا انتقال ہو گیا، اگر میں اس کے ثواب کی نیت سے غلام آزاد کردوں تو اس کا ثواب میری کو ملے گا، آپ نے فرمایا کہ ہاں ضرور ملے گا۔

ان احادیث پاک سے بھی آپ کو انشاء اللہ واضح ہو جائے گا کہ اسلام نے غلاموں کے بارے میں کیا کیا احکام نافذ کیے اور ان کو کیا کیا حقوق ومراعات عطا کیں اور ان کو آزاد کرنے کی کتنی ترغیبیں دیں بلکہ ان کے خود بخود آزاد ہو جانے کے کتنے راستے کھول دیئے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام سے مذاقاً بھی کہہ دے کہ تو آزاد ہے تو وہ شرعاً واقعی آزاد شمار ہو جاتا ہے اور غلامی سے نکل جاتا ہے۔ اور ان سب صورتوں میں کیا کیا حکمتیں تھیں اور ہوں گی ان باتوں کی طرف بھی احادیث بالا میں اشارہ ہے بلکہ حدیث ۱۰ سے تو یہ معلوم ہو گیا کہ آقا و مملوک ہونے کا رشتہ تو مثل نسب کے رشتہ کے ہو جاتا ہے حتی کہ حقوق وراثت میں بھی ایک درجہ ان کو (نسبی رشتہ کے بعد) دیدیا گیا ہے جیسا کہ بعض روایات میں وارد ہے الولاء لحمۃ کلحمۃ النسب) یعنی عتاقہ (آزاد کرنے کا) رشتہ مثل نسب کے رشتہ کے ہے اور اس رشتہ کے ذریعہ حقوق وراثت کی تفصیل کتب فقہ میں بھری

پڑی ہے۔

(ج) رہ گیا یہ سوال کہ امت محمدیہ نے غلاموں کے ساتھ کیا سلوک کیے، ان کے حقوق و مراعات کی جوان کو دربار رسالت سے ملے تھے کہاں تک رعایت کی۔

اس سلسلہ میں پہلے یہ عرض کرنا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جو غلام مسلمان ہو جاتا، اس کی منھ مانگی قیمت دے کر بھی صحابہ خرید کر آزاد کر دیتے، حالانکہ وہ دور مسلمانوں کے مالی فارغ البالی اور ثروت کا دور نہیں تھا چنانچہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ؄ اور حضرت صدیق؄ نے اپنی دولت کا بڑا حصہ اس میں صرف کر دیا، اسی طرح اور بھی بہت سے صحابہ کے باوجود عسرت کے متعدد کارنامے اس بارے میں منقول ہیں۔ پھر جب اللہ نے صحابہ کو مالی فروغ بخشا تو عام صحابہ کرام میں یہی وطیرہ عام ہو گیا تھا، یہاں تک کہ دور صحابہ ختم ہوتے ہوتے ایک لاکھ سے زائد غلام آزاد کئے گئے، تاریخ کامل وغیرہ کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے۔

پھر صحابہ ہی تک یہ طریقہ محدود نہیں رہا بلکہ دور تابعین و تبع تابعین میں بھی یہ طریقہ و دستور عام تھا۔ بے شمار غلام طرح طرح کے بہانوں سے جیسا کہ اوپر روایات میں مذکور ہے آزاد ہوئے اور یہی نہیں بلکہ بسا اوقات ان آزاد غلاموں کے ساتھ ایسا معاملہ و سلوک کرتے جو بالکل اپنے گھر و خاندان کے ایک فرد کے ساتھ کرتے ہیں، چنانچہ ان سب زمانوں میں غلاموں کی بڑی تعداد عالم، محدث، مفسر، فقیہ اور وقت کے مشائخ کبار میں سے اور قوم کے مقتدا بھی ہوئے اور حکومت کے ہر شعبہ کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔

چنانچہ حضرت عمار بن یاسرؓ جو آزاد کردہ غلام تھے، خود بہت بڑے عالم و فقیہہ تھے، اور کوفہ کے امام نماز اور کپتان تھے، اور حضرت حذیفہ کے غلام حضرت سالم بھی بہت بڑے عالم اور فقیہہ تھے اور امامت کے لئے آگے بڑھائے جاتے تھے اور بڑے بڑے صحابہ (مہاجرین اولین و خلفاء راشدین بھی)، ان کی اقتداء میں نماز پڑھتے تھے۔ اور عطاء ابن رباح مکہ کے حاکم اعلیٰ اور گورنر تھے۔ طاؤس بن کیسان یمن کے سردار اور حاکم اعلیٰ، یزید ابن جلیب مصر کے حاکم اعلیٰ اور گورنر تھے، مکحول دمشقی شام کے سردار اور حکمران اعلیٰ تھے، میمون ابن مہران اہل جزائر کے حاکم اعلیٰ و سردار تھے۔ ضحاک ابن مزاحم اہل حرم کے سردار و حاکم اعلیٰ تھے، حسن ابن ابی الحسن بصرہ کے سردار و حاکم اعلیٰ تھے۔ ابراہیم نخعی کوفہ کے سردار اور حاکم اعلیٰ تھے، اور یہ سب لوگ بڑے درجہ کے عالم، محدّث و فقیہہ بھی تھے۔

اسی طرح اور بھی بہت سے غلاموں کو حکومت میں ان کی صلاحیت کے مطابق بڑی بڑی ذمہ کے عہدے دیئے گئے تھے، یہاں تک کہ بعض غلاموں کی حکومت ہوگئی تھی اور پشتہا پشت تک چلتی رہی، اور پہلا غلام جو حکمراں ہوا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ اس نے ظلم یا قہر و تغلب سے تخت حکومت نہیں لیا ہے بلکہ اس کے آقا (**مالک**) نے خود اس کی صلاحیت دیکھ کر اپنی خوشی سے تخت شاہی سونپ دیا ہے۔ پس اگر کسی نے اپنے غلام پر ظلم و زیادتی کردی ہو تو اسلام نے اس کو اجازت نہیں دی تھی بلکہ اس کو ظالم و گنہگار قرار دیا اور ایسے لوگ لاکھ میں ایک دو ہی ہوں گے۔ جن کا اعتبار نہیں، اعتبار اکثریت کا ہوتا ہے۔

پھر کسی کا جناب سے یہ بتلانا کہ اسلام میں غلام کی کوئی عزت نہیں ہوتی

تھی اور اسے بڑی مجبوری اور سختی کی زندگی گذارنی پڑتی تھی بالکل فریب دہی ہوگی اور قطعی مبنی بر حقیقت بات نہ ہوگی۔

اسی طرح اور شبہات جو اسلام یا اسلامی تعلیم کے خلاف جناب کے ذہن میں ڈالے گئے ہیں وہ سب فریب دہی اور تاریخ کو مسخ کرنا ہے۔ امید ہے کہ اتنے اشارات سے جناب کی تشفی ہو جائے گی اور اگر مزید تحقیق کا شوق ہوگا تو تاریخ کی معتبر کتابوں کا مطالعہ فرمائیں گے، دشمنان اسلام کی مسخ کردہ تاریخ پر قناعت نہ فرمائیں گے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیوبند

خون اور انسانی اعضاء کو طبی اغراض کے لئے استعمال کرنے کا حکم

سوال (۱۱۹) موجودہ زمانہ میں انسانی خون اور اعضاء کو طبی اغراض کے لئے استعمال کرنا ایک عام بات ہو گئی ہیں؛ مثلاً

نمبر ۱:۔ مریضوں اور زخمیوں کو جان بچانے کے لئے انسانی خون کے انجکشن دیئے جاتے ہیں۔

نمبر ۲:۔ مرنے والوں کی آنکھیں متوفیٰ کی وصیت یا ورثہ کی اجازت سے نکال کر قابل علاج اندھوں کو لگائی جاتی ہیں۔

نمبر ۳:۔ اس مقصد کے لئے خون اور آنکھوں کے بینک قائم کئے جاتے ہیں

نمبر ۴:۔ خون وغیرہ کو خریدا اور بیچا بھی جاتا ہے۔

یہ صورت حال آج کل پوری دنیا میں پائی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا مذہبی نقطۂ نظر سے یہ جائز ہیں۔؟

سوال نمبر ۱:۔ اشکال یہ ہے کہ فقہاء نے اضطرار کے تعین کا حق طبیب

مسلم کو دیا ہے، لیکن ایلوپیتک اور سرجری علاج میں عموماً غیر مسلم ڈاکٹر ہی میسر آتے ہیں، لہٰذا ایسی صورت میں غیر مسلم ڈاکٹر کی رائے اور تحقیق پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اصولاً تو اعتماد کرنا چاہئے کیونکہ یہ مسئلہ شہادت کا نہیں ہے اس میں صرف حذاقت وعدالت ہی کافی ہوتی ہے، نیز اضطرار کے موقع پر یہ شرط عجیب ہی معلوم ہوتی ہے، اس وقت تو طبیب کی شرط بھی ختم کردی جاتی ہے۔

حضرت مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ "ضرورت میں متاخرین نے تداوی بغیر الطبیب کی اجازت دی ہے" (امداد الفتاویٰ ص۱۹۹)۔

لہٰذا خلاصہ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اضطرار اور ضرورت شدید کیحالت میں محض ماہر ڈاکٹر کی تجویز پر خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم کیا خون یا دیگر ممنوعات شرعیہ کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

سوال ۲:- اس لئے ضروری ہے کہ اضطرار کا ایسا کوئی شرعی معیار مقرر کیا جائے جس سے یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جائے کہ جس اضطرار کے نتیجہ میں اعضاء کی تبدیلی جائز ہو سکتی ہے وہ یہاں پایا جاتا ہے یا نہیں۔ اصولاً ہر مضرت اور حرج کا خوف کا نام اضطرار ہی ہے جیسا کہ آیت کریمہ ما یرید اللہ لیجعل علیکم فی الدین من حرج کے عموم سے متبادر ہوتا ہے، اسی لئے فقہ حنفی ہر مضرت کو اضطرار تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ تیمم کے باب میں جہاں "ازدیاد مرض" کے خوف کو اضطرار وحرج مانا گیا ہے کہ "ان المریض اذا خاف من زیادۃ المرض او البطاء البرد جاز لہ التیمم" وہی ان الفاظ میں مطلق خوف مرض کو بھی اس نے اضطرار ومضرت تسلیم کیا ہے الجنب الصحیح فی المصر اذا خاف بغلبۃ ظنہ عن التجربۃ الصحیحۃ ان اغتسل ان یقتلہ البرد او یمرضہ یتیمم عند ابی حنیفۃ (کبیری الشیخ ابراہیم الحنبلی" ص۶۲)،

کیاان مثالوں پر قیاس کرتے ہوئے حسب ذیل ضرورت کو اضطرار وا لی ضرورت مانا جا سکتا ہے، ضرورت یہ ہے، عمر کی آنکھوں کی اوپر کا پردہ خراب ہونے کی وجہ سے بینائی کا راستہ مسدود ہو چکا ہے، لیکن اگر کسی کی آنکھ اس کے لگا دی جائے تو ڈاکٹروں کی تحقیق یہ ہے کہ وہ بینا ہو جائے گا۔

(۱) کسی متوفی کی آنکھیں لے کر آنکھوں کی تبدیلی کرائے۔

(۲) اور کیا متوفیٰ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی آنکھوں کے متعلق یہ وصیت کرے کہ مرنے کے بعد ان کو نکالا جائے تاکہ وہ کسی کے کام آسکیں۔

(۳) اور چونکہ ایسی ضرورت پیش آنے کا کوئی وقت متعین نہیں ہوتا، اس لئے کیا یہ جائز ہے کہ بطور پیش بندی آنکھوں وغیرہ کو جمع کرنے کے لئے آنکھوں کا بینک قائم کیا جائے جس طرح اعدوالهم ما استطعتم سے اسلحہ وغیرہ کا جنگ اور نا جنگ دونوں حالتوں میں موجود رہنا ضروری معلوم ہوتا ہے

سوال ۳:۔ اگر آنکھوں کی تبدیلی جائز ہے تو ان کی خرید و فروخت یقیناً جائز ہونی چاہئے، کیونکہ فقہ کا مشہور اصول ہے کہ جواز البیع یدور مع الانتفاع۔ شامی ص ۱۴۲/۲۔ لیکن اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بیع سے حاصل شدہ رقم کی حیثیت کیا ہوگی۔

اصولاً تو اس رقم کو حرام ہی ہونا چاہئے کیونکہ یہ رقم ایسے مال کی بیع سے حاصل ہوئی جو خریدار کو تو بوجہ اضطرار جائز ہے، لیکن بائع کو لعدم الاضطرار حرام ہے؟

حضرات علمائے کرام اپنی قیمتی آراء و تحقیقات سے ادارہ کو مطلع فرمائیں۔ ادارہ آپ کی علمی کاوشوں کے لئے چشم براہ ہے۔

الجواب:۔ ۱:۔ جان بچانے کے لئے مجبوری واضطرار کی صورت میں انسانی خون کو استعمال کر لینے کی اور اس کا انجکشن لگا دینے کی

تداوی بالمحرم کے قاعدہ کے مطابق شرعاً گنجائش ہے، مگر اس گنجائش کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خون مباح الاصل ہوگیا یا مطلقاً جائز الاستعمال ہوگیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ضعف بشری اور معذوری کا لحاظ رکھتے ہوئے بطور مراحم خسروانہ اس استعمال پر آخرت میں مواخذہ یا گرفت نہ ہوگی، اور ایسا کرنے والے عنداللہ گنہگار شمار نہ ہوں گے، بلکہ عفو و درگزر کا معاملہ ہوگا۔

(۳، ۴) جب خون کے استعمال کی گو بدرجۂ مجبوری ہی ہو گنجائش ہوگی تو چونکہ ایسی مجبوریاں اچانک بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور خون کی بہت زیادہ، زیادہ مقدار کی متقاضی ہو جاتی ہیں، جیسے ریل کے ایکسیڈینٹ کے موقع میں، یا جنگ و محاربہ کے اندر بسا اوقات بیک وقت بہت زیادہ افراد زخمی ہو جاتے ہیں، اور ان کی جان بچانے کے لئے ان سب کو خون کا انجکشن دینا ضروری ہو جاتا ہے، پھر اس میں بھی مریض کے خون کا نمبر اور جو خون چڑھایا جاتا ہے اس خون کا نمبر بالکل یکساں ہونا ضروری ہوتا ہے، ورنہ بجائے نفع کے نقصان کا اندیشہ ہو جاتا ہے، اس لئے ان اچانک پیش آمدہ ضروریات کے لئے ہر نمبر کے خون کا فراہم رکھنا بھی ضروری ہو جاتا ہے اور مقدار کی تعین و تحدید معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کافی مقدار میں محفوظ رکھنا ضروری ہوگا، اور اس کا ایک خزانہ بنانا بھی لازمی ہوگا۔ جس کو آج کل کی اصطلاح میں بینک کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لان الشئ اذا ثبت ثبت بجمیع لوازمہ۔

لہٰذا اس فراہمی کے اور محفوظ رکھنے کے جو مناسب طریقے ہوں گے۔ اور ان میں جو اخراجات درکار ہوں گے، ان سب کو بھی حدود شرع میں رہتے ہوئے برداشت کرنا ہوگا۔

(۲) :- کوئی شخص اپنے کسی عضو کا مالک نہیں ہوتا، بلکہ صرف نگراں اور محافظ ہوتا ہے، اور حکم شرعی کے خلاف اس میں کسی تصرف کا بھی حق کسی کو نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی عضو کا زندگی میں فروخت کرنا یا کسی کو دینا یا مرنے کے بعد کے لئے دینے کی وصیت کرنا کچھ بھی جائز نہ ہوگا، یہی حکم شریعت مطہرہ کا اصل حکم خون اور تمام اعضاء انسانی کا ہے، اور سوال (۱) میں خون کے استعمال کی جو گنجائش ہے وہ صرف وقتی اور عارضی ہے اور حالت اضطرار و مجبوری میں۔ اور وہ اضطرار و مجبوری خون کے علاوہ اور عضو میں متحقق نہیں ہوتی جیسا کہ بعد کے جوابات سے واضح ہو جائے گا۔ اسی لئے کسی اور عضو کو خون پر قیاس کرنا بھی صحیح نہ ہوگا،

لہٰذا سوال (۲) میں درج شدہ صورت کے جواز کی شرعاً کوئی گنجائش نہ ہوگی اور ساری دنیا میں اس کا رائج ہو جانا بھی اس کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتا کسی غلط یا حرام شئی کا دنیا میں رائج و عام ہو جانا کوئی شرعی حجت نہیں ہے سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ بعثت میں سارا عالم کفر و ضلالت میں مبتلا تھا، اور طرح طرح کے محرمات و مناہی (ربوا وغیرہ) میں ابتلاء عام تھا، مگر یہ عموم و شیوع وجہ جواز نہ بنا، بلکہ آئندہ کے بارے میں بھی مروی ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ دین پر عمل کرنا اتنا دشوار ہوگا جیسے ہاتھ پر انگارہ لینا (مشکوٰۃ ۴۵۹)۔ نیز مسلم شریف میں ہے العبادۃ فی الھرج کالھجرۃ الخ یہ سب خود اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس وقت ارتکاب محرمات و مناہی عام و شائع ہو چکے ہوں گے اور عمل دشوار ہو جائیگا، مگر اس کے باوجود ان محرمات و مناہی کے جواز و اباحت کی جانب کوئی اشارہ نہیں دیا گیا۔

اور حکایات بھی یہی ہے کہ یہ شیوع مناہی و معاصی اور یہ پریشانیاں اور یہ

احوال .... ہمارے ہی اعمال بد کا ردعمل ہیں، کما روی اعمالکم عمالکم .... یا کما تکونوا یولی علیکم (الحدیث) بلکہ نص قرآنی ہے ان اللہ لم یک مغیرا نعمۃ انعمہا علی قوم حتی یغیروا مابانفسہم الاٰیۃ لہٰذا اصل علاج یہ نہ ہوگا کہ ہر چیز جو دائر و سائر اور عام ہو جائے، اس کے جواز کی راہیں تلاش کی جانے لگیں بلکہ اصل علاج انابت الی اللہ ہے۔ اور اس بات کی سعی ہے کہ قوم من حیث القوم میں مزاج و عمل ظاہراً و باطناً انابت الی اللہ کا ہو جائے۔

کما روی فی الحدیث القدسی عن ابی الدرداء قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یقول انا اللہ لا الٰہ الا اللہ انا مالک الملوک وملک الملوک قلوب الملوک فی یدی وان العبد اذا اطاعونی حولت قلوب ملوکہم علیہم بالرحمۃ والرافۃ وان العباد اذا عصونی حولت قلوبہم بالسخطۃ والنقمۃ فساموہم (ای اذاقہم) سوء العذاب فلا تشغلوا انفسکم بالدعاء علی الملوک ولکن اشغلوا انفسکم بالذکر والتضرع کی اکفیکم رواہ ابونعیم فی الحلیۃ (مشکوٰۃ ۳۲۳)

اب اس کے بعد جناب کے پیش کردہ سوالات کے جواب معروض ہیں

(۱) یہ مسئلہ اگرچہ باب شہادت کا نہیں ہے، مگر چونکہ اس میں ایک حرام قطعی کے استعمال کی گنجائش دینی ہوتی ہے جس کی حرمت منصوص بنص قطعی ہوتی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس اجازت کی علت یا بنیاد جو بفحوائے آیت کریمہ ومن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ ۵ پ ۶ - اور بفحوائے منطوق کلام الٰہی فمن اضطر فی مخمصۃ غیر متجانف لاثم

فان اللہ غفور رحیم ۵ پ۔ اضطرار و مجبوری جو بھی ہو وہ قطعی الثبوت ہونا چاہیئے اور یہ قطعیت معالج کے حذاقت فن و مہارت کے ساتھ اس بات کی متقاضی ہے کہ اس میں دیانت صحیحہ بھی ہو۔

اور یہ وصف (دیانت صحیحہ) صرف دیندار مسلم معالج میں ہی متحقق ہوگا۔ ہوسکتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک حلت و حرمت کی اہمیت دنیا و آخرت دونوں اعتبار سے ہوگی، اور وہ اس کے خلاف کے ارتکاب کی جرأت عموماً نہ کرسکے گا۔ دنیوی و اخروی دونوں وبال سے ڈرے گا، اور واقعی اضطرار و مجبوری کے مواقع کو تلاش کرے گا۔ اور احتیاط برتے گا۔

غیر مسلم سے یہ توقع نہیں، کیونکہ اس کو تو اس حلت و حرمت کا عقیدہ نہ ہوگا، تو اس سے اس قسم کی اہمیت کا کیا سوال، لہٰذا اس کا قول یا تشخیص کرنا حجت نہ ہوگا، بلکہ اگر طبیب مسلم بھی بادیانت نہ ہو تو اس کا قول بھی شرعاً معتبر نہ ہوگا ان ہی اسباب و وجوہ کی بنا پر فقہاء نے یہ قیود لگائی ہیں اور یہی اصل حکم ہوگا۔

نصوص قرآنیہ مذکورہ بالا سے بھی ان قیود کی طرف اشارہ ملتا ہے البتہ جس وقت اضطرار و مجبوری کا تحقق جو گنجائش دینے کی بنیاد ہے ظاہر و ادر نمایاں ہو جائے اس وقت ان قیود کی حاجت نہ ہوگی جیسا کہ ایکسیڈینٹ وغیرہ میں اس تحقق کا ظہور نمایاں ہوتا ہے۔ یا مثلاً کسی تندرست و قوی عورت کو دم استحاضہ میں خون اتنا نکل جائے کہ جان بہ لب ہو جائے۔ یا تندرست و قوی آدمی کو نکسیر ٹوٹ کر اتنا خون نکل جائے کہ جان بہ لب ہو جائے ظاہر ہے کہ یہ حالت خون کی کمی ہی کی وجہ سے ہے، اور اس کا بدل کوئی اور چیز ہو ہی نہیں سکتی، اگر خون نہ چڑھایا جائے تو موت اغلبی درجہ میں یقینی ہے،

لہٰذا ایسی حالت میں اضطرار و مجبوری کے تحقق میں کیا شبہ ہوگا، اور خون چڑھانے کے جواز میں اس حالت میں کیا کلام ہوگا۔

فقہائے متاخرین سے جو چھوٹ بعض صورتوں میں منقول ہے وہ اسی قسم کے مواقع کی ہے نہ کہ کلیہ قاعدہ اور عام ضابطہ کہ اشکال و الجھن کا سبب ہو۔ اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی جو عبارت جناب نے پیش فرمائی ہے وہ تو تداوی بغیر الطبیب کا مسئلہ ہے۔ وہ تداوی بالمحرم کا مسئلہ نہیں ہے، یہ دونوں دو مسئلے ہیں، اس سے نہ معلوم جناب نے استشہاد کس بنا پر فرمایا ہے۔

غرض خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب تک اس اضطرار و مجبوری کے تحقق کا ظہور نمایاں نہ ہو جیسا کہ عام حالات میں ہوتا ہے اس وقت تک بغیر باشرع طبیب حاذق کی تشخیص و مشورہ کے ممنوعات شرعیہ کو استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس کا استعمال کرنا جائز نہ ہوگا۔ ہاں اگر کوئی خطہ یا ملک ایسا ہو جہاں ایسا طبیب میسر ہی نہ آتے ہوں تو وہاں بوجہ مجبوری مطلق طبیب حاذق کی جو مسلمانوں کے مذہب کا احترام اور اس کی رعایت کرتا ہو۔ اور تجربہ اس پر شاہد ہو اور معتمد و معتبر ہو خواہ غیر مسلم ہی ہو، اس کی تشخیص پر بھی استعمال کی گنجائش ہو جائے گی۔

اس سلسلہ میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا اخیر رسالہ "انسانی اعضاء کی پیوند کاری"، بھی دیکھنے کے لائق ہے، بڑی سیر حاصل و بے نظیر بحثیں کی ہیں۔

(۲) جناب نے ہر مضرت و حرج کے خوف کو اضطرار قرار دیا ہے اور استدلال میں فقہ کی تین عبارتیں پیش کی ہیں۔ (۱) منیہ کی عبارت (ان المریض اذا خاف) حالانکہ اسی عبارت سے متصل یہ عبارت موجود ہے۔

ویعرف ذٰلک اما بغلبۃ الظن عن امارۃ او تجربۃ او باخبار طبیب حاذق مسلم غیر ظاہر الفسق وقیل عدالتہ شرط (کبیری ص۶۳) اور اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مضرت وحرج کا خوف اضطرار نہیں ہے بلکہ خوف سے وہ خوف مراد ہے جو ان مذکورہ شرائط کے ساتھ متحقق ہو۔

(۲) کبیری ص۶۶ کی عبارت۔ الجنب الصحیح فی المصر اذا خاف بغلبۃ ظن عن التجربۃ الصحیحۃ ان اغتسل ان یقتلہ البرد او لمرضہ اس عبارت میں خود بغلبۃ الظن اور تجربہ صحیحہ کی قید موجود ہے، یہ بھی ہر مضرت وحرج کے خوف کے معتبر ہونے کی نفی کرتا ہے۔

(۳) امداد الفتاویٰ ص۱۹۸ کی عبارت، اس عبارت میں تو حکومت وقت کے جبریہ حکم کے بارے میں کہا گیا ہے، جس کا تعلق مسئلہ الاکراہ سے ہے نہ کہ ہر خوف سے۔ لہٰذا یہ عبارت ہر مضرت وحرج کے اضطرار ہونے پر دلالت نہیں کرتی اصل وجہ یہ ہے کہ جناب کو اضطرار و اکراہ و ضرورت و حرج وغیرہ کے مفاہیم شرعیہ میں خلط ہو گیا۔ حالانکہ یہ ہر ایک ایک الگ الگ مفاہیم رکھتے ہیں اور ہر ایک کے الگ الگ حدود و احکام ہیں۔ احقر ہر ایک کے مفاہیم شرعیہ اور اس کے حدود و احکام کو اجمالاً عرض کرتا ہے۔ اس سے امید ہے کہ یہ خلط مرتفع ہو کر بصیرت سے رائے قائم ہو سکے گی۔

اللہ تبارک تعالیٰ نے محرمات منصوصہ بہ نص قطعی میں گنجائش کے لئے ایک ضابطہ بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے وقد فصل لکم ما حرم علیکم الا ما اضطررتم الیہ ٥ وان کثیرا لیضلون باھوائھم بغیر علم ان ربک ھو اعلم بالمعتدین ٥ پ۔۱۶ -

اس ضابطہ میں محض اضطرار کو مستثنیٰ فرمایا ہے پھر ساتھ ہی تنبیہ بھی فرمادی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اضطرار کے مستثنیٰ ہونے کی کچھ قیود و شرائط بھی ہیں۔ اگر ان کا لحاظ نہ کیا گیا تو گمراہی میں مبتلا ہو جائے گا۔ پھر ان قیود کو دوسری آیت کریمہ میں واضح فرمایا ہے۔ منجملہ ان کے سوال ۲ کے جواب میں درج شدہ دو آیت بھی ہے، ان میں سے ایک کے اندر غیر متجانف لاثم (ای غیر متجاوز عن الحدود الشرعیہ) کی قید ہے۔ اور دوسری آیت کریمہ غیر باغ ولا عاد (ای غیر قاصد للخروج عن الحدود الشرعیہ ولا م للخروج عن الحدود الشرعیہ) کی قید ہے۔

پھر اس ضابطہ کی تفصیل و تشریح کتب احادیث، فقہ و اصول فقہ میں ہے جس کے تحت استثناء کی مندرذیل صورتیں نکلتی ہیں۔

(۱) مخمصہ۔ بھوک، پیاس کی پریشانی سے جان بلب ہو جائے جان بچانے کی کوئی صورت بظاہر نہ رہے۔ اسی کو فمن اضطر فی مخمصہ غیر متجانف لاثم میں فرمایا گیا۔ یہ اضطرار کی انتہائی شدید صورت ہے

(۲) جان کے یا کسی عضو کے تلف ہونے کا یا ناقابل تحمل جسمانی تکلیف (مثلاً بصورت زدوکوب) یا حبس مدید (طویل قید) کا یا شدید مالی نقصان کا جو ناقابل تلافی ہو، ایسا خطرہ ہو جائے کہ اسباب کے تحت اس سے بچنے کی کوئی تدبیر نظر نہ آئے۔

اگر یہ صورت کسی دشمن یا ظالم کے جبر و اکراہ کرنے سے ہو تو اس کو اکراہ ملجیٔ اور جبر تام کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں حدیث شریف میں ہے۔

ان اللہ تجاوز من امتی الخطاء والنسیان وما استکرھوا علیہ (مشکوٰۃ ص۲۸۴) وفی شرحہ ای ماطلب منھم من المعاصی

علی وجہ الاکراہ۔ اور اسی کے بارے میں فقہ میں ہے۔ وان اکرہ بقتل ملجئ او قطع عضو او ضرب حل الفعل (در المختار) اسی طرح کی اور بھی تفصیلات فقہ کی کتاب الاکراہ میں مذکور ہیں بسبب خوف طوالت ذکر نہیں کرتا، جناب خود مراجعت فرمالیں۔

(۳) یہی صورتیں اگر کسی مکرہ یا جابر کے جبر و اکراہ کرنے کے بغیر خود بخود ایسے حالات پیدا ہو جائیں۔ اور اس کے زائل کرنے اور مرتفع کرنے کے اسباب اختیار میں نہ رہیں تو اس کو ضرورت کہتے ہیں، اور اسی کے بارے میں فقہائے کرام الضرورات تبیح المحظورات فرماتے ہیں۔

(۴) جان کے یا کسی عضو کے تلف ہونے کا خطرہ تو نہ ہو لیکن ناقابل تحمل جسمانی تکلیف یا ناقابل تلافی مالی نقصان کا ایسا خطرہ جس کا ازالہ اسباب کے تحت قدرت میں نہ ہو۔

یہ صورت اگر کسی ظالم و جابر یا دشمن کے جبر و اکراہ سے پیدا ہو گئی ہو تو اس کو اکراہ غیر ملجئ کہتے ہیں، ایسے ہی مواقع کے لئے فقہائے نے "الضرر یزال" فرماتے ہیں۔

(۵) اگر یہی چار نمبر کی صورتیں خود بخود اپنے حالات کے تحت پیش آجائیں، تو اس کو حاجت یا احتیاج کہتے ہیں اور ایسے مواقع کے بارے میں فقہاء کرام ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح فرماتے ہیں

یہ پانچوں صورتیں درجہ بدرجہ اضطرار کی ہیں، ان میں مخمصہ و اکراہ کی صورتوں کے علاوہ اور صورتوں میں حکم شرعی یہ ہے کہ وہ صورت زندگی کے جس شعبہ و نوع سے متعلق ہو، مثلاً معاشیات، اقتصادیات، معاشرہ، تمدن، صحت

مرض، معالجہ وغیرہ غرض جس شعبہ و نوع سے تعلق ہو، جب تک اس شعبہ کا ماہر وحاذق واقف کار مسلمان جو بادیانت و باشرع بھی ہو، یہ حکم نہ لگادے کہ واقعی اضطرار متحقق ہوگیا ہے یا مبتلا، بہ کا بار بار کا خود تجربہ صحیحہ اس پر شاہد نہ بن جائے، اس وقت تک اس میں محرمات منصوصہ کے خلاف کرنے یا اس کے استعمال کرنے کی شرعاً گنجائش نہ ہوگی، اور ہر شخص کی رائے کا اعتبار نہ ہوگا۔ ہاں اگر اضطرار و مجبوری کا تحقق ظاہر و نمایاں ہوجائے تو اس خاص صورت میں بغیر ان شرائط و قیود کے بھی وسعت و گنجائش ہو جائے گی۔

لقولہ تعالیٰ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔ ولقولہ تعالیٰ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ۔ وغیرھما۔

ان اضطرار خمسہ کے علاوہ کچھ اور بھی توسعات و گنجائشیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے عنایت فرمائی ہیں، ان کی بنا بھی آیات ربانی ہی پر ہیں، مثلاً یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ اور قولہ تعالیٰ وما جعل علیکم فی الدین من حرج۔ اور قولہ تعالیٰ ومایرید اللہ لیجعل علیکم من حرج۔ وغیرھا من الآیات۔

ان آیات کریمہ سے بھی چند ضابطے نکلتے ہیں جو کتب احادیث وفقہ میں مذکور ہے۔

(۱) جان کے یا عضو کے تلف ہونے کا اندیشہ تو نہ ہو، بلکہ صرف جسمانی یا مالی ناقابل تحمل یا ناقابل تلافی نقصان کا شدید خطرہ ہو، لیکن اس کا دفعیہ وازالہ بھی اسباب کے تحت وقدرت واختیار میں ہو۔ اس کو مشقت کہتے ہیں، اور فقہاء کرام اسی کے بارے میں المشقۃ تجلب التیسیر فرماتے ہیں۔

(۲) ان ہی صورتوں میں ناقابل تحمل و ناقابل تلافی نقصان کا شدید خطرہ تو نہ ہو، مگر اس کا تحمل یا تلافی کرنا بیحد دشوار ہو جس سے بیحد تنگی رہتی ہو، معاش و معاشرہ دشوار و تنگ تر بنا ہوا ہو تو اس کو حرج کہتے ہیں، اس کے بارے میں فقہاء کرام الحرج مدفوع فرماتے ہیں۔

ان دونوں (مشقت، حرج) میں محرمات منصوصہ کی مخالفت یا ترک کی گنجائش نہ ہوگی، مشقہ و حرج کے ازالہ کا دائرہ اثر وہیں تک ہوتا ہے جہاں تک کوئی نص خلاف میں موجود نہ ہو، چنانچہ الاشباہ والنظائر ص ۱۰۶ مع الحموی میں تصریح ہے۔ فرماتے ہیں۔ المشقة والحرج انما يعتبر فی موضع لا نص فيه واما مع النص بخلافه فلا۔

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ نص عُسر سے نص یسر کی طرف منتقل ہو جائیں جیسے نص غسل و وضوء سے نص تیمم کی طرف منتقل ہونا۔ اور جیسے اتمام صلوٰۃ کی نص سے قصر صلوٰۃ کی نص کی طرف منتقل ہونا۔

اسی طرح اگر کوئی دوسرا نص جو متقاضی یسر و وسعت کا ہو نہ ملے مگر مشقت یا حرج کا باعث ایسا حکم ہو جس کی بناء محض کسی مجتہد کا قیاس و استنباط ہو تو اس میں بھی حدود شرع میں رہتے ہوئے یسر و وسعت کی جانب منتقل ہونے کی گنجائش ہوتی ہے۔ لیکن انتقال کی ان دونوں صورتوں میں جواز انتقال من العسر الی الیسر یا انتقال من الضیق الی الوسعة میں شرائط و قیود وہی ہوں گی جو پہلے گذر چکے ہیں۔ یعنی اپنا بار بار کا تجربہ صحیحہ شاہد ہو یا اس شعبہ کا ماہر و حاذق باشرع بادیانت مسلمان کی تشخیص حاکم ہو، خود رائی یا ہر کس کی رائے معتبر نہ ہوگی۔

خون کے علاوہ کسی اور عضو کے پیوند کاری میں یا ایک انسان کے

کسی عضو، کو دوسرے انسان کی عضو، کے ساتھ جوڑنے میں یا استعمال کرنے میں ان ساتوں صورتوں میں سے کوئی صورت عموماً متحقق نہیں ہوتی، اگر کچھ تحقق ہوتا ہے تو صرف عدم النفع کا یا عدم استراحت کا یا بیش از بیش کلفت کا جو حسب منشار راحت و آرام نہ پہنچنے سے پیش آجاتی ہے، اور ان سب صورتوں میں محرمات شرعیہ کے ارتکاب کی گنجائش نہیں ہوتی۔

لہٰذا اس پیوند کاری یا ایک شخص کے کسی عضو، کو دوسرے شخص کے کسی عضو، میں جوڑنے یا استعمال کرنے کی قطعاً گنجائش نہ ہوگی۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ | اس تقسیم و انقسام کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان ساتوں الفاظ (مخمصہ، اکراہ ملجی، اکراہ غیر ملجی، ضرورت و احتیاج، مشقت، حرج) میں سے کسی ایک کا اطلاق دوسرے پر نہ ہو، حالانکہ ہم ہر ایک لفظ کا اطلاق دوسرے لفظ پر عموماً دیکھتے ہیں، جو اس تقسیم و انقسام کے منافی ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ اطلاق عام بول چال کا ہے، یا بہت سے بہت مجازی ہے جو تنقیح مسائل و تنقید احکام و تحدید احکام میں قطعاً معتبر نہ ہوگا۔ ان مواقع میں فقہی اصطلاح و فروق کا اور ان کی حدود و احکام کا لحاظ ضروری ہوگا۔ ورنہ خبط عشوا ہوگا، اور دین حنیف ایک کھلونا بن کر رہ جائیگا۔

اس سمع خراشی کی معافی کی درخواست کرتے ہوئے امید ہے کہ ان گذارشات پر نظر ضرور رکھی جائے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین عفرلہ

دار العلوم دیو بند

۹۷/۱/۲۷ ھ

تقدیر کیا ہے؟

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ انسان اپنی پیدائش سے لیکر موت کے واقع ہونے تک جو بھی اچھے اور برے اعمال کرتا ہے۔ کیا وہ سب اس کی تقدیر میں پہلے سے لکھے ہوتے ہیں؟۔

اگر پہلے سے ہی تقدیر میں نیکیوں اور گناہوں کی تعداد مقررہ اوقات میں متعین کردی جائے اور پھر یہ کہا جائے کہ تقدیر کا لکھا اٹل ہے اگر تقدیر میں پہلے سے ہی گناہ لکھا ہو تو پھر اس پر سزا یا عذاب کیا معنیٰ رکھتے ہیں؟ جب کہ اس کی تقدیر میں لکھے ہوئے گناہ کا ہی مرتکب ہوا، انسان کی تقدیر میں پہلے سے کیا کیا لکھا ہوتا ہے؟

اگر اچھے اور برے تمام اعمال پہلے سے ہی تقدیر میں لکھے ہوئے ہوں تو کس بنیاد پر قبل از وقت تقدیر مرتب ہوئی ہے براہ کرام تفصیل کے ساتھ صراحت فرمائیں، کیونکہ یہاں پر بہت سے اصحاب اس تعلق سے شدید الجھن میں ہیں۔

راقم۔ عبد المقتدر، ابوظبی متحدہ عرب امارات

جواب:۔ جزا اور سزا کے ترتب کا مدار اختیار وشعور وعقل پر ہے اگر کسی کو عقل وشعور نہ ہو مثلاً پاگل ہو تو وہ کوئی بھی کام کرے اس پر کوئی مواخذہ نہیں لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام جف القلم عن الثلاثۃ النائم والصبی والمجنون اوکما قال ؑ۔ اسی طرح اگر عقل وشعور تو ہو مگر فعل کا صادر ہونا اختیار میں نہ ہو۔ تو اس میں بھی کوئی مواخذہ نہیں جیسے کوئی شخص ہے اور آنکھیں کھولے بیٹھا ہے یا کہیں جا رہا ہے۔ اور کوئی نامحرم عورت سامنے آگئی یا اس پر نگاہ پڑگئی تو اس پر مواخذہ نہیں کیونکہ آنکھ کھلی رہے اور نظر نہ آئے یہ بندہ کے اختیار میں نہیں۔ کما قال علیہ السلام لعلی رضؓ یا علی لا تتبع النظرۃ النظرۃ فان لک الاولی ولیس لک الاٰخرۃ رواہ احمد والترمذی وابوداؤد والدارمی (مشکوٰۃ ص ۲۶۹)۔ البتہ فوراً نگاہ ہٹا لینا ضروری ہے اور دوبارہ اس پر نگاہ

نہ ڈالنا ضروری ہے - کما دلّ علیہ ایضاً ھذا الحدیث اس لئے اگر فوراً نگاہ نہ ہٹایا یا جمائے رکھا یا ہٹا کر دوبارہ پھر دیکھا تو چونکہ جمائے نہ رکھنا اور پھر دوبارہ نہ دیکھنا اختیار میں تھا اس لئے اس پر مواخذہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب کوئی انسان اپنی عقل و شعور باقی رہتے ہوئے اپنے قدرت و اختیار سے کوئی بُرا کام کریگا تو اس کو اس پر عذاب ہوگا - اور سزا کا مستحق ہوگا اور اگر کوئی اچھا کام کرے گا - تو اس کو اس پر انعام ملے گا - اور جزا کا مستحق ہوگا - اور یہ سب کیوں ہے ؟ اس لئے کہ اللہ نے جب بندہ کو عقل و ہوش و دانش سے نوازا اور قدرت و اختیار بھی عطا فرمایا اور سب اچھے کام اور بُرے کام بواسطۂ انبیاء علیہم السلام تبلا کر قوت ممیزہ (تمیز) بھی دیدیا اور تمام کاموں کا نفع و نقصان بھی اور تمام نتائج بھی بتلا دیا اور اچھے کاموں کے انعامات کا بھی واضح طور پر یقین دلادیا - اب اس کے بعد بھی اگر کوئی احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ انعامات خداوندی کی ناقدری کرتا ہے اور یہ احکام خداوندی کی تکذیب اور اس سے بغاوت کے مترادف ہوگا - اس لئے سزا کا مستحق ہوگا - جیسا کہ ارشاد ہے - اِنَّھُمْ کَانُوْا لَا یَرْجُوْنَ حِسَابًا ہ وکذبوا بآیاتنا کذّابا ہ وکل شیٍٔ اَحْصَیْنٰہُ کِتٰبًا ہ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِیْدَکُمْ اِلَّا عَذَابًا پ۳۰ ع) (ترجمہ) بیشک یہ لوگ حساب (قیامت) کا اندیشہ ہی نہ رکھتے تھے اور ہماری آیتوں کو خوب جھٹلاتے تھے (اور ہم نے ان کے (اعمال میں سے) ہر چیز کو (ان کے اعمالنامے میں) لکھ کر ضبط کر رکھا ہے - سو اب اسکا مزہ چکھو کہ ہم اب تمہارا عذاب ہی بڑھاتے رہیں گے۔

اور اسی طرح اگر عقل و شعور سے اور اپنے اختیار سے کام لیکر اچھے کام کریگا - اور دوسرے کام سے اپنے کو روکے گا - تو اگرچہ اپنی عقل و شعور اور اختیار کے اعتبار سے خود اپنا فرض ادا کرنے والا ہوگا - مگر ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ

نے اس کو اپنا منقاد اور اپنے انعامات واحسانات کی قدردانی کرنے والا شمار فرماکر اپنے فضل وکرم سے اس پر اپنا انعام مقرر فرمادیا اوراس کو جزا کا لقب دیکر مستحق ثواب وجزاء قرار دیدیا جیساکہ فرمایا گیا کہ

لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید

اگر تم لوگ شکرادا کرتے رہو گے تو میں تمہارے لئے انعامات میں زیادتی ہی کرتا رہونگا۔ اور اگر ناشکری کروگے تو دیکھ لو، بلاشبہ میرا عذاب بہت ہی سخت ہے

پ اور فرمایا گیا ان للمتقین مفازاً حدائق واعناباً وکواعب اترابا ہ وکاساً دھاقاً ہ لایسمعون فیھا لغواً ولاکذاباً ہ جزاءً من ربک عطاءً حسابا ہ رب السمٰوٰت والارض وما بینھما الرحمٰن لایملکون منہ خطاباً ج،

بلاشک ڈروالوں کو مراد ملنی ہے باغ ہیں اور انگور اور نوجوان عورتیں ایک عمر کی سب اور پیالہ چھلکتا۔ نہ سنیں گے وہاں بکنا اور نہ مکرانا بدلا ہے تیرے رب کا دیا حساب سے جو رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان کے بیچ ہے بڑی مہر والا قدرت نہیں کہ کوئی اس سے بات کرے۔

اور یہ سوال کہ انسان اپنے پیدا ہونے سے لیکر موت تک جو اچھے برے کام کرتا ہے تو کیا وہ سب اس کی تقدیر میں پہلے سے ہی تفصیل کے ساتھ لکھا ہوتا ہے ؟ تو جی ہاں یہ صحیح ہے وہ سب کام پہلے ہی سے لکھے ہوتے ہیں رہا یہ اشکال (کہ اگر تقدیر میں پہلے ہی سے گناہ لکھا ہو الخ) تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق ربط حادث بالقدیم کے مسئلہ سے ہے یعنی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سوا، جتنی چیزیں ہیں خواہ آسمان سے اوپر کی ہوں یا آسمان کے اندر کی ہو یا آسمان سے نیچے کی اور عالم سفلیات کی ہوں جیسے جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان وجنات سب کا ایک خاص

رابطہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات سے ہے اور ان سب چیزوں کے پیدا ہونے سے بہت قبل ازل سے ہی یہ تمام رابطے اور ان کی تمام کیفیات و تفاصیل سب کی سب ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کے علم میں موجود ہیں جیساکہ ارشاد ہے

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۞ الآیۃ پ

(ترجمہ) وہی (ذات باری تعالیٰ) اوّل بھی ہے وہی آخر بھی ہے وہی ظاہر بھی ہے وہی باطن بھی ہے وہی ہر چیز کا علم بھی رکھتا ہے

بلکہ ہر جزئی سے جزئی چیز کی تمام مقدار ایک خاص ترتیب کے ساتھ پورے عالم کے تکوین وانتظام واستحکام کی حکمت کے تقاضے کے مطابق ازل ہی سے لکھی ہوئی محفوظ وموجود ہیں جن میں ذرہ برابر بھی کوئی فرق کبھی نہیں آسکتا

کما قال تعالیٰ، ان اللہ خالق کل شئ ۞ الآیۃ پ

ترجمہ :- بیشک اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کے خالق ہیں۔

اور ارشاد ہے :- انّ اللہ بالغ امرہ جعل اللہ لکل شیءٍ قدرًا

الآیۃ ترجمہ) :- بیشک اللہ تعالیٰ اپنے ہر کام کو اسکے کمال تک پہونچانے والے ہیں۔ بیشک اللہ رب العزت ہر چیز کے لئے اندازہ مقرر کر رکھا ہے

اور ارشاد ہے لا الشمس ینبغی لہا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النہار ، وکل فی فلک یسبحون ۞ الآیۃ پ۲۳

ترجمہ) آفتاب کو اختیار نہیں ہے کہ وہ ماہتاب کو پاجائے۔ اور نہ رات دن پر سبقت کرسکتی ہے۔ بلکہ ہر ایک اپنے اپنے محور پر تیرتے رہتے ہیں۔

اور ارشاد ہے موج البحرین یلتقیان بینہما برزخ لایبغیان بینہما برزخ لایبغیان ۞ فبای الاء ربکما تکذبان ۞ الآیۃ پ

اس قسم کی بے شمار آیات ونصوص ہیں جو قاطع دلیل ہیں کہ اللہ جل جلالہٗ نے یہ تمام چیزیں اپنی خاص حکمت وقدرت کے تحت پیدا فرمائی ہیں اور ازل ہی سے مکتوب بھی فرمالیا ہے اور وہ سب اٹل ہے اور اس کے

خلاف ذرہ برابر بھی کبھی نہیں ہوسکتا اور یہ سب اللہ کے علم وقدرت کے تحت ہے اور اگر ایسا نہ مانا جائے تو نعوذ باللہ من ذلك، ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات کو علم سے عاری، قدرت وحکمت سے خالی اور عاجز وغیرہ وغیرہ ماننا پڑے گا وتعالیٰ اللہ عن ذلك علوًّا کبیرًا اللہ تعالیٰ کی ذات ان باتوں سے بہت زیادہ بلند وبالا ہے۔

اور اسی مسئلہ کو مسئلہ تقدیر کہتے ہیں۔ اور چونکہ علم وعقل انسانی کسی ایک مخلوق کے اس رابطہ کی حقیقت اور اس کی کیفیات وحالات کو بھی سمجھنے سے قاصر وعاجز ہے۔ کیونکہ انسان کی عقل ودانش اور علم ادھورا و نامکمل ہے ہر طرف سے جہل وعجز سے اور عدم علم سے گھرا ہوا ہے بڑے بڑے عقلاء وحکما بھی عاجز درماندہ ہیں مثلاً عقلاء کی وہ جماعت جو آسمان کے وجود کی قائل نہیں ہے۔ وہ بھی نہ بتا سکی کہ یہ فضا کہاں تک ہے اور اس میں کیا کیا چیزیں ہیں۔ بلکہ محض اس زمین سے اوپر کی اس خالی فضا میں کیا کیا چیزیں ہیں اور کس انداز وڈھنگ کی ہیں ان سب کو بھی ابھی تک عقل انسانی نہ معلوم کرسکی یہ تو بڑی بات ہے زمین پر جتنی چیزیں ہیں ان کا احاطہ بھی عقل انسانی ابھی تک نہیں کرسکی آئے دن برابر نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں۔ اور نئی نئی چیزوں کا علم حاصل ہوتا رہتا ہے۔ کرۂ زمین مع کرۂ ماء محدود ہے اور اس کے ارد گرد انسان بارہا چکر لگا چکا ہے مگر اب تک معلوم نہ کرسکا کہ زمین کے اندر اس کی تہوں میں کیا کیا چیزیں مخفی ہیں یا سمندروں کی گہرائی کتنی ہے اور اس میں کیا کیا چیزیں پوشیدہ ہیں، حالانکہ ان چیزوں کا مشاہدہ وانکشاف اپنی قدرت واختیار میں سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ ان کی شب وروز کی مساعی سے اندازہ ہوتا ہے تو پھر جن چیزوں کا انکشاف ومشاہدہ حواس خمسہ ظاہرہ وحواس خمسہ باطنہ میں سے کسی کے ذریعہ نہ ہوسکتا ہو اور اس کا انکشاف ومشاہدہ اپنی قدرت واختیار میں نہ ہو اس کو یہ ہماری عقل انسانی محض اپنے عقل ودانش

سے کیسے معلوم کر سکتی ہے۔

اسی دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جن کے اثرات ہم دن رات دیکھتے ہیں۔ اور اس کے وجود کا یقین رکھتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقت معلوم کرنے سے ہماری عقل عاجز درماندہ ہے۔ مثلاً یہی روح ہے جو ہر جاندار کے جسم کے اندر ہوتی ہے اور اس کے اثرات (چلنا پھرنا کھانا پینا وغیرہ وغیرہ سب) ہم دیکھتے اور سمجھتے ہیں اور جب وہ روح جسم سے الگ ہو جاتی ہے تو وہی جسم خاک کا ایک ڈھیر بلکہ اس سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

بڑے بڑے فلاسفہ وعقلا نے روح کی حقیقت معلوم کرنا چاہا مگر متضاد کلام بول کر اپنے عجز ودرماندگی کا اظہار کر کے چلے گئے نہ ان کے تجربات نے ہمنوائی کی اور نہ اُن کے حدسیات ووجدانیات ہی نے رہنمائی کی۔ کلامِ الٰہی بھی اسکی طرف اشارہ کرتا ہے۔

یسئلونک عن الروح قل الروح من امرِ ربّی وما اوتیتم من العلم الّا قلیلاً ۵ الآیۃ پ، یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کا حکم ہے (تم لوگ اسکی حقیقت نہیں سمجھ سکتے اس لئے کہ) تم لوگ علم کا بہت تھوڑا حصہ دیئے گئے ہو۔

اسی طرح کیفیات نفسانیہ ہیں کہ ان کو بھی محض ان کے اثر وعلامات کے ذریعہ جانتے ہیں اور ان کے موجود ہونے کا یقین رکھتے ہیں مگر اس کی حقیقت کا مشاہدہ نہ کر سکتے ہیں نہ کرا سکتے ہیں بلکہ بہت سی کیفیات نفسانیہ ایسی ہیں کہ جب تک انسان اس سے خود متصف نہ ہو جائے اس وقت تک اس کی حقیقت کو نہ وہ خود سمجھ سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا اس کو وہ حقیقت سمجھا سکتا ہے بلکہ خبر دینے والے اور بتلانے والے پر ہی اعتماد کر کے ماننا اور یقین کرنا پڑتا ہے اور یہ طریقہ رائج بلکہ شائع وذائع ہے۔ اوسکا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

جیسے نابالغ لڑکا اگرچہ ذی شعور ہوچکا ہے مگر وہ بلوغت کی حقیقت ولذت کو نہیں سمجھتا اگر کوئی دوسرا سمجھانا اور بتلانا بھی چاہے تو بلوغت کی حقیقت ولذت نہیں سمجھا سکتا۔ بلکہ محض استاذ کے بتلانے اور مخبر کے خبر دینے پر قناعت کرتا ہے اور یقین کر لیتا ہے اور اس کے مسائل کو معلوم کر لیتا ہے۔ اور جب بالغ ہوجاتا ہے۔ تو خود بلوغت کی حقیقت ولذت وغیرہ سب کا مشاہدہ ہی نہیں بلکہ حق الیقین کے درجہ میں یقین کر لیتا ہے۔

اور جیسے عنین آدمی جو جماع پر قادر نہ ہو۔ اس کو جماع کی لذّت وکیفیت جو اس کو معلوم نہیں اگر کوئی اس کو جماع کی لذّت وکیفیت سمجھانا چاہے تو سمجھا نہیں سکتا۔ حالانکہ جماع کی لذّت وکیفیت کا وجود یقینی ہے اور اس عنین کی عقل ودانش بھی کامل ومکمل ہے بلکہ وہ علامۂ دوراں بھی ہو سکتا ہے مگر اس کے معلوم کرنے اور سمجھنے سے عاجز وقاصر ہے اور محض لوگوں کے بتانے پر تسلیم کرتا اور یقین کرتا ہے۔ جب عقل انسانی کا اس دنیائے دنی کی چیزوں میں یہ حال ہے تو پھر آخرت کے معاملہ میں اور آخرت کی چیزوں میں جو اس عقل سے وراء الوراء ہے محض اپنی اس عقل وعلم کے ذریعہ کیسے معلوم کر سکتا ہے۔ اور محض اپنی اس عقل وعلم سے سمجھ لینے پر تسلیم کرنے کا مدار رکھنا کہاں تک قرین شعور ودانش ہے۔ اس کی مثال تو اس نابالغ بچے اور عنین شخص جیسی ہوگی جو نابالغ وعنین ہونے کے باوجود بلوغت ولذت جماع کی حقیقت معلوم کرنے کا خواہشمند ہو غرض علم وعقل انسانی کا اس تمام کائنات اور مخلوقات کے اس رابطۂ حادث بالقدیم کی حقیقت وکیفیت کو سمجھانا تو در کنار وہ تو اس کی ایک مخلوق کے بھی اس رابطہ کی حقیقت وکیفیت کو معلوم کرنے اور سمجھنے سے قاصر وعاجز ہے اور اس کے لئے نابالغ وعنین کی طرح بجز اس کے چارہ نہیں کہ وہ مخبر صادق جناب محمدؐ

کی خبروں پر اور وحی الٰہی کی خبروں پر اعتماد کر کے صحیح تسلیم کرلے اور ہلاکت سے اپنے کو بچالے اور صرف یہی ایک ذریعہ اس کو اپنے کو ہلاکت سے بچانے اور نجات دلانے کا ہے ورنہ اس کی مثال بالکل اس شخص جیسی ہو گی جو جہاز میں سوار ہو کر کہیں جارہا ہو اور جہاز بھنور میں پڑ گیا ہو۔ اور جہاز راں کہہ رہا ہو کہ جلدی اپنے گلے میں یہ ہوا کا حلقہ ڈال لو، کمر میں یہ ہوا کی پٹی باندھ لو، اور سینہ سے یہ ہوا کی یہ مشک لگالو اور بوقت ضرورت اس سے کام لو، ورنہ ڈوب کر ہلاک ہو جاؤ گے۔ اور وہ شخص جہاز راں کی ان ہدایتوں کو نہ مانے اور یہ کہے کہ ہم تو جب تمہاری بات تسلیم کریں گے اور مانیں گے جب ہم ہمیں جہاز کو بھنور میں غوطہ کھانے کی سب حقیقت اور کیفیت دکھلا دو یا تبلا دو یا سمجھا دو اس کے بعد ہی تمہاری بات مانیں گے۔ اور تمہاری ہدایت پر عمل کریں گے۔ ایسے شخص کو کون صحیح الفہم، صاحب الرائے اور صاحبِ عقل و دانش کہے گا۔ بالکل یہی حال و حکم ہو گا۔ اس شخص کا جو ربطِ حادث بالقدیم کی حقیقت اور اس کی تمام کیفیات و تفصیلات کو وحی الٰہی اور مخبر صادق کی خبر کی مدد کے بغیر محض اپنے علم و عقل سے معلوم کرنے کے درپے ہو گا اور مطالبہ کرے گا۔ اور تقدیر کا مسئلہ بھی چونکہ اسی قبیل سے ہے اس لئے اس کے بارے میں بھی یہی حکم و حال ہو گا۔ انہی وجوہ سے رحمتِ عالم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ میں بحث کرنے سے روک دیا ہے۔ (الف) مثلاً فرمایا کہ

یاتی الشیطان الی احدکم فیقول من خلق کذا من خلق کذا حتی یقول من خلق ربك فاذا بلغہ فلیستعذ باللہ ولینتہ (رواہ بخاری، مشکوۃ ص۱۸)	شیطان تم میں سے ایک کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ کس نے یہ پیدا کیا کس نے وہ پیدا کیا پوچھ پڑتا ہے پھر تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا پس جب شیطان اس حد پر پہونچے تو تم اللہ سے پناہ مانگ لیا کرو اور اس کو دفع کر دیا کرو۔

ب قال علیہ السلام لایزال الناس یتساءلون حتی یقال ھٰذا خلق اللہ الخلق فمن خلق اللہ فقولوا اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہٗ کفوا احد . ثم یتفل عن یسارہ ثلٰثا ولیستعذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ (مشکوٰۃ عن سنن ابی داؤد ص۱۹)

(ب) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگ آپس میں سوال وجواب کرتے کرتے یہ پوچھ پڑتے ہیں کہ تمام مخلوق تو اللہ نے پیدا کیا تو پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا پس جب لوگ اس قسم کا سوال کر بیٹھیں تو تم لوگ فوراً یہ کہو کہ اللہ کی ذات تو صمد ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اس ذات نے نہ تو کسی کو جنا اور نہ کسی نے اسکو جنا ہے اور نہ کوئی اس کے مثل و مماثل ہے پھر اپنے بائیں مونڈھے پر تھتکار دے ۔ اور شیطان رجیم سے پناہ مانگے

ان روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر انسان اس مسئلہ میں رد و کد بدیا بحث مباحثہ کریگا ۔ تو عجب نہیں کہ شیطانی نرغہ میں پھنس کر اور مخبوط الحواس ہوکر یہ پوچھنا شروع کردے کہ جب یہ ساری کائنات ومخلوقات اللہ نے پیدا کی ہے تو (نعوذ باللہ) خود اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے ۔ چنانچہ بہت سی احادیث میں اس کو بیان فرمادیا گیا ہے ۔ اور اس میں گفتگو کرنے سے بچنے کی تاکید فرمائی گئی ہے بلکہ ایک موقعہ پر چند صحابہ کو اس مسئلہ پر بحث کرتے دیکھ کر بہت سخت تاکید فرمائی ہے ۔ ترمذی شریف میں حدیث ہے ایک صحابی فرماتے ہیں کہ

خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن نتنازع فی القدر فغضب حتی احمر وجھہٗ حتی کانما فقیٔ فی وجنتیہ

ہم لوگ تقدیر کے مسئلہ میں گفتگو کررہے تھے اچانک حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے (اور ہم لوگوں کی یہ گفتگو دیکھکر) سخت غضبناک ہوگئے یہانتک کہ آپ کا چہرہ مبارک اسطرح سُرخ ہوگیا جیسے آپ کے مبارک رخساروں میں انار نچوڑ دیے گئے

حب الرمان فقال ابھذا امرتم ام بھذا ارسلت الیکم انما هلك من کان قبلکم حین تنازعوا فی ھذا الامر عزمت علیکم عزمت علیکم ان لا تنازعوا فیہ۔ (مشکوۃ صـ۲۲)

ہوں۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم لوگ اسی کا حکم دیئے گئے ہو یا گیا میں تمہارے درمیان اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ تم ان باتوں میں بحث وتمحیص کرو۔ تم سے قبل بہت سے لوگ اس تقدیر کے مسئلہ میں بحث ومباحثہ کرنیکی وجہ سے ہلاک کئے جاچکے ہیں۔ خبردار خبردار میں تم لوگوں پر لازم کرتا ہوں کہ کبھی اسمیں بحث مباحثہ مت کرو

اس حدیث پاک میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تقدیر کو تسلیم کرتے ہوئے اور اس پر ایمان رکھتے ہوئے خموشی سے ان مقاصد کی تکمیل کرنا چاہیئے۔ جس کے لئے آپ مبعوث فرمائے گئے ہیں اور اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ آپ کے تبلائے ہوئے احکام پر عمل محض اللہ کو راضی کرنے کے لئے کیا جائے اور احیائے سنت کیا جائے۔ اگر غور کیا جائے تو اسی طریقۂ کار میں عقلاً بھی سلامت روی اور ہوشمندی ہے۔ ایک موقعہ پر صحابہ کرام نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسی مسئلہ تقدیر کو پیش فرما کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افلا نتکل علی کتابنا وندع العمل (تو پھر کیا ہم اپنی تقدیر پر بھروسہ کرکے عمل کرنا ترک کردیں) تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

اعملوا فکل میسر لما خلق اما من کان من اهل السعادۃ فییسر لعمل السعادۃ واما من کان من اهل الشقاوۃ فییسر لعمل الشقاوۃ ثم قرأ واما من

عمل کرو۔ ہر شخص کیلئے وہی عمل آسان کیا جاتا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ پس جو شخص اہل سعادہ سے ہوتا ہے اسکے لئے سعادہ کے کام آسان ہوتے ہیں اور جو شخص اہل شقاوہ میں سے ہوتا ہے ان کے لئے شقاوت کے کام آسان ہوتے

اعطی واتقی وصدق بالحسنیٰ فنیسرہ للیسریٰ (مشکوٰۃ عن البخاری ومسلم) وبقیۃ الاٰیۃ ھذہ واما من بخل واستغنیٰ وکذب بالحسنیٰ فسنیسرہ للعسریٰ وما یغنی عنہ مالہ اذا تردیٰ (پ ۳۰)

ہوتے ہیں پھر آپ نے یہ آیت کریمہ (واما من اعطی واتقی وصدق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ) تلاوت فرمائی (پوری آیت کریمہ کا ترجمہ یہ ہے) بہر حال جو شخص صدقہ وزکوٰۃ نکالتا رہتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے اور ایمان کی باتوں کی تصدیق کرتا ہے اسکو ہم نیک کام اور فراغت کیلئے آسان کر دیتے ہیں۔ اور پھر اسکا مال اسکو ہلاک ہونے سے نہیں بچا پاتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے تقدیر میں لکھے ہوئے پر بھروسہ کر کے عمل چھوڑ بیٹھنے کی درخواست کی تھی تو آپ نے عمل چھوڑ بیٹھنے سے منع فرماتے ہوئے یہ فرمایا کہ عمل کرتے رہو اور ہمیشہ نیک عمل کی کوشش کرتے رہو یہ سب اعمال (نیک وبد انسان کے انجام پر اور ما بعد الموت کے حالات پر قرینہ بنتے ہیں جو نیک بخت ہوتا ہے۔ اس کے لئے دنیا میں نیک اعمال آسان کر دیئے جاتے ہیں اور جو بدبخت ہوتا ہے اس کے لئے اعمال بد آسان کر دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر اعمال خیر صادر ہوں تو شکر کرو اور مزید عمل نیک کی توفیق مانگو اور اس کے لئے سعی کرو اور اس میں رضاء باری حاصل ہونیکی دعا کرو اور رضاء باری حاصل کرنے کی توفیق مانگو۔

پوری انسانی زندگی کا اصلی سرمایہ حیات رضاء باری تعالیٰ کا حاصل ہو جانا ہے۔ کما اشار الیہ قولہ تعالیٰ

وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزیٰ الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ و

نیکو کے نزدیک اس سے بڑی کوئی اور نعمت نہیں ہے کہ ان کو ان کے نیک اعمال کے بدلے میں

لسوف یرضیٰ ۵ پ۳۰ دیدارِ خداوندی نصیب ہو اور باری تعالیٰ جلد انکو اس نعمت سے خوش کردیگا

اور اس سرمایہ حیات (رضا باری) کا حصول اعمال نیک کے پردہ میں ہوتا ہے جو تقویٰ اور اخلاص کے ساتھ حکم شرعی کے مطابق ہو جیساکہ فرمایا گیا۔

ومآ امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء الآیۃ — لوگ حکم نہیں دئے گئے ہیں مگر اس بات کا کہ کامل اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرو اور دین کو خالص اللہ کے لئے بناؤ) اور حنیف بنے رہو۔

اور فرمایا گیا۔ فاما من اعطیٰ واتقیٰ وصدق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ واما من بخل واستغنیٰ وکذب بالحسنیٰ فسنیسرہ للعسریٰ وما یغنی عنہ مالہ اذا تردیٰ ۵ پ۳۰ — سو جس نے دیا اور ڈرتا رہا۔ اور سچ جانا بھلی بات کو سو اسکو ہم سہج سہج پہنچادیں گے آسانی میں۔ اور جس نے نہ دیا اور بے پرواہ رہا۔ اور جھوٹ جانا بھلی بات کو تو اسکو ہم سہج سہج پہنچادیں سختی میں اور کام نہ آئے گا اسکو مال اسکا جب گڑھے میں گرے گا۔

لہذا اسی سرمایۂ حیات و مقصد زندگی کی حفاظت کو ہمیشہ مطمحِ نظر بنائے اور اسی پر قناعت کرے کہ اسی میں سلامتی ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: الاحقر نظام الدین

مفتی دار العلوم دیوبند

مدارس عربیہ میں آمدہ رقوم کا شرعی حکم!

سوال علماء دین مفتیان شرع متین کی درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کیا رائے ہے۔ مدارس عربیہ میں صدقات واجبہ اور عطیات کی رقم جو جمع ہوئی ہے اس پر سال گذرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ نیز یہ رقم معطی کی ملک سے خارج ہوتی ہے یا معطی کی ملک شمار ہوتی ہے۔ اس میں تین صورتیں متصور ہوسکتی ہیں۔

(۱) معطی کی ملک باقی ہو جیسا کہ امداد الفتاوی میں بھی لکھا ہے۔ لیکن اس پر مندرجہ ذیل اشکالات ہیں۔ (۱) حولانِ حول کے بعد عطیات کی رقوم پر زکوٰۃ فرض ہونی چاہیئے مگر اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟ جب کہ ان کے مالکوں کا کچھ علم نہیں اسلیئے کہ اولاً تو چندہ دینے والوں کی فہرست بہت طویل ہوتی ہے جن میں سے بیشتر کا پتہ لگانا مشکل ہے، پھر چندہ کی رقم ایک جگہ جمع ہوتی ہے اور حسب موقع پر خرچ ہوتی رہتی ہے۔ اس صورت میں نہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ اس میں سے کس شخص کی کتنی رقم ہے

کسی شخص نے پچاس برس پہلے رقم دی تو اب تک اس کی بھی شرکت چلی آتی ہے۔ اور آئندہ بھی یہ شرکت جاری رہے گی۔

(ب) چندہ دینے والوں میں سے کسی کا انتقال ہو جائے۔ تو اس کے چندہ کی رقم اس کے ترکہ میں داخل ہوگی۔ اسلیئے ادارِ وصیت و قرض اور وارثوں کے حقوق اس سے متعلق ہوں گے۔ وارثوں میں مجنون اور نابالغ بھی ہو سکتے ہیں جو ابراء و تبرع کے اہل نہیں ہیں۔ پس اس رقم کو واپس کرنا فرض ہوگا۔ اور یہ نمبر الف کی وجوہ سے ناممکن ہے۔

(۲) مہتمم طلبہ کی طرف سے وکیل ہو اس میں مندرجہ ذیل قباحتیں ہیں۔

(۱) طلبہ ان رقوم کے مالک ہوں گے اس لئے جب وہ چاہیں مہتمم (وکیل) کو برطرف کر دیں اور اپنی رقوم کا مطالبہ کر دیں۔ (۲) اگر کسی طالب علم کا انتقال ہو جائے تو اس کے ورثاء اپنے حق کا مطالبہ کر سکتے ہیں (۳) جب مدرسہ میں اتنی رقم جمع ہو جائے کہ ہر طالب علم کا حصہ بقدر نصاب پہنچ جائے تو مہتمم کیلئے اس سے مزید رقم وصول کرنا جائز نہ ہوگا۔ بلکہ خود طالب علم پر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی۔

(۳) رقوم چندہ کو بیت المال پر قیاس کر کے یوں کہا جاوے کہ یہ معطی کی

ملک سے تو خارج ہو گئی مگر کسی کی ملک میں داخل نہیں ہوئی۔ لیکن بیت المال میں حاکم کی ولایت جبریہ عامّہ ہوتی ہے اور مہتمم کی وکالت اختیاریہ حاصل ہے اسلئے یہ قیاس مع الفارق معلوم ہوتا ہے اگر یہ قیاس صحیح تسلیم کر لیا جائے تو مدّ زکوٰۃ میں تملیک ضروری نہیں رہے گی۔ ازراہِ کرم ان اشکالات کو رفع فرماکر عنداللہ ماجور ہوں۔

والسلام

المستفتی احتشام الحق آسیابادی

مدرسہ اشرف المدارس ناظم آباد

کراچی ۱۸

الجواب: پیش آمدہ مسئلہ کو تو احقر اس طرح سمجھے ہوئے کہ مہتممین مدارس نہ تو محض معطیین کے من کل الوجوہ وکیل ونائب ہوتے ہیں کہ نمبر ایک کی شق پر عائد شدہ اشکالات وارد ہوں اور نہ تو محض یہ مہتممین مدارس محض فی الحال داخل شدہ مستحق طلباء کے وکیل ونائب ہوتے ہیں کہ نمبر (۲) میں درج شدہ اشکالات وارد ہوں اور نہ تو یہ مہتممیں مدارس من کل الوجوہ عمال بیت المال کے مثل ہوتے ہیں اور نہ تو مدارس میں داخل شدہ کل رقوم من کل الوجوہ رقوم بیت المال کے حکم میں ہوتی ہے کہ ان پر نمبر (۳) میں درج شدہ اشکالات وارد ہوں بلکہ صورت کچھ اور ہوتی ہے اور اس کے سمجھنے کیلئے پہلے ان داخل شدہ رقوم کی حیثیت ونوعیت معلوم ومتعین کر لینا ضروری ہے سو عرض ہے کہ مدارس میں عموماً تین قسم کی رقوم داخل ہوتی ہیں

(۱) رقوم عطیات، ھدایا وصدقات نافلہ وغیرہ۔ یعنی وہ رقوم جو واجب التملیک نہیں ہوتیں۔

(۲) رقوم زکوٰۃ ونذور وکفارہ وغیرہ یعنی رقم جو واجب التملیک ہوتی ہے رقوم

(۳) وہ رقوم جس کو دینے والا کسی خاص کام کے لئے متعین کر کے دیتا ہے مثلاً کہتا ہے کہ اس رقم سے فلاں کمرہ بنوالو یا ٹائل لگوالو۔ یا فلاں فرش بنوا دو وغیرہ

تفصیل حکم رقوم (۳) یعنی وہ رقوم جس کو دینے والا کسی خاص کام کیلئے نامزد کر کے دیتا ہے مثلاً کوئی خاص کمرہ بنوانے کیلئے وغیرہ وغیرہ اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں مہتمم مدارس محض معطی کے وکیل و نائب ہوتے ہیں۔ اور یہ رقم ملک معطی سے خارج نہیں ہوتی۔ بلکہ جب تک یہ رقم موجود رہتی ہے۔ بحکم امانت رہتی ہے اور معطی کو اختیار رہتا ہے کہ جب چاہے اس توکیل کو ختم کر دے اور اپنی رقم واپس لیلے اور جب حسب ھدایۃ معطی خرچ ہو جاتی ہے تو ملک معطی پر خرچ ہوتی ہے غرض اس صورت میں محض معطی مالک رہتا ہے۔ پس مملوکیت کے تمام احکام (مثلاً حق تصرف للمعطی اور بعد ممات معطی ترکہ و وراثت وغیرہ سب احکام اس پر نافذ لاگو ہوں گے۔ اور اسی وجہ سے اس قسم کی رقوم کو خلط و استہلاک سے بچانے کیلئے مدارس میں بالکل الگ الگ رکھنا اور ہدایت و منشا معطی کے موافق خرچ کرنا لازم رہتا ہے۔ اور اگر الگ الگ رکھنے میں دشواری ہو تو قرض کی صورت میں منتقل کرالینا ضروری ہوتا ہے۔ اور خلط و استہلاک کی صورت میں ضمان عائد ہوتا ہے وھذہ الاحکام کلھا ظاھرۃ وباھرۃ فی الفقہ

تفصیل حکم رقوم نمبر ۲، رقوم نمبر ۲ یعنی رقوم زکوٰۃ وغیرہ جو واجب التملیک ہوتی ہیں ان رقوم میں مہتممین مدارس اور حسب ضابطہ مدرسہ ان کے نواب معطی کے بھی من وجہ وکیل ہوتے ہیں اس لئے قبضہ مہتمم من کل الوجوہ قبضہ مستحق نہیں ہوگا۔ اور اسی وجہ سے تملیک طلبہ یا تملیک مستحق زکوٰۃ ضروری رہتی ہے۔ بغیر اس تملیک کے کسی دوسرے مصرف میں صرف کرنا جائز نہیں رہتا۔ اور خلط و استہلاک سے بچنے کیلئے ان رقوم کو غیر واجبۃ التملیک رقوم سے

مستقل طور پر الگ رکھنا چاہئے۔ نیز ان رقوم میں یہ لوگ ان طلبار کے جو فی الحال مدارس میں موجود ہیں اور ان طلبار کے جو آئندہ داخل ہونے والے ہیں یا اُن مستحقین زکوٰۃ کے جو مدرسہ میں فی الحال موجود ہیں اور ان مستحقین زکوٰۃ کے جو آئندہ مدرسہ میں رہنے والے ہوں اگرچہ یہ لوگ مجہول الذات والکمیۃ ہوں۔ ان سب کے بھی وکیل ونائب ہوتے ہیں۔ اور اس جہت کے اعتبار سے چونکہ حقِ مستحق بھی متعلق ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان رقوم کو دیدینے کے بعد معطین واپس بھی نہیں لے سکتے اور نہ ان رقوم پر حولانِ حول کے بعد پھر کبھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور نہ مقدار کثیر ہونے پر مزید حاصل کرنے کو ناجائز کہہ سکیں گے۔ اور نہ کوئی مستحق غنی قرار پائے گا۔ اور نہ وہ اشکالات عائد ہوں گے۔ جو سوال میں مذکور ہیں —— اس جواب کی فی الجملہ تائید حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے۔ جو فتاویٰ اشرفیہ موسوم بہ فتاویٰ امدادیہ ج ۴ قدیم میں مذکور ہے۔ صفحہ ۲۱۶

اور وہ یہ ہے کہ عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں مگر اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال کے معطین اور آخذین ہر دو کی طرف سے وکلاء ہیں لہٰذا نہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ معطین واپس لے سکتے ہیں۔ انتہی بلفظہٖ

ایک شبہہ کا ازالہ مستحقین طلبہ میں یہ توسیع وتعمیم اسلئے ہو گی کہ مدارسِ دینیہ عربیہ جو محض چھ سال چھ ماہ کیلئے قائم نہیں کئے جاتے بلکہ رہتی دنیا کیلئے بہ غرض احیاء دین وعلم دین قائم ہوئے ہیں۔ کما ھو مقتضاء جمیع الاوقاف کالمساجد والرباطات وغیرہ۔ اور مدارس میں ان رقوم کو دینے والے بھی اسی نیت وتصور سے دیتے ہیں لہٰذا رہتی دنیا تک کے مستحقین زکوٰۃ فی الجملہ ضمناً وتبعاً متصور و مراد ہو جائیں گے۔ اور یہ استحقاق ان کے

مجہول الذوات والکمیۃ ہونے کے باوجود ان سے متعلق ہو جائے گا۔ پھر معطین بھی مختلف طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض تو طلباء پر خرچ کی تصریح کے ساتھ دیتے ہیں اور بعض بغیر اس کے دیتے ہیں بلکہ بعض تو یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ شلاً یہ زکوٰۃ کا روپیہ ہم مدرسہ کے کام کیلئے دیتے ہیں۔ اور یہ جانتے ہوئے دیتے ہیں کہ اس مدرسہ میں فی الحال نادار طلبہ کو کھانا کپڑا نہیں ملتا پس اس جملہ کی تصحیح اور شرعی توجیہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ تملیک شرعی کے ذریعہ اس رقم سے مدرسہ کا کام کیا جائے۔ اور جب مدرسہ میں طلباء نادار نہ ہوں تو لامحالہ کسی بھی مستحق زکوٰۃ سے تملیک کرا کر کسی مصرفِ مدرسہ میں رقم صرف ہو سکے گی اور عاقل بالغ کے کلام کا محمل حسن پر مہما امکن حمل کرنا بھی ضروری ہوتا بھی ہے۔ پس اگر معطی نے یہ کہہ کر دیا ہے کہ یہ رقم ضروریات طلباء پر خرچ کیلئے ہے تو جب تو اس پر تملیک طلباء ملحوظ رہنا ضروری ہوگا۔ اور اگر مطلقاً بلا لحاظ تعیین طلباء دیا ہے تو مدرسہ کے کسی بھی مستحق زکوٰۃ سے بلا تکلف تملیک کرا لینا کافی ہوگا بلکہ ایسی صورت میں اگر کسی ملازم مدرسہ کو جو مستحق زکوٰۃ و نادار بھی ہو۔ اور مصلحتِ شرعی ہو تو اراکینِ مدرسہ کے مشورہ سے اجرت و تنخواہ قرار دیئے بغیر محض بطور صدقہ کے اس رقم سے اس کی کچھ مدد کر دینا بھی جائز رہے گا، اس لئے مصرف کی ان دونوں شکلوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی رقوم کو بھی الگ الگ رکھنا بہتر ہو گا۔ تاکہ وہ رقوم بوجہ اتم معطی کی ہدایت و منشار کے مطابق صرف ہو سکیں۔

تفصیل حکم رقوم نمبر ۱:۔ یعنی رقوم عطیات وغیرہ جو غیر واجب التملیک ہوتی ہیں ان رقوم کے بارے میں بھی مہتممین مدارس اور ان کے نواب وکیل و نائب ہوتے ہیں البتہ اس کی نوعیت و احکام میں کچھ فرق ہوتا ہے۔

مثلاً رقوم نمبر دو (واجب التملیک رقوم) میں تملیک فقراء شرط ہوتی ہے اور ان رقوم (غیر واجب التملیک رقوم) میں یہ شرط نہیں ہوتی لیکن ارباب حل وعقد کے مشورہ سے خرچ کا جو ضابطہ حدود شرع میں رہتے ہوئے مقرر ومتعین ہوتا ہے۔ صرف اس ضابطہ کے ماتحت خرچ کرنا ضروری رہتا ہے۔ اور اگر ارباب حل وعقد نہ ہوں یا ہوں مگر کسی خرچ کے بارہ میں کوئی واضح ضابطہ ملے تو ادارہ کے سابق اہل علم و دیانت و ذمہ داروں کا معمول واجب الاتباع رہتا ہے اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو تو دیگر ایسے ہی مدارس اور اداروں کا معمول دیکھا جائے گا۔ اور اس کی اتباع کی جائے گی۔ مہتمم یا عملہ مدارس خود رائی نہیں کر سکتے ہیں۔ کما ہو ظاہر د باہر من فتوی الاکابر،

اور مثلاً رقوم نمبر ۲ میں مہتممین مدارس اولاً صرف معطین وآخذین کے وکیل و نائب ہوتے ہیں۔ پھر بعد تملیکِ شرعی کے تمام مسلمانوں کے یا اربابِ حل وعقد کے وکیل ونائب ہو جاتے ہیں اور رقوم نمبر ۱ میں شروع ہی سے تمام مسلمانوں کے یا ارباب حل وعقد کے وکیل ونائب ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ مہتممین ارباب حل وعقد کے انتخاب سے امیر ونائب ہوتا ہے یا اگر ارباب حل وعقد نہ ہوں تو جس خطہ کا یہ مدرسہ ہے اس خطہ کے با اثر سمجھ دار، ذمہ دار مسلمانوں کے امیر ونائب یا نمائندہ ہوتا ہے اور سلطان کے ایک خاص وصف (انتظام حقوقِ عامہ) میں سلطان کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ اسلئے کہ جب ارباب حل وعقد کے اتفاق سے یا تراضی مسلمین سے یہ منصب سلطان وابستہ ہے: "کما ہو مبرہن فی مقامہ" تو پھر اس کے قائم مقام کا نصب کیوں نہ ان سے وابستہ ہو گا۔ ضرور ہو گا۔

ایک شبہ کا ازالہ:۔ اور قوتِ قہریہ کے فقدان سے اس نیابت کے اقامت و تحقق میں شبہ نہ کیا جائے اسلئے کہ سلطان میں دو وصف ہوتے ہیں۔

ایک وصف حکومت و سلطنت ، جس کا ثمرہ سد ثغور و تنقید ، حدود و قصاص وغیرہ اعمال ہیں ۔ اور اس میں قوت قہریہ شرط ہے اس میں تو کوئی بغیر اس قوت کے قائم مقام نہیں ہو سکتا ہے ۔

دوسرا وصف وہ محض انتظام حقوق عامہ ہے جس کے لئے قوت قہریہ شرط نہیں ہوتی اس وصف میں بغیر قوت قہریہ کے بھی نیابت ہو سکتی ہے ھکذا فی امداد الفتاویٰ ص ۲۲۱ ج ۲ ۔ قدیم اور یہ مالی انتظام مدارس اسی قبیل سے ہے ۔ بغیر قوت قہریہ کے بھی محض آپس کے مصالحت و رضامندی سے بھی قائم و درست ہو سکتا ہے ۔ لہذا قوت قہریہ کے فقدان سے اس نیابت (مالی انتظام مدارس) کے اقامت و تحقق میں فتور واقع نہ ہو گا ۔ چنانچہ اقامت جمعہ و اعیاد کے انتظام میں یہ نیابت امیر تسلیم و رائج ہے اور اسی پر وجوب جمعہ و اعیاد وغیرہ ہمارے مسلک میں دائر ہے اور ان کے تحقق و اقامت میں کوئی فتور واقع نہیں ہو گا ۔ پھر جب یہ انتظام حقوق عامہ دنیوی امور سے بھی متعلق ہو سکتا ہے ۔ اور اس کے درست و منتظم رکھنے میں یہ نیابت سلطان جائز ہو سکتی ہے ۔ تو مالی امداد انتظام مدارس کے لئے جو خالص امر دینی ہے درست و منتظم کرنے کے لئے (یعنی احیاء دین و احیاء علم دین اور اس کے ابقاء و تحفظ کیلئے) ہے اور جو سب سے مقدم فریضہ ہے ۔ اور اہم الواجبات میں سے ہے اس میں یہ نیابت کیوں جائز و درست نہ ہو گی ۔ بدرجہ اولیٰ جائز و درست ہو گی بالخصوص جبکہ یہ مالی انتظام مدارس ملاک اور مستحقین کے رضا و رغبت سے بھی ہو گی اور جب مہتمم مدرسہ سلطان کے وصف ثانی (انتظام حقوق عامہ) میں سلطان کا قائم مقام ہو گا تو عملۂ مدرسہ عمال بیت المال کے مثل ہوں گے ۔ اور یہ رقوم قسم ثانی کی (رقوم غیر واجب التملیک) جب برضاء و رغبت من جانب ملاک داخل ہو جائیں گی تو یہ رقوم اموال بیت

المال کے مثل ہو جائیں گی۔ اور اگرچہ یہ رقوم وقف شمار نہ ہوگی مگر بحق مدرسہ محبوس ضرور ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ بغیر اس حبس کے یہ انتظام امر دینی کافی زمانہ قائم و منتظم نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ اس کا قائم و منتظم رکھنا سب پر حسب استطاعت واجب ہے اور واجب کا ذریعہ بھی واجب ہوتا ہے۔ اسلئے یہ حبس بھی واجب ہوگا۔ اور چونکہ رہتی دنیا تک کیلئے یہ نظم قائم و منتظم ہوتا ہے جیسا کہ ہم پہلے (نمبر دو کے جواب میں) کہہ آئے ہیں۔ اس لئے ان کو واپس لینے کا بھی حق کسی کو حاصل نہ ہوگا۔ خود معطیین کو بھی حق نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس سے حبس واجب میں جو مقصود اولی ہے فتور واقع ہو جانے کا ظن غالب متصور ہے۔

اسی طرح ان رقوم کی فی الحال مقدار کثیر جمع ہو جانے کے بعد مزید رقوم کا اتصال بھی ممنوع نہ ہوگا۔

اس لئے کہ جب یہ نظم رہتی دنیا تک کے لئے واجب ہے تو آئندہ ان رقوم کثیر کے مصرف کا وجود بھی بذریعہ غالب منظون ہے۔ اسی طرح حولانِ حول پر ان رقوم میں زکوٰۃ بھی واجب نہ ہوگی اسلئے کہ بیت المال کی رقوم کا یہی حکم ہے نیز اس لئے کہ اس حبس دائمی کی وجہ سے ملاک کا تصرف مالکانہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اور ادائیگی زکوٰۃ کا حکم اسی تصرف مالکانہ کے قبیل سے ہے لہذا وہ بھی منقطع ہو جائیگا اسی طرح ولایۃ عامہ جبریہ سے بھی اشکال نہ ہوگا۔ کیونکہ ولایت عامہ جبریہ سلطان کے وصف اول یعنی حکومت و سلطنت (جس کا ثمرہ سدّ ثغور و قوۃ تنفید وغیرہ ہوتا ہے) سے متعلق ہے اور یہ نیابت (مالی انتظام مدارس) محض وصف ثانی انتظام حقوق عامہ کے متعلق ہے اور یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں کما مرّ انفاً فترقا والا منافاۃ ولا تضاد بینہما ھذا ما عندی من الشرع الشریف فان کان خطأً فمن نفسی وان کان حقاً صواباً فمن اللہ وعلیہ التکلان وھو

الموفق للسداد والصواب فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہٗ الاحقر

نظام الدین عفی عنہ

دار العلوم دیوبند

۱۱ رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ

مرنے کے بعد اپنی آنکھیں ہبہ کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیانِ شرعِ متین درج ذیل مسئلہ کے بارے کہ

مرنے کے بعد آنکھیں ہبہ Donate (چندہ میں دینا) کرنے کے سلسلہ میں شرعی حکم کیا ہے، کیا اس قسم کی وصیت زندگی میں کی جا سکتی ہے، جب کہ اسلام کسی مجبور کی مدد کو ایک مستحسن فعل قرار دیتا ہے۔ تو کیا ایک مرے ہوئے شخص کی آنکھوں سے ایک زندہ انسان کو بینائی جیسی نعمت سے مستفید کیا جا سکتا ہے۔ بظاہر یہ ایک مستحسن فعل ہے لیکن اس ضمن میں شرعی احکام کیا ہیں؟ اس کے لئے میں آپکے جواب کی منتظر ہوں، اور عمل جراحی کا جواز دیکھتے ہوئے اس کا جواب بھی ذہن میں آتا ہے۔ امید ہے کہ جلد جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔

فقط بیّنوا، توجروا

الجواب:۔ عمل جراحی پر آنکھوں کی پیوندکاری کو قیاس نہیں کر سکتے بچند وجوہ۔

(۱) عمل جراحی میں تو محض بعض نعش پر یہ عمل کرنے سے بہت سے زندہ مریضوں کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ اور یہاں ایسا نہیں ہے۔

(۲) آنکھ کی بینائی ختم ہو جانا عدم النفع ہے۔ اور دوسرا دیدہ کا لگانا اضافہ فی النفع ہے اور یہ اضافہ شرعاً عموماً واجب نہیں اور نہ اُس کو واجب کہہ سکتے

ہیں۔ بلکہ امر مباح یا بیش از بیش امر مستحسن ہو سکتا ہے۔ اور احترام اعضاء انسانی بمدد آیت کریمہ و لقد کرمنا بنی آدم واجب ہے۔ اور کسی امر مباح یا مستحسن کیلئے ترک واجب کا ارتکاب درست نہیں ہوتا۔

(۳) شق بطن حاملہ کے مسئلہ میں احد الضررین (ضرر بچہ یا زچہ) کا تحقق ستیقن تھا۔ اس لئے وہاں اخف الضررین کے اختیار کی صورت پیدا ہو گئی اور یہاں (پیوندکاری میں) ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ عدم النفع کا نام ضرر نہیں۔

(۴) جس شخص کا دیدہ اس کی آنکھ میں ڈالیں گے، یہ دیدہ کا ڈالنا اس دیدہ کا استعمال ہے۔ اور استعمال ابتذال ہے۔ اور انسانی اعضاء کا ابتذال احترام کے منافی و ناجائز ہے۔ اس لئے جائز نہ ہوگا۔ اور خون چڑھانے کے جواز پر اسکو قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ وہ مسئلہ تداوی بالمحرم کے قبیل سے ہے اور بحالت اضطرار یا بحالت شدت احتیاج ہے۔ اور یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے جس کو بعض علماء نے لکھا ہے کہ آنکھوں کے ہدیہ کا معاملہ صرف آنکھوں تک ہی محدود نہ رہے گا۔ بہت سے دوسرے اعضاء بھی مریضوں کے کام آ سکتے ہیں۔ اور ان کے دوسرے مفید استعمال بھی ہو سکتے ہیں۔ اور یہ دروازہ اگر کھول دیا جائے گا تو مسلمانوں کا قبر میں دفن ہونا مشکل ہو جائے گا۔ اس کا سارا جسم ہی چندے میں تقسیم ہو کر رہے گا۔

رہا یہ ہے اشکال (اور پھر قبر میں حشرات الارض اور مٹی کھا جاتی ہے۔ تو یہ اشکال بھی قابل اعتبار نہیں ـــــ اولاً تو اس لئے کہ یہ معاملہ ہر نعش کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اکثر مدتوں کے بعد بھی بعض نعش بالکل صحیح و سالم بلکہ تر و تازہ برآمد ہوتی ہے۔

ایک واقعہ ہے تقریباً بیس برس کا ہے، اس کے دیکھنے والے سیکڑوں اب بھی موجود

ملیں گے۔ کہ ایک قبر کھودی جارہی تھی۔ نچلے حصہ میں بغلی کھودتے وقت ایک بڑا گڈھا برآمد ہوگیا دیکھا تو قبر تھی اور اس میں ایک جوان مرد کی نعش بالکل صحیح وسالم پڑی تھی کفن و داڑھی کے بال بھی بالکل صاف وتر و تازہ نظر آرہے تھے۔ صرف داڑھی کے چند بال جو چہرہ کھولنے کی وجہ سے زمین سے لگ گئے تھے۔ اور اس پر کچھ بوسیدگی یا گرد کے آثار تھے۔ نیز ابھی چند دن کی بات ہے کہ ضلع مرادآباد میں چھ ماہ کی قبر کھل گئی مردہ مع کفن کے تر و تازہ اس میں موجود تھا۔ اس پر وہاں مٹی ڈالنے کی کیفیت و طریقہ میں اختلاف ہوا۔ اور یہاں استفتاء آیا کہ ایسے وقت میں کیا کیا جائے

علاوہ ازیں اس قسم کے واقعات برابر سننے میں آتے رہتے ہیں اس لئے یہ مٹی یا حشرات الارض کے نعشوں کو کھا جانا کلی نہ ہوا بلکہ اس کا معاملہ ہی کچھ دوسرا ہے۔ اس لئے اس کو بھی استعمال اعضاء انسانی کے لئے وجہ جواز نہیں بنا سکتے دوسرے اس لئے کہ تدفین کا حکم منصوص ہے۔ اور منصوص حکم کو محض قیاس یا مصالح کی بنا پر ترک یا متغیر نہیں کر سکتے۔ ورنہ پھر تو سارا دین ہی کھلونا بن کر رہ جائے گا۔

غرض یہ کہ پیوندکاری کے مسئلہ میں جواز کی طرف جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر

(مفتی) نظام الدین عفی عنہ

دارالعلوم دیوبند

۲۴ ۸/۹۹ ھ

مسلم نعش پر عمل جراحی کا حکم

سوال :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہسپتال وغیرہ سے لاوارث مسلم نعش عمل جراحی کے لئے میڈیکل کالج میں بھیج دی جاتی ہے، اب اس کے متعلق سوال یہ ہے کہ

(۱) مسلم نعش پر شرعاً کسی حالت میں عمل جراحی جائز ہے یا نہیں ؟

(۲) اور اگر کسی خاص صورت میں جائز بھی ہو تو میڈیکل کالج میں تعلیمی ضرورت کے لئے مسلم نعش پر عمل جراحی جائز ہوگا ؟

الجواب :- مسلم نعش پر عمل جراحی بعض حالات میں شرعاً جائز ہے۔ مثلاً کوئی عورت مرجائے اور اس کے پیٹ میں بچہ زندہ اور متحرک ہو تو تمام فتاویٰ میں یہ تصریح ہے کہ اس کے پیٹ کو بائیں جانب سے چیر کر بچہ کو نکال لیا جائے۔ درمختار میں ہے۔ " حامل ماتت وولدها حی یضطرب شق بطنها من الایسر ویخرج ولدها " برحاشیہ ردالمختار صـ ۶۶۱ ج ۱

نیز ایسی صورت میں بھی عمل جراحی جائز ہے۔ جب کہ مرنے والی کے پیٹ میں کوئی چیز متحرک معلوم ہو اور لوگوں کی رائے یہ ہو کہ یہ متحرک بچہ ہے، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ وفی التجنیس من علامۃ النوازل امرأۃ حامل ماتت واضطرب فی بطنها شیئ وکان رأیهم انہ ولد حی شق بطنها (صـ ۱۰۲ ج ۲، قبیل باب الشهید)

مطلب یہ ہے کہ ہر دو صورت میں بچہ زندہ ہونے کا یقین ہو کہ یا بچہ کے زندہ ہونے کا ظن ہو۔ مردہ نعش کو چاک کرنا جائز ہے۔ نیز ایسی صورت میں بھی مردہ نعش پر عمل جراحی کرنا جائز ہے۔ کہ کوئی شخص کسی کا روپیہ نگل جائے اور مرجائے۔ درمختار میں ہے۔ ولو بلع مال غیرہ ومات هل یشق قولان والاولی نعم اھ

(قولہ الاولی نعم) لانہ وان کان حرمۃ الادمی اعلیٰ من صیانۃ المال لکنہ ازال احترامہ بتعدیہ کما فی الفتح ومفادہ انہ لوسقط فی جوف بلا تعدٍ لایشق اتفاقاً اھ (رد المحتار ص ۶۶۲ ج ۵)

وفی البیری عن تلخیص الکبریٰ لو بلغ عشرۃ دراھم ومات یشق وافاد البیری عدم الخلاف فی الدراھم والدنانیر (رد المحتار ص ۱۳۳

ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ مردہ نعش پر بحالتِ ضرورت عمل جراحی جائز ہے۔

(۲) میڈیکل کالج میں تعلیمی ضرورت کیلئے نعش پر عمل جراحی کرنا شرعاً جائز ہوگا اس لئے کہ آئینِ اسلام کا ضابطہ یہ ہے کہ دو ضرروں میں سے ایک ضرر اگر دوسرے ضرر سے اعظم ہو تو اشد ضرر کا اخف ضرر کے ذریعہ سے ازالہ کیا جائیگا جس کی ایک مثال مردہ عورت کے پیٹ کا بچہ نکالنے کیلئے چیرا جانا ہے۔

الاشباہ والنظائر میں ہے۔

لوکان احدھما اعظم ضرراً عن الاخر فان الاشد یزال بالاخف (ص ۱۲۳ ج ۱ تحت القاعدۃ الخمسۃ

اس کے بعد اس کی مثالوں میں بہت سی مثالوں کے ساتھ مذکورہ بالا مثال کو ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ " ومنھا جواز شق بطن المیتۃ لاخراج الولد اذا کانت ترجی حیاتہ وقد امر بہ ابوحنیفۃ رحمہ اللہ فعاش الولد کما فی الملتقط، (الاشباہ والنظائر ص ۱۲۳ ج ۱، مع الحموی

میڈیکل کالج میں چند مردوں کی نعش پر عمل جراحی کے باعث چونکہ سینکڑوں زندہ مریضوں کی جان بچتی ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ایک بچہ کی جان بچنے کے لئے ایک نعش پر عمل جراحی بلا اختلاف جائز ہو۔

اور سینکڑوں جان بچنے کیلئے چند نعشوں پر عمل جراحی جائز نہ ہو ھذا ما عندی فان اصبت فمن اللہ وان اخطئت فمنی ومن الشیطان، علمائے کرام کے لئے قابلِ غور بات یہی ہے کہ عدم تعلیم سینکڑوں جانوں کی ہلاکت کا موجب ہوگا؟ یا نہیں؟ اور اگر موجب ہوگا تو یہ ضرر بمقابلہ چند نعشوں کے اعظم اور اشد ضرر ہے یا نہیں۔

میرا خیال ہے کہ بمقابلہ چند نعشوں کے سینکڑوں جانوں کی ہلاکت اعظم اور اشد ضرر ہے۔ لہذا الاشباہ کی تصریح کی بنا پر آئین اسلام کی رو سے اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا ہے کہ میڈیکل کالج میں نعش پر جو عمل جراحی کیا جاتا ہے وہ شرعاً حدِ جواز کے اندر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

منت اللہ رحمانی

خانقاہِ رحمانی مونگیر،

الجواب صحیح

علم جراحی مسلمانوں کے لئے حاصل کرنا لازمی اور ضروری ہے۔ اور ادھر یہ قاعدہ بھی ہے۔ الضرر یزال اور الضرورات تبیح المحضورات۔ پس ضرورت اور مجبوریوں کی وجہ سے یہ عمل جراحی جائز ہے، چنانچہ مجیب لبیب نے توضیح کی ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ السید مہدی حسن مفتی دار العلوم دیوبند

۲۹ ۱/۷۶ ھ

الجواب صحیح والمجیب نجیح

خط کشیدہ عبارت تو بہت ہی مضبوط دلیل ہے اور آیتِ کریمہ ولکم فی القصاص حیوٰۃ یا اولی الالباب ۰ اور آیتِ قتال کے اشارے بھی اس طرف ہیں

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ —— احقر نظام الدین دار العلوم دیوبند

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمار دین شرعِ متین درج ذیل مسائل کے بارے میں۔

(۱) کیا ایک مسلمان کو مسلم ہونے کی حیثیت سے، آنکھ، ناک، کان، یا جسم کے کسی عضو کے متعلق، مرنے سے پہلے یہ وصیت کرنا جائز ہے کہ میرا جسم یا جسم کا فلاں عضو میرے مرنے کے بعد کسی ہسپتال کو بطور عطیہ (Danation) دیدیا جائے؟

(۲) کیا کسی مسلم کے جسم میں کسی مسلم یا غیر مسلم کا کوئی عضو بوقت ضرورت منسلک کرنا (Trans Plaul) جائز ہے؟

(۳) کیا کوئی مسلمان اپنا خون بطور عطیہ (Donalion) کسی مسلم یا غیر مسلم کو دے سکتا ہے یا اپنے جسم میں کسی مسلم یا غیر مسلم کا خون داخل کرا سکتا ہے؟

(۴) ایک مجتہد الحاج السید ابوالقاسم الموسوی الخوئی نے "توضیح المسائل" نام کی ایک کتاب تصنیف کی ہے جو شائع ہو چکی ہے اس میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی نے اپنے وصیت نامہ میں اپنے جسم کے کسی عضو کو بطور عطیہ (Danalion) دینے کے لئے لکھ دیا ہے تو اس کی وصیت کے مطابق عمل کرنا جائز ہے،

کیا مفتیان اہل سنت والجماعت اس فتویٰ سے متفق ہیں؟ بیّنوا وتوجّروا

الجواب (۱) کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ یہ وصیت کرے کہ میرے مرنے کے بعد میرا جسم یا جسم کا فلاں عضو، آنکھ، کان وغیرہ کوئی بھی عضو فلاں کو یا کسی ہسپتال کو بطور عطیہ یا بعوض قیمت دیدیا جائے۔ اگر وصیت کردیگا تو یہ وصیت منعقد وصحیح بھی نہ ہوگی اور اس کے مرنے کے بعد اُس وصیت پر عمل کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔ جو لوگ عمل کریں گے سخت گنہگار ہوں گے۔ اور یہ سب حکم ظاہر ہے۔ اس لئے کہ وصیت مملوکہ مال میں ہوتی ہے اور یہ جسم انسان کا مملوک نہیں ہے بلکہ اللہ کی ملک ہے اور اس کے پاس محض بطور امانت کے ہے۔

بغیر حکم شرع و حکم خدا ایک انگلی بھی کاٹ ڈالنا جائز نہیں ہے بلکہ حرام و سخت گناہ ہے۔

(۲) یہ چیز بھی قطعاً ناجائز و حرام ہے کوئی عضو خواہ مسلمان ہی کا ہو کٹ کر جسم سے الگ ہونے کے بعد جیفہ و مردار ہو کر نجس و ناپاک ہو جاتا ہے۔ اور پھر کسی جسم میں لگانے سے خواہ مسلمان ہی کے جسم میں لگایا جائے، مردار و جیفہ ہونے سے خارج نہ ہوگا۔ اور نہ تو پاک و طاہر ہی ہوگا۔ لہذا اتنا حصۂ جسم ہمیشہ مردار و ناپاک ہی رہے گا۔ اور وہ شخص کبھی نماز بھی نہ پڑھ سکے گا۔ اور نہ کبھی طاہر ہی ہو سکے گا۔

ہاں اگر اضطراری صورت ایسی ہو جائے کہ احشاء جسم (اندرونِ جسم) میں مثلاً گردہ، پھیپھڑا، جگر، دل وغیرہ میں سے کوئی اس درجہ خراب ہو جائے کہ اسکو نکال کر اس کی جگہ دوسرا لگانا ضروری ہو جائے اور ماہر معالجوں کے نزدیک جانبری کے لئے اور زندگی بچانے کیلئے اس عمل کے بغیر چارہ نہ رہے بلکہ یہی عمل متعین ہو جائے اور صحت و البقاء زندگی کا گمان غالب حاصل رہے تو اس اضطرار کی حالت میں جان باقی رکھنے کیلئے اس عمل کی بقدر اضطرار کی گنجائش ہو سکے گی۔ پھر یہ کوشش لازم و ضروری رہے گی کہ بجائے انسانی عضو کے کسی جانور کا عضو اور وہ بھی کسی ماکول اللحم جانور کے عضو سے کام چل سکے تو صرف اس کے عضو سے کام لیا جائے

(۳) اس نمبر کا حکم یہ ہے۔ اضطراری حالت میں جبکہ جان بچنے کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نظر نہ آوے تو محض قدر ضرورت کی مقدار دینے اور استعمال کر لینے کی گنجائش نکل سکے گی اور اسمیں بھی کوشش لازم رہے گی کہ کسی مسلمان کا خون نصیب ہو جائے۔

(۴) اس نمبر کا جواب ۱ کے جواب میں آچکا کہ یہ مسئلہ بالکل غلط اور ناقابلِ التفات ہے اور ناقابلِ عمل ہے، ہرگز ایسی وصیت پر عمل کرنا کسی کو جائز نہیں ہے

اضطراری صورت مستثنیٰ ہے اور اس سے بالکل الگ ہے۔ اس سے وصیت کا کوئی تعلق نہیں۔ لہذا اس سے دھوکہ نہ کھائے

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین مفتی دار العلوم

۹۸/۱۲/۸ ھ

قربانی کا جانور تول کر خرید و فروخت کرنے اور گورنمنٹ سے ملحق مدرسوں میں زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء دین وشرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں

(۱) بقرعید کے موقعہ پر بعض حضرات خصی کو زندہ تول کر اس کے وزن کے اعتبار سے پیسہ دیکر خریدتے ہیں اس طرح کی بیع جائز ہے یا نہیں۔ جبکہ اس کے اندر مال غیر متقوم بھی موجود ہیں۔ جیسے۔ پیشاب، مینگنی وغیرہ سب ہی اس کے اندر رہتا ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ جو مدرسہ گورنمنٹ سے ملحق ہے خواہ ہمارا مدرسہ دار العلوم ہو یا مفتاح العلوم ہو ان مدارس میں صدقہ، فطرہ، زکوٰۃ، چرم قربانی وغیرہ دینا کیسا ہے جب کہ ہمیں خوف اس بات کا ہے کہ آج نہیں تو کل یہ مدارس ہمارے ہاتھوں سے نکل سکتے ہیں۔ اور گورنمنٹ اس پر اپنا قبضہ کر سکتی ہے۔ بہرحال مفصل اس کے بارے میں جواب تحریر فرماکر ممنون فرمائیں۔

(۳) گورنمنٹ سے جو ایڈ ملتا ہے مدرسین، ملازمین کو اس سے تنخواہ دینا کیسا ہے سوال کرنے کی نوبت یوں آئی کہ میرے استاد نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک مفتی صاحب شاید ہارون الرشید خلیفہ کے زمانہ میں افتاء کا کام کرتے تھے اور ہارون الرشید ان کو کچھ بطور وظیفہ کے دیتے تھے۔ لہذا اس پر عوام نے فضیل ابن عیاض رحؒ سے شکایت کی آپ نے عوام کو تو بہلا کر واپس کر دیا، اس کے بعد

فضیل ابن عیاض رح مفتی صاحب کے پاس گئے اُن سے آپ نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے ہارون الرشید یہ رقم کہاں سے آپ کو دیتے ہیں تو پھر مفتی صاحب نے توبہ کیا اور کہا آج سے نہیں لوں گا۔ جب معاملہ یہ ہے تو کیسے ان چمار یا حکومت سے ایڈ سمجھ میں نہیں آتا۔ لہٰذا اس مسئلہ پر غور فرما کر جلد از جلد جواب تحریر فرمائیں تاکہ اس پر عمل کرنے میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے۔

الجواب:- بقر عید کے موقعہ کے علاوہ بھی خصی وغیرہ کسی جانور کو زندہ تول کر وزن کے اعتبار سے قیمت مقرر کر کے بیچنا ناجائز ہے اور اس طرح خرید کر قربانی نہ کیجائے۔ ثمن کی جہالت مفضی الی النزاع تو ہر حال میں رہتی ہے اور بعض صورتوں میں ثمن و مبیع دونوں کی جہالت مفضی الی النزاع رہتی ہے۔

(۲) اگر ان مدارس میں ان رقوم کے مستحقین و مصارف موجود ہوں تو یہ رقوم بلاکراہت ان پر دینا جائز رہے گا۔ البتہ اگر خوف مذکور کا ظن غالب ہو جائے تو الحاق ختم کر دینے کا حکم عائد ہو جائے گا۔

(۳) مدرسین کو اس کا لینا جائز ہے اور فضیل ابن عیاض رح کا جو واقعہ نقل کیا ہے اول تو محتاج سند ہے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو بہت سے بہت تقویٰ ہو سکتا ہے فتویٰ نہیں ہو سکتا کہ اس سے استدلال کیا جا سکے اور حکومت جیسی بھی ہو مگر ہے عوام کی، عوام کا ہر فرد یکساں مستحق ہے اور اس میں مسلمان بھی شامل ہے حسب حیثیت وہ بھی مستحق ہے اور اسی استحقاق سے ملتا اور لیتا ہے۔ البتہ عوام میں جو لوگ با اثر و با اقتدار ہیں یعنی سمجھدار ہیں سلیقہ مند ہیں ان پر ان کی حیثیت کے اعتبار سے اس بات کی سعی لازم ہے کہ یہ چمار پن نہ رہے جس کا ذکر سوال میں ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ کتبہ الاحقر نظام الدین دار العلوم دیوبند، ۲۵/۹/۹۸ ھ۔

الجواب صحیح۔ سید احمد علی سعید، دار العلوم دیوبند ۷/۱۰/۹۸ ھ۔

کیا ہندو مسلم باہم ملکر چندہ وصول کرکے دیوی دیوتاؤں کے نام پر چڑھا سکتے ہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں؟

ہم لوگ عرصہ سے ایک جاہلانہ رسم میں مبتلا تھے کیونکہ ہندوستانی مسلمان ہیں بہت سی مشرکیہ رسمیں جہالت کیوجہ سے اب بھی ہم میں موجود ہیں منجملہ ان کے ایک رسم یہ کہ سالانہ ہندو مسلم ملکر چندہ اکٹھا کرتے تھے، ہندو اس روپیہ سے خنزیر، مرغا بکرا خرید کر پوجا کرتے اور جانوروں کو دیوی دیوتاؤں کے نام پر چڑھاتے ہیں تو جب ہمکو یہ معلوم ہوا کہ یہ ناجائز وحرام ہے تو ہم گاؤں کے چند آدمیوں نے چندہ دینے سے انکار کردیا۔ باقی مسلمان اب بھی ہندوؤں کے اس مشرکانہ فعل میں شریک ہیں برابر چندہ دیتے ہیں۔ اور ہم چندہ نہ دینے والوں کا ہمارے ہی مسلمان بھائی جو صرف نام کے مسلمان ہیں ہم چند مسلمانوں کا بائیکاٹ کردیا ہے۔ اب اس حالت میں ہم لوگوں کا ان سے ربط وضبط رکھنا کیسا ہے شرع شریف کی رو سے جو احکام ہوں وہ سب بتلائیں اور مدلل ومبرہن طریقہ سے تاکہ ان کو ہم لوگ خاموش کرسکیں۔ کیونکہ وہ زیادہ پریشان کرنے کے درپے ہیں۔

الجواب: ان بائیکاٹ کرنے والے مسلمانوں سے ربط وضبط تو صورت مسئولہ میں ختم نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ ہمدردی اور ٹھنڈے دل سے ان کی ہدایت و اصلاح خیال کی کوشش کرنا چاہیے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ان کو نرم وبہی خواہانہ انداز میں مسئلہ سے آگاہ کردیا جائے کہ بھائی جب سب روپیہ اکٹھا رکھا جائے گا تو یہ پتہ نہیں چلے گا کہ کون کون کس کا تھا بلکہ ہر روپیہ میں ہر آدمی حسب حصہ اور حسب دہندگی شریک مانا جائے گا۔ اور پھر ایسی صورت میں جو روپیہ ان ناجائز کاموں کے لئے دیا جائے گا۔ اور سب میں مسلمانوں کے روپیہ کی بھی شرکت ہوجائے گی اور شرک وکفر کے کام میں اعانت ہوجائے گی۔ اور اس کی ممانعت قرآن پاک

میں بھی ہے لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (الآیۃ) اور بہت سی حدیث پاک میں بھی ہے۔ نیز جب یہ طریقہ بڑھیگا اور پھیلے گا تو بڑے خطرناک وبال کا بھی قوی اندیشہ ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ من سن سنۃ سیئۃ فعلیہ وزرھا ووزر من عمل بھا۔ اور مرنا پھر اس کے بعد حساب وکتاب اور عذاب وعقاب سب ضروری ہے۔ اس لئے منع کیا جاتا ہے۔ اور اگر اس چندہ میں شرکت ضروری بھی ہو جائے۔ تو اس غلط وناجائز کام کیلئے دینے کے بجائے دیتے وقت اُن غیر مسلمین سے یہ کہہ دیا جائے کہ بھائی مذہبی بات ہے اس لئے ہم یہ رقم آپ کو دیتے ہیں (ہبہ کرتے ہیں) آپ اس کے مالک ہو گئے اور آپ کو اختیار ہو گا کہ جہاں چاہیں خرچ کریں۔ اب ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اسطرح سانپ بھی مرجائے گا۔ اور وہاں سے بھی حفاظت رہے گی۔ البتہ اپنی حالتِ زار کے اصلاح کی فکر اور توبہ واستغفار پر استمرار ودوام لازم ہے کہ ہماری یہی بداعمالیاں ہم پر حاکم بن کر آرہی ہے۔ اللھم احفظنا فقط

واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہٗ الاحقر نظام الدین دارالعلوم دیوبند

$\frac{10}{98}$ ۷ ج

پراونڈ فنڈ کی شرعی حیثیت

سوال:۔ مفتیانِ شرعِ متین کی کیا رائے ہے پراونڈ فنڈ کے بارے میں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ فی صد ملازمین کی تنخواہ سے لیکر جمع کیا جاتا ہے۔ اور اس کے بقدر ادارہ کی طرف سے رقم جمع کی جاتی ہے۔ یہ رقم بنک میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ اور جب ملازم سبکدوش ہوتا ہے۔ تو اس کی رقم اور ادارہ کی مجموعی رقم کے ساتھ وہ سود بھی شامل کیا جاتا ہے جو اس اثناء میں بنک کی طرف سے دیا گیا تھا اور یہ ساری رقم ملازم کو دیدی جاتی ہے۔ بہت سے محتاط لوگ سود کی رقم نہیں لیتے ہیں

آپ نے فرمایا تھا کہ یہ سود سود نہیں ہوتا۔ اس درمیان ایک صاحب پاکستان سے آئے انھوں نے فرمایا کہ جناب مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ لیکن وہ فتویٰ میری نظر سے نہیں گذرا۔ اور نہیں معلوم کہ کس بنا پر وہ اس قسم کے سود کو سود نہیں قرار دیتے براہِ کرم آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

بینکوں میں جو رقم اشخاص جمع کرتے ہیں اور اس پر سود لگتا ہے اس سود کے بارہ میں غالباً ۱۹۲۹ء میں یہ فتویٰ شائع ہوا تھا کہ سود کی رقم بینک میں نہ چھوڑی جائے بلکہ لیکر کسی کو بلا امید ثواب دیدی جائے کسی مدرسہ اور یتیم خانہ وغیرہ کو یہ رقم دی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر اداروں کی رقم پر سود ملے تو کیا ادارے، مدرسے وغیرہ اپنے مصارف میں اس سودی رقم کو صرف کرسکتے ہیں یا انھیں بھی کسی اور کو دینی پڑے گی۔

اس سلسلہ میں آجکل یہ مسئلہ بھی اٹھا ہوا ہے کہ امن و انتظام کی جو حالت ہے اسکی بنا پر مدرسوں اور دوسرے اداروں کو اپنے یہاں بھاری رقم نہ رکھنی چاہیے۔ بلکہ کسی معتبر بینک میں جمع کردینا چاہیے تاکہ محفوظ رہے۔ اور جو رقم انٹرسٹ کے طور پر ملے اسے یہ مدرسے اور ادارے اپنی مدات میں خرچ کریں۔ کیا کسی معین مدت کیلئے مثلاً پانچ سال کیلئے فوری ضرورت کے علاوہ کی رقم بینک میں جمع کی جاسکتی ہیں جو اس مدرسہ یا ادارہ کا سرمایہ محفوظ ہوں۔ ان طویل المدت جمع شدہ رقوم پر جو انٹرسٹ ملے اسکو بھی ادارہ اور مدرسہ کے کاموں میں صرف کیا جاسکتا ہے۔

کیا اس بارے میں حکومتی اور غیر حکومتی بینکوں میں کوئی فرق کیا جائے گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت چونکہ رعایا کے اموال پر تصرف کرتی رہتی ہے آمدنی پر جتنی مقدار میں چاہتی ہے ٹیکس لگادیتی ہے۔ جائیدادوں کے متعلق مالکوں کی مرضی کے خلاف قوانین بناتی ہے۔ جب مناسب سمجھتی ہے جائیداد کو ضبط کرلیتی ہے جیسا کہ خاتمہ زمینداری کے وقت کیا گیا کہ زمین کے جائز مالکوں کو ان اراضی سے محروم کردیا گیا۔ مکانوں کے بارے میں

ایسے قوانین بنائے ہیں کہ مالکان تقریباً بے اختیار ہو گئے ہیں اور اس کا بھی یہی امکان ہے کہ زمینوں کی طرح مکانوں اور جن املاک کو چاہتی ہے مالکوں سے چھین لیتی ہے ایسی صورت میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت سے جو بھی مل جائے روا ہے جیساکہ خاتمہ زمینداری کے موقعہ پر جو بانڈ دیئے گئے تھے ان پر جو سود لگتا تھا اسے جائز قرار دیا گیا تھا خیال ہوتا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم اور دوسرے اصحاب نے کہا تھا کہ جو جائیداد حکومت لے رہی ہے اسکا جو معاوضہ دے رہی ہے اس کو جائیداد کی اصل قیمت سے کوئی نسبت نہیں ہے، اس حالت میں جو بھی وہ دیتی ہے وہ بے حد کم ہے اور چاہیے جس طرح پر دے اُسے لے لیا جائے

(۳) ایک مسئلہ اور بھی قابل غور ہے مکانات اور جائیداد وغیرہ کی مالکیت پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ ان کی آمدنی پر اگر وہ بقدر نصاب ہو اس اصول پر کمپنیوں کے حصص کا معاملہ ہو گا۔ مثلاً کسی نے ٹاٹا کے دس ہزار حصے خریدے تو کیا جائداد اور مکانات کی طرح سال بھر کے بعد اس حصص کی جو آمدنی ہوئی اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی یا حصوں کی کل مالیت پر حصہ جائیداد کی طرح خریدے اور بیچے جاتے ہیں۔ اور بغیر خرید و فروخت کے بینکوں کی طرح رقم حسب دلخواہ نکالی نہیں جا سکتی ہے۔ ان حصوں کے دام بازار میں گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ یونٹ ٹرسٹ کا بھی یہی حال ہے۔ سالانہ نفع کو حصہ داروں پر ان کے حصوں کے حساب سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہی صورت تاج کمپنی دہلی کلاتھ مل وغیرہ کے حصوں کا ہے۔ براہ کرم ان امور کے بارہ میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ فقط آپ کا مخلص

عبدالسلام

الجواب:- پراویڈنٹ فنڈ کے سلسلہ میں جو زائد رقم محکمہ دیتا ہے اس پر سود کی تعریف صادق نہ آنا تو ظاہر ہے اسلئے کہ ملازم کی تنخواہ سے وضع کی ہوئی

رقم کے برابر محکمہ جو رقم ملاتا ہے وہ رقم تو شروع ملازمت ہی میں طے شدہ ضابطہ کے مطابق ایک گونہ جزو اجرت قرار دیجاتی ہے اور اس کے علاوہ اور جو زائد رقم محکمہ خود ملاتا ہے خواہ بینک میں جمع رکھنے کی وجہ سے جو نفع اسکو ملے اس کا اضافہ کرکے دیدیا خواہ کسی اور ذریعہ سے وہ حاصل کرکے دے یہ سب محکمہ کا اپنا ذاتی فعل ہے ملازم اسکا مطالبہ نہیں کرتا اور نہ ملازم کا اس معاملہ میں کوئی دخل ہوتا بلکہ محکمہ خود کرتا ہے۔ اس پر بھی سود کی تعریف صادق نہیں آتی، سود کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ اموال ربوبیہ (اموال قدری متحد الجنس) میں تبادلہ کا معاملہ (عقد معاوضہ) کیا جائے اور پھر کسی جانب کوئی زیادتی بلاعوض ہو یہاں ایسا نہیں ہے اس لئے اس رقم میں سود کی حرمت تو آتی نہیں پھر اہل بینک یا اسٹیٹ غیر مسلم میں یا اگر مشترک ہو تو اقتدار اعلیٰ غیر مسلم کا ہے اس لئے اس کے احوال واحکام وہی ہوں گے جو عام غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کے احوال واحکام ہوتے ہیں غیر مسلم آپس میں سودی کاروبار اور سودی لین دین بھی کرتے ہیں۔ بہت سی بیع باطل وفاسد بھی کرتے ہیں، شراب بھی بناتے اور بیچتے ہیں۔ اور اسکی قیمت لیتے ہیں خنزیر بھی بیچکر اس کی قیمت لیتے ہیں۔ پھر مسلمانوں کو یہ پیسے مزدوری میں انعام وغیرہ میں دیتے ہیں۔ اور ان سب پیسوں کا حرام ہونا معلوم ہونے کے باوجود اس پیسوں کا لینا اس وقت تک شرعاً جائز وغیر مکروہ شمار ہوتا ہے جب تک کہ یہ یقین نہیں ہوتا کہ یہ چیز جس کو فروخت کر رہا ہے یہ بعینہٖ وہی چیز ہے جسکو چرا کر یا ڈاکہ ڈالکر لایا ہے یا جو قیمت دے رہا ہے یہ بعینہٖ وہی روپیہ ہے جس کو چرا کر یا ڈاکہ ڈالکر مثلاً لایا ہے۔ غرض ان سب کا لے لینا اور استعمال کر لینا سب درست رہتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکم جواز کیوں ہے تو اس کی وجوہ متعدد ہیں۔ متعدد شرعی ضوابط اس کی بنیاد ہیں مثلاً (الف) تبدیل ملک

سے حکماً تبدل عین ہوجاتا ہے یا د ب، الخلط استہلاک کا ضابطہ جو مسلم ہے یا د ج) مثلاً یہ کہ کفار ابتداءً صرف ایمان کے اور حدود و عقوبات مشروعہ کے مخاطب ہوتے ہیں، باقی معاملات و جزئی احکامات کے مخاطب بعد میں ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے آپس کے معاملات برقرار اور نافذ رکھے جاتے ہیں۔ جب تک کہ وہ حرام عقلی و قبیح عقلی کا مثلاً خداع، چوری، ڈاکہ وغیرہ کا ارتکاب نہ کریں حتّٰی کہ زوجین کا ایک ساتھ اسلام لانے میں اور ان کے زمانۂ کفر کے نکاح کو بھی جو شرعی ضابطہ کے مطابق اکثر نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات شرعی احکام کے خلاف ہوتا ہے مگر برقرار و باقی رکھا جاتا ہے۔ ہاں اگر حقیقی بہن یا ماں یا بیٹی کسی کے نکاح میں ہو تو اس صورت میں تفریق کرا دیتے ہیں اس لئے کہ حرام لعینہٖ و قبیح بعینہٖ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی حرمت اور قبح عقلی بھی ہے۔ پس یہی حکم و حال یہاں بھی ہوگا۔ کہ محکمہ جس کے اصحاب حل و عقد خالص غیر مسلم ہوں یا مشترک ہوتے ہوں اقتدار اعلیٰ غیر مسلم کے ہاتھ میں ہو اور وہ اپنے طور پر سودی کاروبار کر کے نفع حاصل کر کے۔ کوئی رقم حاصل کرے اور بطور تبرع کسی مسلمان ملازم کو دیں تو اس کا لینا جائز رہے گا۔ اور بعد انعام داخل ہو کر طیب و حلال شمار ہوگا۔ اس کے علاوہ پہلی دونوں وجوہ (تبدل ملک سے حکماً تبدل عین ہو جاتا ہے۔ اور الخلط استہلاک کا ضابطہ) بھی صادق آ کر حکم حرمت ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا فتویٰ احقر کی نظر سے بھی نہیں گذرا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہی مذکورہ وجوہ حضرت مفتی صاحب موصوف کے فتویٰ کی بنیاد بھی ہوں جو حضرات احتیاط برتتے ہیں اور یہ رقم نہیں لیتے یہ احتیاط شرعاً اسی وقت تک معتبر ہوگی جب تک کہ یہ ظن غالب ہو کہ نہ لینے کی صورت میں محکمہ اس رقم کو کسی غیر مسلم مذہبی ادارہ میں نہیں دے گا۔ اور اگر اس کا ظن غالب ہو جائے کہ ملازم اس

رقم کو نہیں لے گا۔ تو محکمہ اس رقم کو کسی غیر مسلم مذہبی ادارہ میں "دان کھاتہ" میں دیدیگا تو پھر یہ نہ لینا شرعاً صحیح ومعتبر نہ ہوگا۔ بلکہ اس صورت میں کوئی شخص تقویٰ پر عمل کرنا چاہے۔ تو اس کی یہ صورت ہوگی کہ محکمہ سے وصول کرکے خود غریب و پریشان حال مسلمانوں پر بلانیت ثواب صدقہ کردے۔ یا کسی دینی ادارہ میں دیدے، جس میں غیر مستطیع یا غریب ویتیم بچوں کو کھانا کپڑا دیا جاتا ہو تاکہ وہ ان کے کھانے کپڑے میں خرچ کردیں یا کسی قرضدار کو دیدے کہ وہ اپنا قرض ادا کردے۔

(۲)۔ ہاں جب اداروں کی رقم پر اسی قسم کی رقم سود کی ہے تو اداروں کو بھی چاہئے کہ اگر اپنے یہاں غریب وغیر مستطیع (مستحقین زکوٰۃ) موجود ہوں تو ان کو بلانیتِ ثواب اور بغیر جزو اجرت و بغیر جزو تنخواہ وغیرہ بناتے ہوئے بطور صدقہ کے دیدے یا ان کے کھانے کپڑے پر خرچ کردے جیسا کہ دینی مدارس میں ہوتا ہے اور اگر اپنے یہاں غریب و مستحقِ زکوٰۃ نہ ہوں تو پھر جس غریب و مستحق زکوٰۃ پر چاہے بلانیت ثواب بطور تصدق دیدے۔ غرض تملیک مستحق بطور تصدق ضروری ہے بغیر تصدق ضروری ہے بغیر اس کے کسی اور مصرف میں صرف کرنا درست نہ ہوگا اور اگر کسی اور مصرف میں صرف کرنا کسی شرعی مقصد کے ماتحت ضروری ہی ہوجائے تو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے حیلہ تملیک کے بعد صرف کرے۔ یہ حکم غیر حکومتی بینکوں سے سودی رقم لینے کا ہے، حکومتی بینکوں سے ایسی قسم کی رقم ملنے کا حکم اگلے جواب میں آتا ہے۔

(۳)، جی ہاں ان تشویشناک ملکی حالات میں بغرض حفاظت مدرسوں اور دوسرے اداروں کو بھی اپنی رقوم کسی بھی معتبر بینک میں جمع کردینا جائز ہے اگر اپنی ساری رقم کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع کرنے میں دشواری ہو یا قانونی مشکلات ہوں تو فیکس یا

سیونگ جس اکاونٹ میں محفوظ سمجھیں جمع کر سکتے ہیں اور پھر اس پر سود کے نام سے ملتی ہوئی جو رقم ہو اگر غیر حکومتی بینک سے مل رہی ہو تو اس کا بعینہٖ وہی حکم اور مصرف ہے جو نمبر۲ کے جواب میں ابھی تفصیل سے مذکور ہوا۔ اور اگر حکومتی بینک سے مل رہی ہو تو مذکورہ ۲ کی صورتوں کے علاوہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان رقوم کو انکم ٹیکس میں یا کسی بھی ایسے ٹیکس یہی جس میں ٹیکس کی رقم اسٹیٹ کے خزانہ میں براہِ راست پہونچتی ہو دے سکتے ہیں۔

(۴) یہ تو صحیح ہے کہ کمپنیوں فیکٹریوں، کارخانوں وغیرہ کے حصّوں کی کل مالیت پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی اور محض اس کی آمدنی کی بچت و نفع ہی میں وجوبِ زکوٰۃ محصور و دائر نہیں ہوگا۔ بلکہ اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ جو کارخانہ یا فیکٹری یا کمپنی ایسی ہے کہ اس میں کسی چیز کی خرید و فروخت نہیں ہوتی اور نہ اپنی بنائی ہوئی وتیار کردہ چیز کی نہ دوسرے سے کچھ خریدی ہوئی چیز کی بلکہ محض دوسروں کا کام مثلاً اجرت لیکر کر دیا جاتا ہے۔ جیسے آٹا پیس کر دیدیا یا دھان کو ٹکر یا تیل نکالکر دیدیا یا مثلاً نئے کپڑوں کے تھان پر پریس کر کے دیدیا وغیرہ تو ایسی صورت میں تو صرف بچت پر جو جملہ اخراجات نکالنے کے بعد بچے اور نصاب کی مقدار ہو جائے زکوٰۃ نکالنا عائد ہوگا۔ فرنیچر واثاثہ ودیگر سامانوں پر وجوب زکوٰۃ کا حکم عائد نہ ہوگا۔ اور اگر وہ فیکٹری، کمپنی یا کارخانہ ایسا ہے کہ اس میں چیزیں تیار کر کے فروخت کیجاتی ہیں۔ چاہے دوسروں کے یہاں کی چیز خرید کر فروخت کی جاتی ہوں یا نہ کی جاتی ہوں جیسے کلاتھ میل کہ اس میں اونی کپڑا خرید کر دھاگہ دار کپڑا تیار کر کے فروخت کیا جاتا ہے یا مثلاً پریس وغیرہ کہ اس میں کاغذ خرید کر اپنی مطبوعہ کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ اب چاہے دوسری جگہ کی مطبوعات بھی فروخت ہوتی ہوں۔ یا نہ ہوتی ہوں جیسے تاج کمپنی وغیرہ

تو ان میں زکوٰۃ کا وجوب محض بچت پر نہ ہوگا۔ بلکہ سال بھر کے پورے اخراجات وضع کرکے اس کی آمدنی کی بچت پر نیز جتنا سامان تجارت کا تیار شدہ ہوگا۔ یا برائے تیاری سامانِ تجارت جتنا کچا مال ہوگا جیسے کلاتھ میل میں کپڑے کے علاوہ ریشم، سوت، روئی وغیرہ کی مالیت اور شوگر میل میں چینی کے علاوہ گڑ۔ گنا وغیرہ کی مالیت ان سب کی مالیت کا حساب لگا کر زکوٰۃ نکالنے کا حکم عائد ہوگا۔ البتہ تیار شدہ عمارت مشینری و دیگر اثاثہ و فرنیچر و آلات کی مالیت پر زکوٰۃ عائد نہ ہوگی۔ اسی اصول پر کمپنیوں کے حصص کا معاملہ بھی ہوگا۔ اس لئے کہ کمپنیوں کے ملازمین محض وکیل و اجیر کے درجہ میں ہوتے ہیں۔ اور اصل مالک یہی حصہ داران (شیئر دار) حسب شیئر و حصہ ہوتے ہیں۔ پس ہر حصہ دار عمارت و مشین وغیرہ ہر ہر چیز کا حسب حصہ مالک شمار و متصور ہوگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ چیزوں کی قیمت گھٹنے بڑھنے کے اعتبار سے حصوں کی قیمت و مالیت بھی گھٹتی بڑھتی ہے اور اسی گھٹنے و بڑھنے کے اعتبار سے حصوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ پس عمارت، مشین اور اس کے اوزارات و اثاثہ و فرنیچر وغیرہ کی جو قیمت اس کے حصے میں آئے گی اس پر وجوب زکوٰۃ نہ ہوگا۔ بلکہ اس کو وضع کرنے کے بعد جو سامانِ تجارت کا ہوگا۔ خواہ کچے مال کی صورت میں ہو اسکی قیمت و مالیت اور بچت پر وجوب زکوٰۃ عائد ہوگا پس سال بھر پر کمپنی ہر حصہ دار کو جو رپورٹ و حساب دیتی ہے اگر اس میں ان سب چیزوں کی تفصیل مذکور ہو تو اس کے حساب سے حسبِ تفصیل مذکورہ بالا زکوٰۃ نکال دیں اور اگر اس رپورٹ میں یہ تفصیلات مذکور نہ ہوں تو کمپنی سے دریافت کرکے کہ میرے حصے میں تجارت کا تیار شدہ مال اور کچا مال کتنی قیمت و مالیت کا ہے اور بچت کتنی ہے۔ صرف اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں نکال دیں یہی تفصیلی حکم ٹاٹا مل اور دیگر ملوں اور کمپنیوں اور یونٹ ٹرسٹ و تاج کمپنی

وکلانھر بل دہلی وغیرہ سب کا ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہٗ الاحقر نظام الدین دارالعلوم دیوبند
۹۸/۱۲/۴ ھ

لون کی شکل میں حکومت ہند سے روپے لینے کی شریعتِ اسلامیہ میں گنجائش ہے یا نہیں

سوال علمائے دین مفتیانِ شرعِ متین کیا فرماتے ہیں درج ذیل مسئلہ کے بارے میں ایک شخص حکومتِ ہند سے قرض لینا چاہتا ہے جو عام طور سے لوگ لیا کرتے ہیں جس کو لون کا روپیہ کہتے ہیں اس کو لینے کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ڈھائی ہزار روپیہ گورنمنٹ سے لیا تو اب ڈھائی ہزار روپیہ میں سے ساڑھے بارہ سو روپیہ معاف ہو جائے گا۔ اور باقی ساڑھے بارہ سو روپیہ پانچ سال کی مدّت میں مع سود کے ادا کرنا پڑے گا۔ آیا اس روپیہ کو لینے کے واسطے کوئی صورت اگر جواز کی ہو سکتی ہو تو جواب سے مطلع فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب :۔ سودی قرض لینا خود بہت بڑا گناہ ہے بغیر سخت مجبوری کے جائز نہیں خواہ کسی حکومت ہی سے لے بلکہ حکومت سے سودی قرض لینے میں اور بھی خطرات ہیں۔ اس لئے جہاں تک ہو سکے احتیاط واجتناب رکھے باقی اگر لون کسی مجبوری سے لیلے اور صورت وہی ہو جو سوال میں مذکور ہے کہ ڈھائی ہزار قرض لیا اور ساڑھے بارہ سو معاف ہو جانے کے بعد پھر سود لگا کر جو رقم واپس دی ہے۔ اگر یہ کل واپسی کی رقم ڈھائی ہزار کے اندر ہی ہے جب تو شرعاً سود دینا لازم نہ آئے گا۔ ہاں جتنی رقم ڈھائی ہزار سے زیادہ واپس دینی ہوگی۔ اتنی مقدار سود میں دینے کی خرابی لازم آئے گی۔ اور بغیر شدید مجبوری ایسا کرنے کا گناہ بھی ہوگا۔ جس پر توبہ کرنا بھی اس پر ضروری رہے گا۔ ہاں ضرورتِ شدیدہ میں مثلاً یہ کہ بغیر قرض لئے کام

نہیں چلتا ہو اور غیر سودی قرض نہ ملتا ہو یا زیادہ سود دینی پڑتی ہو تو ایسی صورت میں کم سودی قرض لے لینے کی گنجائش رہے گی۔ جیساکہ الاشباہ والنظائر ص۱۵۰ کی عبارت ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح سے معلوم ہوتا ہے۔

فقط واللہ اعلم۔ کتبہ الاحقر نظام الدین
دار العلوم دیوبند۔
۲۰/۵/۹۹ھ

طلاق مغلظ کب واقع ہوتی ہے

سوال :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے یہ الفاظ کہے ایک۱، دو۲، تین۳ طلاق ہو مجھ پر اپنی بیوی منکوحہ زینب اگر وہ میرے گھر واپس آگئی لیکن آدھ گھنٹے کے بعد زینب گھر آگئی آیا یہ طلاق مغلظ ہوئی

الجواب : اس میں حرمتِ مغلظہ ہونیکی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لانہ علق الطلاق اولاً وعد الطلاق لیس بطلاقٍ فبقی لفظ الصریح وھو یوجب الرجعہ کمافی الشامی والموفق واللہ اعلم بالصواب

مفتی محمد فرید عفی عنہ

اس جواب پر سوال

۱؎ اس میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا کیا برابر ہے نیز یہ عبارت، شامی صفحہ مذکورہ میں نہیں ہے۔ شرط مقدم اور مؤخر ہونے میں مسئلہ یہی ہے۔

الجواب ۲؎ :- جناب ایک دو تین نہ صریح ہے نہ کنایہ ہے صرف عدد طلاق ہے نیز اس میں حکم بھی نہیں ہے اور جزء محولہ کی بنا پر ایسے عدد سے طلاق واقع نہیں ہوتا۔ اس عدد کا مجھ پر طلاق ہونے سے کوئی تعلق ظرفیت یا مصدریت کا نہیں ہے پس صرف ایک طلاق مجھ پر طلاق ہونے کی بنا پر واقع ہوگا۔ اسمیں مدخول بہا غیر مدخول بہا کا حکم یکساں ہے۔

الجواب :- یہ جملہ (ایک، دو، تین) مختلف خطہ میں مختلف محاورہ کے مطابق بولا جاتا ہے۔ لہذا اس خطہ میں اس خطہ کے محاورہ کے مطابق حکم ہوگا۔ بتقاضائے آیتِ کریمہ۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ (الآیۃ)

پس جس خطہ و دیار میں عرف عام و مشہور ہو کہ مذکورہ جملہ محض اپنی مستعدی ظاہر کرنے کیلئے اور مخاطب کو اپنے ارادہ سے آگاہ کرنے کے لئے بولتے ہیں اور اس کا تعلق اس کے بعد کے لفظ سے نہیں ہوتا تو اس خطہ میں اس سوال میں اس ذکر کردہ جملہ سے فقط ایک طلاق واقع ہونے کا حکم ہوگا۔

اور جس خطہ و دیار میں یہ عرف عام و مشہور ہو کہ یہ مذکورہ جملہ (ایک دو تین) اس کے مابعد والے لفظ کے شمار کیلئے بولتے ہیں تو اس کے بعد والا لفظ معدود ہوگا اور مفہوم یہ ہوگا۔ (ایک طلاق دو طلاق تین طلاق) پس اس خطہ و دیار میں۔ اس سوال میں مذکورہ جملہ سے تین طلاق واقع ہو کر حرمت مغلظہ ہو جائے گی۔ اور جس خطہ و دیار میں ان دونوں عرف میں سے کوئی عرف نہ ہو وہاں شوہر کے قول کا اعتبار ہوگا۔ جس کو نہ بحلف بیان کرے گا۔ لہذا یہ دونوں مذکورہ جواب ادھورے ہیں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہٗ الاحقر نظام الدین

دارالعلوم دیوبند — ۲۹ ۵/۹۹ ھ

زکوٰۃ کی رقم صحیح مصرف پر تحقیق کے بعد دینا چاہیے بغیر مستحق سے ادائیگی کے بعد جبراً لینا درست نہیں

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرعِ متین اس مسئلہ میں۔

کہ ہندہ بیوہ ہے اس کے چار نابالغ لڑکے ہیں زید نے باہر سے ہندہ کیلئے کفارہ نماز کی رقم بھیجی۔ اور عمرو کو وکیل تقسیم مقرر کیا کہ یومًا فیومًا چودہ زرد پیسہ

کچھ پیسے ہندہ کو دیتے رہیں چنانچہ یکم مئی سے آخر مئی تک عمرو بطور وکیل روزانہ کفارہ کے روپیہ ہندہ کو ادا کر دیئے۔ ادائیگی کے بعد عمرو کو علم ہوا کہ ہندہ کو سرکاری رقم منجانب حق شوہری ملی ہے۔ یہ رقم بارہ ہزار دو سو چوسٹھ روپیہ ہے جسمیں مکان کے ایک فروخت شدہ حصہ کی واپسی وغیرہ پر تقریبًا تین ہزار روپیہ کا صرفہ ہے اس طرح تقریبًا نو ہزار روپیہ رہا۔ جس کے وارث ہندہ اور چار نابالغ لڑکے ہیں کیا اس رقم کے شرعی حصص کے بعد ہندہ صاحب نصاب ہوگی۔

(۲) یکم مئی سے تا آخر مئی جس قدر نمازوں کا فدیۂ نماز ہندہ کو ملے گا وہ واپس ہوگا یا نہیں؟ اور آئندہ ہندہ رقم فدیہ سے لے سکتی ہے یا نہیں؟

جبکہ ہندہ کو ۲۵ ر اپریل ۱۹۷۹ء کو مذکورہ رقم کا چیک ملا تھا البتہ نقد کیش ۲۹ ر مئی ۱۹۷۹ء کا پی (پاس بک) میں درج ہوا۔ اور عمرو نے فدیۂ نماز ہندہ کو یکم مئی سے دینا شروع کیا۔ جب کہ مذکورہ چیک اس بات کی تصدیق کے لئے کہ یہ صحیح ہے یا نہیں یہ چیک دوبارہ اس دفتر میں بھیجا جاتا ہے۔ کہ جہاں سے یہ چیک جاری ہوا ہے اس عمل میں تقریبًا ایک ماہ کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ اس صورت میں ہندہ اس رقم کی مالک ایک ماہ قبل ہوگئی جب کہ وہ چیک اس کے نام پر جاری ہوا۔ یا ہندہ اس پر مالک ہوگئی جب وہ چیک رقم میں تبدیل ہو کر اس کو ملا؟۔ حکم شرع تحریر فرمائیں۔

نوٹ:- واضح رہے کہ چیک یا ڈرافٹ جو کسی نام سے لیا جاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جو کہ کوئی شخص ذاتی طور پر اپنی ذاتی بینک سے چیک کاٹے اس بینک کے نام جہاں پر کہ اس کا روپیہ جمع ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی بینک کسی شخص کے نام روپیہ کا چیک جاری کر دے تو اس میں وہ چیک دوبارہ جہاں سے جاری ہوا ہے۔ تصدیق کیلئے دیا جاتا ہے۔ اور پھر

تقریباً ایک ماہ بعد اس بات کی اطلاع آتی ہے کہ یہ چیک صحیح ہے یا نہیں اگر وہ چیک صحیح جاری کیا ہوا ہے تو اس کی رقم دیدی جاتی ہے

الغرض اس صورت میں ایک فی صد اس بات کا اندیشہ بھی ہے کہ چیک صحیح ہو یا نہ ہو۔ اس صورت میں اس چیک سے زید کو ایک ماہ پہلے اس رقم پر ملکیت حاصل ہو جائے گی یا نہیں ؟۔

المستفتی

ضیاء الحق محلہ ابوالبرکات دیوبند

الجواب : (۱) بیوہ کا حصہ شرعی اگر مقدار نصاب زکوٰۃ یعنی (۵۲½ تولہ چاندی کی قیمت) کے برابر یا اس سے زائد ہوگا۔ تو بیوہ صاحبِ نصاب شمار ہوگی۔

(۲) چیک کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر واقعی ایسا چیک ہے کہ بغیر تصدیق کے ناقابلِ اعتبار و ناقابلِ انتفاع ہے جب تو جب تک تصدیق ہو کر ملک میں نہ آجائے اس وقت تک اس کی رقم کی وجہ سے صاحبِ نصاب قرار نہ دیا جائیگا۔ اور اگر چیک مصدقہ ہے مزید تصدیق کی حاجت نہیں۔ تو ملک میں آتے ہی اس کی رقم سے صاحبِ نصاب شمار ہو سکے گا۔ اور فطرہ کا لینا اور اس کی ادائیگی کچھ صحیح نہ ہوگی۔

پس صورتِ مسؤلہ میں چیک مذکور اگر ایسا تھا کہ بغیر تصدیق کے ناقابلِ اعتبار و ناقابلِ انتفاع تھا۔ تو جس تاریخ کو تصدیق ہو کر ملا ہے صرف اس تاریخ سے یہ مذکورین صاحب نصاب شمار ہوں گے۔ اور اس تاریخ سے فطرہ کی رقم لینا ان کیلئے درست نہ تھا۔ اور اگر لے لیا تو فطرہ کی ادائیگی صحیح نہیں ہوئی اور اس تاریخ سے قبل تک صاحب نصاب شمار نہ ہوں گے اور فطرہ کا لینا اور اس کی ادائیگی سب درست شمار ہوگی۔

(۳) فی الدر علی هامش الشامی ص ۶۸ وان بان غناه ای المصرف) لایعید لانه اتی بما وسعه، وتحته فی الرد ص ۶۸

تنبیہ:- ولا یسترد منه لو ظهر انه عبد (الی قوله) ولا یسترد فی الولد والغنی وهل یطیب له؟ فیه خلاف واذا لم یطب قیل یتصدق وقیل یتصدق وقیل یرد علی المعطی۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ ادائیگی صحیح نہ ہونے کی صورت میں معطی پر دوبارہ ادائیگی واجب نہیں۔ اور نہ معطی لہٗ سے جبراً واپس لینے کا حق ہے۔ البتہ معطی لہٗ کے لئے ضروری ہے کہ صدقہ کردے یا خود معطی کو واپس کردے اور صورت مسئولہ میں معطی کو واپس کر دینا۔ صدقہ کرنے سے افضل ہوگا۔ کیونکہ معطی وکیل ہے اصیل نہیں ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر

نظام الدین الاعظمی دارالعلوم دیوبند

۲۲ ۹/۹۹ ھ

ہوائی جہاز پر نماز ادا کرنے کی کیا صورت ہے؟ **سوال:-** کیا فرماتے ہیں علماء شریعت مسئلہ ذیل میں کہ آجکل ہوائی جہاز کا سفر عام ہو رہا ہے۔ دینی ودنیوی وتجارتی ضرورتوں میں ہر قسم کے لمبے لمبے سفر بھی ہوائی جہاز سے ہونے لگے ہیں۔ اور آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے مسلسل طیارے اڑان میں رہتے ہیں۔ جسمیں کئی کئی نمازوں کے وقت بھی آکر ختم ہوجاتے ہیں نماز اسمیں کسطرح پڑھی جائے؟ اگر نہ پڑھیں تو اختیار سے ترک کرنا لازم آتا ہے جو معصیت ہے اور اگر پڑھلیں پھر اتر کر دوبارہ پڑھیں تو ابتلاء فی الحرج اور دین میں سختی وتنگی لازم آئیگی۔ علاوہ اس کے ایک دن میں ایک نماز کو دوبار پڑھنا لازم آتا ہے جو ممنوع ہے۔

اور اگر ہوائی جہاز میں پڑھ لیں اور اترنے کے بعد اعادہ نہ کریں تو ادائیگی سجدہ کس طرح متصور ہوگی۔ جبکہ سجدہ کے معنیٰ وَضع الجبہۃ علیٰ الارضِ کے آتے ہیں اور وجہ ارض یہاں مفقود ہے اور بغیر صحتِ سجدہ کے صلوٰۃ کی صحت کیسے متصور ہوگی۔

امید ہے کہ مفصل و مدلل طور پر حکمِ شرع سے آگاہ فرماکر رفع خلجان فرمایا جائیگا۔

فقط والسلام بینوا توجروا

المستفتی نیاز الدین اصلاحی جونپوری

مالک اصلاحی کتب خانہ دیوبند ۲ ۱/۱۰ ۹۹ ھ

الجواب:۔ یہ تو ظاہر ہے کہ استطاعت فی الجملہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اختیار و قدرت سے ہوائی جہاز میں نماز ترک کردیے کا یا معاف ہوجانے کا حکم نہیں ہوسکتا۔ اسلئے کہ حدیث دجال میں ہے کہ اس کا ایک دن جو چھ مہینہ کا ہوگا اس ایک دن میں نماز پنجگانہ کا وقت متعارفہ نہ ملنے کے باوجود ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ۲۴ گھنٹہ کی نمازوں کے درمیان میں جو فاصلہ ہوتا ہے اس کا اندازہ کرکے ہر چوبیس گھنٹہ میں پانچ نمازیں پڑھتے رہنا۔ اوکما قال جب وقت متعارفہ نہ پانے کے باوجود ترکِ نماز کی اجازت نہ دی گئی تو پھر وقت پانے کی حالت میں کیسے نماز کا ترک کردینا جائز ہوگا۔ کوئی شخص حائضہ و نفساء پر قیاس کرکے معافی کا حکم بھی نہیں دے سکتا۔ اسلئے کہ حیض و نفاس امور تکوینیہ و طبعیہ سے متعلق اور غیر اختیاری ہیں۔ اور یہ معاملہ امر غیر تکوینی و غیر طبعی و اختیاری غیر ضروری بلکہ امور مکتسبہ و اختیاریہ سے متعلق ہے اس لئے یہ قیاس بداہۃً قیاس مع الفارق و غیر صحیح ہوگا۔ یہی حال و حکم ہر دوسرے مقیس علیہ کا۔ مثلاً شدت مرض وغیرہ کا ہوگا۔

اس لئے وقت پالینے کے بعد قضا ہونے سے بچانے اور جہاز ہی میں ادا کرلینے کا حکم رہیگا رہگئی یہ بات کہ اترنے کے بعد پھر پڑھنا ضروری یا لازم رہے گا یا نہیں تو اسکا حکم یہ ہےکہ ہوائی جہاز کے استعمال کا عموم و شیوع اور اس کا عام رواج اسطرح ہوتا جارہا ہے کہ اترنے کے

بعد پھر پڑھنے کو لازم و واجب قرار دینے میں یقیناً حرج و تنگی واقع ہوجانے کا ظن غالب رہے گا۔ اور الحرج مدفوع اور الدین یسر جیسے امور مسلّمہ کے خلاف ہوگا۔ بالخصوص جب ادائیگی بھی ہوائی جہاز میں بلا شبہ صحیح و درست ہوجائے گی اور ذمہ بری ہوچکا ہوگا جیسا کہ عنقریب واضح ہوجائیگا۔ اسلئے اترنے کے بعد پھر پڑھنا اور لوٹانا لازم و واجب نہیں کہا جاسکتا اور اگر کوئی اسکو مندوب یا مستحب کہے تو یہ دوسری بات ہوگی اور اس سے یہاں بحث نہیں

ایک شبہہ کا ازالہ رہ گیا ادائیگی سجدہ صحیح نہ ہونے کا شبہہ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سجدہ کی تعریف (مثلاً وضع الجبھۃ علی الارض علی وجہٍ مخصوص) میں علی الارض کی قید احترازی نہیں ہے بلکہ واقعی واتفاقی ہے یعنی قدیم زمانہ، جاہلیت سے سجدہ کی صورت یہی چلی آتی تھی کہ اپنے معبودانِ باطل یا اپنے بادشاہوں کے سامنے لوگ سجدہ میں سر کو زمین پر رکھدیتے تھے۔ اور یہی سجدہ کی صورت ہوتی تھی۔ بس وہی قید یہاں بھی بطور واقعہ مذکور ہے ورنہ سجدہ کی حقیقت و ماہیت میں یہ قید علی الارض شامل یا دخیل نہیں ہے۔ اسلئے کہ سجدہ کی حقیقت لغویہ اظہار خضوع و تذلل ہے کما فی النہایۃ لابن اثیر ج۲ ص۱۵۶ والقاموس المحیط ج ۱) —

حاصل کلام یہ ہے کہ بقصد عبادت پیشانی کو قیود شرعیہ کے مطابق ٹیک دینا۔ اور ٹیک دینے کا مفہوم ظاہر و متبادر ہے کہ اگر پیشانی کو کسی چیز پر رکھکر سر کو اس پر چھوڑ دیا جائے تو سر ٹک کر رہ جائے دھنس نہ جائے اور ڈوب نہ جائے۔

یہ مفہوم جس طرح زمین پر سر و پیشانی ٹیکنے سے حاصل ہوتا ہے اسی طرح تخت و چلہ و کشتی و ہوائی جہاز پر بھی سر و پیشانی ٹیکنے سے حاصل ہوتا ہے۔ پس جس طرح زمین پر پیشانی ٹیکنے سے حقیقت شرعیہ متحقق ہوکر نماز درست و صحیح ہوگی۔ اسی طرح یہاں بھی حقیقت شرعیۂ سجدہ صحیح ہوگا۔ اور اگر علی الارض کی قید کو واقعی و اتفاقی قرار نہ دیکر احترازی ہی قرار دیا جائے جب بھی حاصل یہی جواز نکلے گا۔ اسلئے کہ اس صورت میں تعمیم کرنی پڑے گی اور کہنا پڑے گا کہ علی الارض سے مراد علی الارض ولو کان حکماً ہے یعنی ایسی چیز مراد ہے جس پر سر و پیشانی ٹکنے اور اور ٹھہری رہنے کی وجہ سے سجدہ اور نماز درست ہوتی ہے اسی طرح ہوائی جہاز پر بھی سر و پیشانی ٹکنے اور ٹھہری رہنے سے سجدہ اور نماز سب صحیح ہوگی

اور اگر علی الارض کی قید کو احترازی تسلیم کرتے ہوئے مذکورہ بالا تعمیم کے بجائے یہ کہا جائے سجدہ زمین ہی پر ضروری ہے، خواہ بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ ہو جیسے صلوٰۃ فی السفینۃ

ہیں کہ سجدہ سفینہ (کشتی) پر ہے اور کشتی پانی پر ہے اور پانی زمین پر ہے اسلئے کشتی اور پانی کے واسطہ سے سجدہ بھی گویا زمین ہی پر ہے اسلئے سجدہ و نماز سب صحیح و جائز ہو جاتی ہے تو یہی تقریر صلوٰۃ فی الطیارہ (میں بھی چلے گی کہ سجدہ طیارہ (ہوائی جہاز) پر ہے اور ہوائی جہاز ہوا پر ہے اور ہوا زمین پر ہے۔ لہذا سجدہ بھی ان دو واسطوں کے ذریعہ سے زمین پر ہوگا۔ اور سجدہ و نماز سب جائز رہے گی۔ صرف فرق اتنا ہوگا کہ صلوٰۃ فی السفینہ میں دونوں واسطے (کشتی و پانی) محسوس و مبصر ہونگے اور صلوٰۃ فی الطیارہ میں صرف ایک واسطہ ہے۔ (طیارہ) محسوس و مبصر ہوگا اور دوسرا واسطہ (ہوا) محسوس ہوگی مگر مبصر نہ ہوگی تو اس فرق سے حکم میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ اسلئے کہ واسطہ کے مبصر نہ ہونے کی صورت میں نماز کے ارکان ادا ہو جانے کے باوجود نماز صحیح نہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ عدم جواز کا حکم دیدیا جائے بالخصوص مذکورہ فی السوال مجبوریوں کے پیش نظر۔

خلاصۂ جواب:۔ اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہوائی جہاز پر بھی نماز پڑھی جائے گی۔ اگر جماعت سے پڑھ سکتے ہوں تو جماعت سے پڑھنا بہتر ہوگا ورنہ تنہا تنہا پڑھیں گے۔ اگر حرکت وغیرہ کسی عارض سے کھڑے ہو کر پڑھنا دشوار ہو تو بیٹھکر رکوع و سجدہ کے ساتھ پڑھیں گے اور سمتِ قبلہ کمپاس کے ذریعہ معلوم کریں گے۔ اگر کمپاس نہ ہو تو تحری کرکے جس رُخ پر قبلہ قرار پائے اس رُخ پر نماز پڑھیں گے۔ غرض کہ جیسا عمل چلتی ریل میں کرتے ہیں اس میں بھی کریں گے اور نماز قضا نہ کریں گے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر نظام الدین دار العلوم دیوبند

۱/۶/۹۹ھ

قابلِ مُطالعہ کتابیں

امداد الفتاویٰ جدید فتاویٰ حکیم الامت حضرت تھانویؒ ترتیب جدید حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ حاشیہ جدیدہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند یوپی جلد اول قیمت / روپیہ جلد دوم قیمت / روپیہ جلد سوم قیمت / روپیہ جلد چہارم قیمت / روپیہ جلد پنجم قیمت / روپے جلد ششم -/۲۶ روپیہ، جلد ہفتم بالکل جدید طباعت قیمت تقریباً -/ روپے۔

مشارقُ الانوار بخاری اور مُسلم شریف کی دو ہزار دو سو بہتر حدیثوں کی بہترین شرح متن حدیث عربی، ترجمہ و شرح آسان عام فہم اُردو۔
ہدیہ نصف اوّل و ثانی مجلد =/ روپے۔

جوہرِ تصوّف انفاس عیسیٰ ہزاروں روحانی بیماریوں کا کامیاب علاج، ارشادات حکیم الامت حضرت تھانویؒ۔ قیمت مجلد -/۲۵ روپیہ۔

اصلاح انقلاب اس انقلابی دور میں اُمت میں کسقدر عملی انقلاب پیدا ہو رہا ہے اگر اسکی تفصیل دیکھنا ہو تو اصلاح انقلاب کا مطالعہ کریں، مصنفہ حضرت حکیم الامت حضرت تھانویؒ۔ قیمت مجلد / روپے

فیوض یزدانی ترجمہ الفتح الربانی مجالس حسنہ غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اصل بیان عربی ترجمہ اُردو، قیمت۔ روپیہ۔

حکیم الاسلام اور انکی مجالس حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی مختصر سوانح حیات اور ۲۳ مجلسوں کا بہترین مجموعہ ہر مجلس علم و حکمت اور بزرگانِ دین کے واقعات سے بھرپور ہے قیمت

نوٹ:- اگر آپ مطبوعات ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند کی مکمل تفصیل پڑھنا چاہتے ہیں تو ادارہ کی فہرست کتب ضرور منگائیں۔

پتہ:- **ناظم ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند یوپی**